ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر
اکرم التفاسیر
وَمَا مِن دَآبَّةٍ
الشیخ امیر مولانا محمد اکرم اعوان
12

Rs 500

بسم اللہ الرحمن الرحیم
وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ
اکرم التفاسیر
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ
الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان
12

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی سمجھنے میں انتہائی آسان، فرقہ پرستی سے پاک اور موجودہ زمانہ کے مطابق لکھی ہوئی قرآن اردو تفسیر وٹس ایپ پر فری حاصل کریں۔

یاد رکھیں گناہ جہالت کا پھل ہوتا ہے اور یہ بڑی شرم اور بد بختی کی بات ہے اگر ہم ساری زندگی میں اتنا بھی نہ جان سکیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاس آسان طریقہ موجود ہے۔ قرآن کی تفسیر ہر وقت آپ کی جیب میں ہو گی اور آپ کو جب بھی دن میں فارغ وقت جہاں بھی حاصل ہو آپ کچھ صفحے روزانہ پڑھتے رہیں اس طرح کچھ ہی وقت میں آپ پورے قرآن کی تفسیر سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ کے ہزاروں عقائد و اعمال کی اصلاح ہو کر شریعت کے مطابق ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں بہترین ہو جائیں گے۔ ہر پارہ کی علیحدہ علیحدہ تفسیر موجود ہے۔

www.QuranTafseer.net

0092 323 520 5255

اپنے وٹس ایپ سے اوپر دیئے گے نمبر پر میسج کریں کہ آپ کو لکھی ہوئی تفسیر چاہیے۔ جبکہ ویب سائیٹ سے بھی آپ یہی تفسیر آڈیو، وڈیو اور تحریر کردہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں سے یہ پوسٹ شئیر کر کے ڈھیروں ثواب حاصل کریں

اکرمُ التفاسیر

الشیخ امیر مولانا محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

پارہ 12

باراوّل .... فروری 2014ء

تعداد .... دوہزار

قیمت .... 500 روپے

ناشر .... ملک عبدالقدیر اعوان

ناظم اعلیٰ ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

دارالعرفان منارہ، ضلع چکوال

نے انتخاب جدید پریس لاہور سے طبع کروایا

اویسیہ کتب خانہ

اویسیہ سوسائٹی۔ کالج روڈ۔ لاہور

از دل خیزد بر دل ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس بارے میں عرض کردوں کہ نہ تو خود نمائی کی پہلے کوئی تمنا تھی، نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔ نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسر قرآن کہے، نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں، یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم و معارف عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اپنے وقت نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب و کتاب' جنت و دوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو رہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ اس لئے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں' آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہو سکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل و حمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے۔ اس لئے ایک سے دوسری جگہ علوم و ایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کر دیا یعنی Global Village اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آ گئی ہے۔ اس لئے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے تبدیل

ہو رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے منظر عام پر آنے کی۔ لہٰذا اسرار التنزیل کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقام ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' عطاوکرم کی اس بارش میں اہل بصیرت نے دیکھا کہ فہم قرآن کا پیغام قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپرد قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

اسرار التنزیل کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ اکرم التفاسیر میں حالات حاضرہ کے مطابق ذرا بحث کو وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہل علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لئے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے' نجات اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے (آمین)

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

مولانا محمد اکرم اعوان
شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرم بحیثیت مفکر قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث مفسیرین کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کررہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن وحدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار ﷺ کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدنی ان علمائے ربانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرم کے خطابات سے ماخوذ اکرم التفاسیر بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علوم جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدنی کی ایسی روشن مثال ہے جس میں نہ صرف علوم مصطفوی ﷺ کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکات نبوی ﷺ قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ' ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جا بجا

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔ حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا بالفاظ دیگر ''فکر قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنان اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے لئے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں، لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں، قانون وراثت سے پریشان ہیں، جنت و دوزخ یا ثواب و عذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ اکرم التفاسیر میں آپ نے اسی فکر قرآنی کو اجاگر کیا ہے، جو اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر المکرم کفار کے لئے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لئے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت و رسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبۂ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر کسی یکتائی سے عہد غلامی کرلو۔ تمہاری ذمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے یہود کی طویل فرد جرم بیان کی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہل حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے عصر حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالم اسلام

ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکر قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرم نے بھرپور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لئے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے لیکن حضرت امیر المکرم قرآن کی روشنی میں حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔ آپ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لئے یہ آیہ کریمہ قیامت تک کے لئے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین، پورے ایمان سے منبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دوچار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبۂ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرم کے زوردار انداز بیان میں فکر قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرم نے فکر قرآنی کی بات کرتے ہوئے امت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لئے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم امید افیون سے کم نہیں جس نے امت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ امیر المکرم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبۂ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے، جو ہر دور میں خون مسلم کو گرم اور امت مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔ امیر المکرم نے اکرم التفاسیر میں یہ فکر اس قدر نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسر قرآن

سے آگے مفکر قران نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرم کی پہچان بطور مفسر قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکر قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکر قرآن امیر المکرم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔

حسب سابق احباب سلسلہ عالیہ جناب ذکاء اللہ جان، سید انور علی شاہ اور عاصم نذیر نے تدوین وتالیف میں معاونت کی' اللہ تعالیٰ سب کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

فہرست مندرجات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُمَّ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِماً اَبَداً

عَلٰی حَبِیْبِکَ مَنْ زَانَتْ بِهِ الْعُصُرُوْا

پارہ 12 وَمَامِنْ دَآبَّةٍ

سورۃ ھود رکوع 1 آیات 6 تا 8

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝٦ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٧ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٨

اور زمین پر جو بھی کوئی چلنے پھرنے والا ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر ایک کی زیادہ رہنے اور کم رہنے کی جگہ کو جانتے ہیں سب کچھ کتاب روشن میں (لکھا ہوا) ہے ﴿۶﴾ اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا (تمہارے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے) تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں بہتر عمل کرنے والا کون ہے۔ اور اگر آپ فرمائیں کہ یقیناً تم لوگ مرنے کے بعد (زندہ کرکے) اٹھائے جاؤ گے تو کافر لوگ ضرور کہتے ہیں (بعثت کی

خبر) تو صاف صاف جادو ہے ﴿۷﴾ اور اگر کچھ عرصہ کے لیے (حیات دنیا میں) ہم ان سے عذاب کو مؤخر رکھتے ہیں تو ضرور کہیں گے اس (عذاب) کو کس چیز نے روک رکھا ہے (آتا کیوں نہیں)؟ دیکھو! جس دن وہ ان پر آجائے گا تو ان سے ٹلے گا نہیں اور جس چیز کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان کو گھیر لے گی ﴿۸﴾

تفسیر ومعارف

فرمایا، وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اور زمین پر جو کوئی بھی چلنے پھرنے والا ہے، اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔

رازق صرف اللہ:

اللہ کی زمین پر موجود تمام مخلوق خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، یعنی صرف انسان ہی نہیں، ہر جاندار کا رزق اللہ کریم کے ذمہ ہے۔ اللہ کریم نے مخلوق کو پیدا فرمایا ہے اور اسی نے ساری مخلوق کے رزق کا ذمہ بھی لیا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ خالق پیدا فرما کر چھوڑ دے اور مخلوق کوئی اپنا پالنے والا ڈھونڈتی پھرے۔ اُسی ذاتِ بے ہمتا نے اس کے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے۔

رزق:

رزق صرف کھانا کھانا پینا، مال و دولت ہی نہیں۔ رزق میں ہر وہ نعمت شامل ہے جو مخلوق کی ضرورت ہے اور جو اسے اللہ کریم سے ملتی ہے۔ جیسے ہم سنتے ہیں، دیکھتے ہیں سانس لیتے ہیں، دل دھڑکتا ہے، معدہ کام کرتا ہے، ہاتھ پاؤں کام کرتے ہیں تو یہ سب قوتیں اور تمام حواس یہ سارا وہ رزق ہے جو ہمیں مسلسل اللہ کریم کی طرف سے ملتا ہے۔ اسی طرح مال و دولت، اولاد، گھر بار، عزت و آبرو، عہدہ و مرتبہ علم و دانش دین و ایمان مقامات و منازل، نیکی کی توفیق یہ سب بھی رزق ہے جو اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

اللہ کریم نے رزق کی تقسیم کا نظام نہایت باریکی سے ترتیب دے رکھا ہے اور ہر قطرہ آب یا دانۂ خوراک اسی کو پہنچتا ہے جس کا مقدر ہے جس طرح ایک عظیم الشان عمارت کو چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بنایا جاتا ہے اسی طرح ہر مخلوق کا وجود چھوٹے چھوٹے سیلوں (Cells) سے بنا ہے۔ ہر سیل کا دوسرے سیل سے رابطہ رہتا ہے۔ یہ ایک

دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں اور جدید تحقیق کے مطابق ایک انسانی وجود میں دس کھرب سیل ہوتے ہیں چھ ماہ کے اندر رفتہ رفتہ یہ دس کھرب ختم ہوجاتے ہیں اور ساتھ ساتھ نئے خلیے بنتے رہتے ہیں اور دس کھرب نئے سیل وجود میں آجاتے ہیں۔ ہر سیل کا خالق ورازق وہی ہے۔ انہیں تبدیل کرنے والا وہی ہے اللہ کریم کے سوا کوئی ایسا نہیں کرسکتا۔

حصولِ رزق میں اسباب کی اہمیت:

اس خالقِ بے مثل نے چیزوں کو دوسری چیزوں کے ساتھ جوڑ کر کائنات کا نظام اس طرح ترتیب دیا ہے کہ دنیا کو عالمِ اسباب بنا دیا ہے لہٰذا رزق اگرچہ اللہ کے ذمے ہے لیکن اس کے لیے اسباب اختیار کرنا پڑتے ہیں اور اسباب اختیار کرنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اسباب اختیار کرنا اطاعتِ الٰہی ہے۔ یہ بھی عبادت ہے۔ اس پر کیا نتیجہ مرتب ہوگا، یہ اس قادرِ کریم کی مرضی۔ نتائج ہمیشہ وہی ہوتے ہیں یعنی نتائج ثمرات ہیں جو من جانب اللہ ہوتے ہیں۔

یہ بڑا عجیب معاملہ ہے کہ اسباب اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ ترکِ سبب بھی جائز نہیں اور اسباب پر ایسا بھروسہ کرلینا کہ اسی کے ذریعے مجھے کچھ ملے گا، یہ بھی جائز نہیں۔ اللہ کریم نے جس طرح دنیوی، رزق کے حصول کے لیے اسباب بنائے ہیں اسی طرح ابدی زندگی کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے بھی اسباب بنائے ہیں۔ اس میں ایمان بالرسالت بنیاد ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا کہ ہمیں اللہ کا پتہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ہی ملے گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ اللہ واحد لاشریک ہے، خالق ہے، کریم ہے، رحیم ہے۔ اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اطاعت کرو۔ لہٰذا اطاعت کرنا اور نافرمانی نہ کرنا اسباب ہیں۔ جب انسان یہ اسباب اختیار کرے گا تو وہ مولا کریم اسے آخرت کی کامیابی سے ہمکنار کردے گا۔

ترکِ سبب کا وبال:

اگر کوئی کہتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا تو نہ مانے اللہ کا کچھ نقصان نہ ہوگا لیکن اس فرد کا وہ رزق جو ایمان بالرسالت، ایمان باللہ اور اتباعِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وابستہ ہے وہ رک جائے گا۔ پھر وہ دنیا میں جانوروں کی سطح پر زندگی بسر کرتا رہے گا۔ کھائے پیئے گا بچے پیدا کرے گا، گھر بنائے گا اور مرجائے گا اور آخرت میں پہنچے گا تو تہی دست ہوگا۔ صرف تہی دست ہی نہیں گرفتارِ بلا ہوگا کہ اللہ نے تو اسے اتنی نعمتیں دیں اور اس نے شکر بھی ادا نہ کیا اور شکر تو کیا کرنا تھا اس نے تو ماننے سے بھی انکار کردیا۔

یہاں یہی ارشاد ہورہا ہے کہ دنیا کا جو رزق ہے اس کا ذمہ تو اللہ کریم نے لے لیا۔ کوئی اسباب اختیار نہ

کرے تو بھی اسے رزق پہنچتا ہے۔اس کا اسباب اختیار نہ کرنا عدم اطاعت ہے، گناہ ہے، جرم ہے لیکن اس کا رزق بند نہیں ہوتا، اس کی سانس نہیں رکتی، اس کی دل کی دھڑکن نہیں رکتی، اس کے اعضاء جواب نہیں دے دیتے اور اس کا کھانا پانی اسے ملتا رہتا ہے۔لیکن حصولِ آخرت کے لیے جو رزق سے، اسے حاصل کرنا بندے کے ذمے ہے۔جو کوئی اللہ کی اطاعت کا فیصلہ کر لے اللہ کریم اسے توفیقِ اطاعت دے دیتے ہیں۔وہ دنیا میں بھی سکون سے رہتا ہے اور آخرت میں بھی کامیاب ہوگا۔

آخرت کی کامیابی کا وعدہ اللہ کریم نے ہر بندے سے نہیں کیا۔یہ وعدہ صرف اطاعت گزاروں سے ہے نافرمانوں سے نہیں۔دنیوی رزق کے لیے اللہ کریم نے کوئی قید نہیں رکھی، نیک ہو یا بد، اس کا جو رزق مقرر ہے وہ اسے ملے گا۔انسان ہے یا حیوان، جانور ہے یا پرندہ یا کوئی سی بھی چلنے پھرنے والی مخلوق ہے اس کی دنیوی روزی اس تک پہنچتی ہے۔جو لوگ ناجائز ذرائع سے مال بٹورتے ہیں اگر وہ یہ نہ بھی کریں تو ان کا رزق ان تک پہنچے گا۔حلال ذرائع سے کمائیں گے تو اطاعت شمار ہوگی اور حرام ذرائع سے لیں گے تو جرم گنا جائے گا۔گناہ کا وبال آئے گا لیکن ملے گا وہی جو اس کا نصیبہ ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جس رزق کا ذمہ اللہ نے خود اٹھا رکھا ہے، اس کے لیے ہم ہر وقت کوشاں ہیں اور آخرت کا رزق جس کا مدار ہمارے ایمان و یقین اور اعمال و کردار پر ہے اس کی ہمیں فکر ہی نہیں۔اپنی اُس زندگی کے بارے ہم بے فکر ہیں جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتی اور جہاں ہم نے ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔

یاد دلایا جا رہا ہے کہ اپنے حصے کا کام کرو۔دنیوی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے دنیوی اسباب بروئے کار لاؤ۔اخروی انعامات کے لیے دنیا میں اتباعِ رسالت کرو دنیا کے لیے آخرت کو نہ چھوڑو یعنی دنیا کے تمام کام اس طرح کرو جس طرح اللہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے تو دنیا بھی خوبصورتی سے گزارو گے اور اخروی کامیابی بھی پاؤ گے۔

فرمایا، وہ ایسا علیم و خبیر ہے وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ کہ جس مخلوق کو پیدا کرتا ہے اس کا عارضی ٹھکانہ اور مستقل ٹھکانہ بھی جانتا ہے۔عارضی ٹھکانہ کیا ہے؟ یہ وجودِ انسانی کا سفر ہے۔ایک وجودِ انسانی کے اجزاء کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔مر کر شاید اتنے منتشر نہ ہوں جتنے پیدا ہونے سے پہلے ہوتے ہیں۔کہاں کہاں سے مٹی کے ذرات کس کس شکل میں بندے کے وجود کا حصہ بنتے ہیں اللہ کریم مٹی کو اناج کا روپ دیتے ہیں، کہیں چاول، کہیں کماد سے چینی، کہیں اور طرح کی غذا روپ بدلتی ہے۔کہیں چارہ اگتا ہے، کوئی جانور چرتا ہے۔اس

سے دودھ مکھن اور گوشت انسانی غذا میں شامل ہوتا ہے۔ گویا یہ سارے وہ ذراتِ بدن میں جو جگہ جگہ سے سفر کر کے اپنے مقام تک پہنچتے رہتے ہیں۔

ایک فرد غذا کھاتا ہے اس سے اس کے وجود کی تعمیر ہوتی ہے لیکن کچھ سیل اس کی اولاد کے لیے اس کے صلب میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح والدہ غذا کھاتی ہے کچھ اس کا جز و بدن بنتی ہے اور کچھ اس کے بچے کے لیے خون میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ کسی شکل میں جب باپ کے صلب میں ہوتا ہے تو یہ فرد کا ایک عارضی ٹھکانہ تھا۔ جب صلبِ پدر سے شکمِ مادر میں آ گیا تو وہ بھی اس کا عارضی ٹھکانہ تھا۔ جب پیدا ہو گیا تو وہ بھی عارضی ٹھکانہ ہے۔ یہاں سے انتقال کر کے برزخ میں چلا جائے گا۔

جب دنیا سے برزخ میں جائے گا تو دار العمل کا عرصہ ختم ہو جائے گا۔ اسباب ختم ہو جائیں گے اور ثمرات ملنے لگیں گے۔ جو کچھ کیا تھا اسی کے نتائج سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔ برزخ بھی عارضی ٹھکانہ ہوگا۔ حشر میں جب اٹھیں گے اور فیصلہ ہوگا۔ جو خوش نصیب جنت پہنچ گئے وہ ہمیشہ موج کریں گے جو گرفتارِ عذاب ہوں گے۔ تو پھر وہ اللہ جانے۔ اس کی مخلوق جانے۔

مستقل ٹھکانہ:

تو خاکی ذرات سے لے کر وجود کے بننے اور بنتے ہوئے مختلف مراحل سے گزر کر آخرت تک پہنچنے سے پہلے کے سارے ٹھکانے عارضی ٹھکانے ہیں جبکہ آخرت مستقل ٹھکانہ ہے۔ فرمایا **وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا** اس کے آخری ٹھکانے، مستقل رہائش کا بھی اللہ کو پتہ ہے اور عارضی ٹھکانوں کا بھی پتہ ہے۔ جہاں جہاں وہ ہے وہاں وہاں اس کی ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں۔ اس کا رزق اسے پہنچ رہا ہے۔ اور فرمایا، یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اس میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ كُلٌّ فِي كِتَٰبٍ مُّبِينٍ ۞ یہ سب کچھ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

لوحِ محفوظ اپنی وسعت کے باوجود محدود ہے۔ علم الٰہی کی تو کوئی حد نہیں۔ علم الٰہی تو ناپیدا کنار ہے۔ علمِ الٰہی ہر شئے پر محیط ہے تو بندے کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ ہی پر بھروسہ رکھے۔ دنیا میں اسبابِ ضرور یہ اختیار ضرور کرے لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں مسبب الاسباب پر رکھے۔ دنیا کے لیے جتنے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں ان سے زیادہ آخرت کے لیے محنت کرنا چاہیے۔

سنتِ الٰہی:

فرمایا، وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وہی ذات بے ہمتا ہے جس نے چھ دنوں میں زمینوں، آسمانوں کو پیدا کر کے مکمل فرما دیا۔ قادرِ مطلق تو آنِ واحد میں پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی قدرت کے لیے کچھ مشکل نہیں لیکن اس نے یہ کام چھ دنوں میں مکمل فرما کر کائنات میں سنتِ الٰہی کو جاری فرما دیا۔

اس نے اس عالم کا نظام ایسا بنایا ہے جس میں ترتیب رکھی ہے۔ اشیاء کا ایک دوسرے سے تعلق اور رشتہ، بننے اور بننے کے اوقات کی ایک ترتیب ہے۔ اسی ترتیب سے اس ذاتِ قادرِ کریم نے خود بھی کام لیا ہے۔

سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جہاں قدرت نے ترتیب مقرر فرما کر انسانوں کو اس کا پابند کیا ہے وہاں خود بھی اسباب کو اور ترتیب کو نہیں چھوڑا۔ جیسے عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے اکیلی ماں سے پیدا فرمایا لیکن ترکِ سبب نہیں کیا۔ حضرت جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ حضرت مریمؑ کو دم کر دیں اور جبرائیل امین نے حاضرِ خدمت ہو کر حضرت مریمؑ کو دم کیا۔ جو ہستی بغیر والد کے پیدا فرمانے پر قادر ہے وہ جبرئیل امین کے دم کا محتاج نہیں تھا۔ پھر دم کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت یہ تھی کہ اس نے سارے عالم کو اسباب کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور اسباب اختیار کرنا سب کے لیے ضروری ٹھہرایا ہے لہٰذا قادرِ مطلق خود بھی اسباب کو ترک نہیں فرماتا۔

اسی آیہء مبارکہ سے اس غلط تصور کی نفی ہو جاتی ہے جو جہلاء نے اختیار کر رکھا ہے کہ فلاں شخص کوئی کام نہیں کرتا، بس ایک جگہ بیٹھا رہتا ہے، اس سے دعائیں کرواتے اور اسے پیسے دیتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا ولی اللہ ہے۔ وہ شخص کیسے ولی اللہ ہو سکتا ہے جبکہ وہ کچھ کام نہیں کرتا۔ کچھ نہ کرنا تو نافرمانی ہے۔ اللہ کی نافرمانی سے اللہ کی دوستی یا ولایت نہیں ملتی۔ ہر بندہ کام کرنے کا مکلف ہے ہاں جتنا کر سکتا ہے اتنا ہی مکلف ہے۔ جو کچھ کر سکتا ہے اس کے لیے اسباب اختیار کرے۔ اس کا امتحان ہی یہی ہے کہ وہ جائز اسباب اختیار کرتا ہے یا ناجائز۔

فرمایا، اللہ کریم نے چھ دنوں میں زمینوں، آسمانوں کو آباد کیا۔ فضاء بنائی، بادل و بارش کا نظام بنایا۔ زمین میں روئیدگی رکھی، سورج، چاند کے اثرات سے زمین پر نمو کا نظام ترتیب دیا۔ زمین میں غذا کا سامان رکھا، گھاس، چارا، اناج، سبزیاں، جڑی بوٹیاں، ادویات، پھل، پھول کیا کیا اس سے نکال رہا ہے۔ معدنیات کے خزانے رکھے۔ انہی چھ دنوں میں اسے مکمل کیا۔ اسی طرح انہی دنوں میں آسمان بنائے، ستاروں، سیاروں سے مزین فرمایا۔ آسمان پر

مخلوق کے آنے جانے کے راستے متعین فرمائے، مخلوق کی رہائش کا سامان رکھا اور مزید بے شمار نعمتیں رکھیں۔

وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ زمین و آسمان کے بننے سے پہلے سارا پانی تھا۔ اس پر اس کا عرشِ سلطنت تھا۔ اس کی حکومت جاری وساری تھی۔

قرآن حکیم آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے بتا چکا کہ زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے اس کی سلطنت، اس کا عرش، اس کا تخت پانی پر تھا۔ سائنس نے بیسویں صدی میں تحقیق کا نتیجہ بیان کیا ہے کہ زمین و آسمان سے پہلے سارا پانی ہی تھا۔

تخلیقِ کائنات کس کے لیے؟

اللہ کریم نے اتنی عظیم الشان کائنات صرف انسان کے لیے تخلیق فرمائی۔ یہ سارا نظام انسان کے لیے بنایا جسے اپنی اطاعت کا مکلف ٹھہرایا۔ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ:29) فرمایا، روئے زمین پر جو کچھ ہے تمہارے لیے ہے۔

ذرا سا غور کریں تو اس بات کی سمجھ آجاتی ہے کہ کتنی ایسی مخلوق ہے جو ہمارے جانے بغیر ہماری خدمت کر رہی ہے۔ مثلاً کاشتکار لوگ جانتے ہیں کہ جب باجرے، جوار وغیرہ کی فصلیں آتی ہیں تو چڑیوں کے غول کے غول آجاتے ہیں اور کاشتکار انہیں بھگانے کے لیے کئی جتن کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ چینی کاشتکاروں نے یہ فیصلہ کیا کہ چڑیوں کا مکمل طور پر صفایا کر دیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک مہم چلائی اور چڑیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نقصان دہ کیڑوں نے ان کی فصل کو وہ نقصان پہنچایا جو چڑیاں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ کیڑوں کی بہتات نے ان کی فصلیں تباہ کر دیں۔ معلوم ہوا کہ چڑیاں اناج کھانے کے علاوہ وہ کیڑے بھی کھا جاتی تھیں جو فصلوں پر آتے تھے۔ جب چڑیاں نہ رہیں تو کیڑے اتنے ہو گئے کہ فصل برباد ہو گئی۔

بنگال کے کاشتکاران سانپوں کو کچھ نہیں کہتے جو ان کے کھیتوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ ان سے بچ کر نکل جاتے ہیں لیکن انہیں مارتے نہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ سانپ ان چوہوں کو کھا جاتے ہیں جو کھیت کی مُنڈیروں میں سوراخ کرتے ہیں۔ جب سوراخ ہو جائے تو پانی بہہ جاتا ہے اور چاولوں کی فصل سوکھ جاتی ہے۔

قدرت نے ایسا نظام ترتیب دے رکھا ہے کہ ہمیں پتہ چلے یا نہ چلے اس کی بے شمار مخلوق ہماری خدمت کر

رہی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، سیارے سب کی توجیہات کا مرکز یہ زمین ہی ہے۔ ان کے اثرات سے زمین پر قدرت کا کارخانہ چل رہا ہے۔ کسی کی تمازت سے چیزیں اُگ رہی ہیں، کسی کی ٹھنڈی چاندنی سے ان میں مٹھاس پیدا ہو رہی ہے۔ اسی طرح زمین کی ساری مخلوق انسان کے استعمال میں ہے۔ اللہ کریم نے تو انسان کے لیے اتنی بڑی کارگاہِ حیات بنائی اور اسے یہ احساس ہی نہیں کہ وہ اللہ کا شکر کرے اس کی اطاعت کرے اور اس امتحان میں پورا اترے جس کے متعلق فرمایا، ''میں نے یہ سب کچھ اس لیے پیدا کیا لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ تاکہ اے انسانو! تمہاری آزمائش ہو سکے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے، کون میری اور میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے، تمام انبیاء پر ایمان لاتا ہے، میری کتاب کی پیروی کرتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے۔

مزاجِ انسانی:

انسان کا عجیب مزاج ہے وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگو! تمہیں موت کے بعد زندہ ہونا ہے۔ اگر تم ان نعمتوں کی شکر گزاری کرتے رہے تو تمہیں مزید انعام ملے گا۔ اگر ناشکری کرتے رہے تو سزا پاؤ گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر کافر کہتے ہیں مرنے کے بعد زندہ ہونا تو صاف اور کھلا جادو ہے۔

یہ کیسے جاہل ہیں ان میں یہ شعور بھی نہیں کہ جادوگر تو دنیا کمانے کے لیے جادو کرتے ہیں۔ آخرت کے حصول کے لیے نہیں کرتے۔ حیات بعد الموت پر تو جادوگروں کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ جادو خود کفر ہے۔ کسی کافر کا آخرت پر ایمان ہی نہیں ہوتا تو وہ آخرت کے لیے تردد کیوں کرے گا۔ جادوگر تو ساری محنت خود کو بڑا منوانے اور دنیوی مفادات کے حصول کے لیے کرتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے حیات بعد الموت کی بات کرتے ہیں اور یہ جاہل کہتے ہیں یہ جادو ہے۔ بھلا جادو کا حیات بعد الموت سے کیا تعلق۔ اور جادوگر کو اس سے کیا؟ وہ تو دنیا سمیٹنے کے لیے سارے حربے کرتا ہے، سارے مکر کرتا ہے۔

ہر کام میں تدریج:

فرمایا: وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ کافر ایسا جاہل

ہے کہ دنیوی زندگی میں اسے تھوڑی سی مہلت مل گئی تو وہ اکڑ گیا۔ اللہ کریم نے انبیاءؑ بھیجے، اپنے احکام بھیجے۔ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے۔ آخری کتاب القرآن نازل ہوئی۔ اللہ نے دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ واضح فرما دیا۔ اور جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اگر نافرمانی کرو گے تو عذاب بھگتو گے۔ اس دوران یہ عذاب سے محفوظ رہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اللہ کو مان رہے ہیں نہ اللہ کے نبی (علیہ السلام) کو نہ اللہ کی کتاب کو۔ من مانے عیش کر رہے ہیں۔ ہم پر تو عذاب نہیں آتا۔ پھر کس نے اسے روک رکھا ہے۔ آجائے عذاب!

حق یہ ہے کہ نظامِ کائنات ایک ترتیب پر قائم ہے۔ تمام امور میں تدریج ہے۔ ہر کام درجہ بدرجہ تکمیل پاتا ہے ایک بیج بویا جاتا ہے تو فصل بننے اور پکنے تک کتنا عرصہ لگتا ہے۔ اپنے وقت پر تمام مراحل سے گزر کر پکتا ہے تو اگر یہ گناہ کر رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر آسمان فوراً ٹوٹ پڑے گا۔ نہیں یہ اپنا سفر جاری رکھیں۔ ایک دن منزل پر پہنچ جائیں گے۔ اور یہ تو اس حقیقت کو نہیں پا سکے کہ گناہ کے راستے پر چلتے رہنا خود ایک عذاب ہے۔ کیا یہ تھوڑا عذاب ہے کہ بندہ اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے۔ جب کوئی اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے تو اس کے دل میں اتنی پریشانیاں جمع ہو جاتی ہیں کہ وہ بجائے خود اس کے لیے ایک عذاب بن جاتی ہیں۔

ایک وقت آئے گا جب یہ زندگی ختم ہوگی، یہ موت کو پالیں گے، حالت نزع سے گزریں گے تو نتائج سامنے آجائیں گے۔ فصل پک کر تیار ہو چکی ہوگی۔ فرمایا: اَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٨﴾ اچھی طرح سن لو! جس دن وہ عذاب آئے گا پھر وہ کسی طریقے سے بھی تم سے ٹل نہیں سکے گا۔ عذاب سے بچنے کا تو ایک طریقہ تھا۔ اللہ پر ایمان لاتے اس کی عظمت کا اقرار کرتے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حق ادا کرتے۔ وہ تم نے نہیں کیا۔ اب جب موت آئے گی تو تمہارے پاس اس سے بچنے کے لیے کوئی آسرا نہیں ہوگا۔ اور جن باتوں کا تم مذاق اڑایا کرتے تھے وہ مصیبتیں بن کر تمہارے گلے پڑ جائیں گی۔ اللہ کی باتوں سے تمسخر کرنے پر جو غضب الٰہی وارد ہوتا تھا وہ تمہیں گھیر لے گا۔

سورۃ ھود رکوع 2 آیات 9 تا 24

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿٩﴾
وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ
لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿١٠﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١١﴾ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ
يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٢﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ
مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٣﴾
فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٤﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ
اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ
لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ
كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ
الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ
كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۸ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۹ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ
يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ
يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا
يُبْصِرُوْنَ ۝۲۰ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ۝۲۱ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝۲۲ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝۲۳ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ
يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۴

اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھائیں پھر اس سے وہ واپس لے لیں تو وہ
یقیناً ناامید (اور) ناشکرا ہو جاتا ہے ﴿۹﴾ اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد جو کہ اس پر
آئی تھی ہم اسے کسی نعمت کا مزہ چکھادیں تو ضرور کہنے لگتا ہے میرے سب دکھ دور ہو
گئے بے شک وہ خوشیاں منانے والا فخر کرنے والا ہے ﴿۱۰﴾ سوائے ان لوگوں کے
جو صبر کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے بخشش ہے اور
بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۱﴾ تو شاید آپ کچھ چیزیں جو آپ پر وحی کے ذریعہ سے آتی
ہیں چھوڑنا چاہیں اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ (کافر) کہنے لگیں
گے کہ ان پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں
آیا بے شک آپ تو (انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر چیز پر پورا اختیار رکھنے
والے صرف اللہ ہیں ﴿۱۲﴾ یا یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے (قرآن کو) از خود گھڑ

لیا ہے۔ تو فرمایئے کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور (اپنی مدد کے لیے) اللہ کے علاوہ جس کو بھی بلا سکتے ہو بلا لو ﴿۱۳﴾ پھر یہ (کفار) اگر آپ کی بات قبول نہ کریں (تو ان سے کہہ دیں) جان لو کہ یہ تو اللہ ہی کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں تو کیا تم اب اسلام قبول کرتے ہو؟ ﴿۱۴﴾ جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طلبگار ہوں ہم ان کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی کوئی حق تلفی نہیں کی جاتی ﴿۱۵﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور جو انہوں نے یہاں (دنیا میں) کیا تھا سب برباد ہوا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں سب ضائع ہوا ﴿۱۶﴾ بھلا (منکر قرآن ایسے شخص کے برابر ہے) جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اور اس کے ساتھ ایک (آسمانی) گواہ بھی اس (اللہ) کی جانب سے ہو اور اس سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب تھی جو پیشوا اور رحمت تھی یہی لوگ تو اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی گروہوں میں سے اس کے ساتھ کفر (انکار) کرے تو اس کا ٹھکانہ آگ ہے سو (اے مخاطب!) تم اس (قرآن) کی طرف سے شک میں مت پڑنا۔ یقیناً وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سچ ہے و لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۱۷﴾ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ جوڑ لے ایسے لوگ اپنے پروردگار کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور (اعمال کے) گواہ (فرشتے) کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ بولا تھا جان لو! کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿۱۸﴾ جو کہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں ٹیڑھا پن تلاش کرتے ہیں اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں ﴿۱۹﴾ یہ لوگ زمین میں (کہیں بھاگ کر، اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے۔ ان کو دُگنا عذاب دیا جائے گا کہ یہ لوگ (کفر کی وجہ سے آپ کو) نہ سن سکتے تھے اور نہ (آپ کو) دیکھ سکتے تھے ﴿۲۰﴾ یہ وہ لوگ

ہیں جو اپنے آپ کو برباد کر بیٹھے اور جو جھوٹ انہوں نے گھڑ رکھے تھے سب ان سے جاتے رہے ﴿۲۱﴾ لازماً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں ﴿۲۲﴾ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی کی یہی لوگ جنت کے رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۳﴾ دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے (ایک) اندھا اور بہرہ ہو اور (دوسرا) دیکھتا اور سنتا ہو کیا دونوں (اپنی) حالت میں برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟ ﴿۲۴﴾

تفسیر و معارف

ایمان، انسانی مزاج کی اصلاح کا سبب:

انسانی مزاج اثر پذیر ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہو۔ دامانِ رسالت سے وابستہ رہے تو اس کی حالت اور ہوتی ہے۔ تکلیف آئے تو صبر سے وقت کاٹتا ہے۔ دل میں اللہ کی یاد ہو تو پریشانیوں میں بھی دل پرسکون رہتا ہے۔ اسباب اختیار کرتا ہے، کمی کوتاہی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اللہ سے پرامید رہتا ہے۔ اللہ کریم کی طرف سے آسانی آئے تو اکڑتا نہیں۔ اللہ کی نعمتوں کا احساس کرتا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور مزید اطاعت کرتا ہے۔

اور اگر اللہ سے، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے، ایمان سے دور ہو تو مزاجِ انسانی بگڑ جاتا ہے۔ ظاہری مال و دولت کے باوجود سکون کا لمحہ نصیب نہیں ہوتا۔ بے چینی اور گھبراہٹ گھیرے رکھتی ہے۔ دل پریشانیوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ یہی فرمایا، وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ اگر ہم کسی انسان پر اپنی رحمت کریں۔ اسے نعمتیں دیں، آسودہ حال کریں، خوشحالی اور صحت مندی عطا کریں پھر ان میں سے کوئی چیز ان سے چلی جائے، دولت یا صحت چلی جائے تو پھر ناامید ہو کر اللہ کی ناشکری کرنے لگ جاتا ہے۔ کہتا ہے، ''ہمیں تو اللہ نے کچھ دیا ہی نہیں''۔

"سوائے بیماری کے کچھ دیا ہی نہیں، ہمیں رسوا کیا"۔ یہ جملے صرف بڑے بڑے امراء اور صاحب اقتدار ہی نہیں کہتے۔ ایسی باتیں ہمارے جیسے عام آدمی، کاشتکار، مزدور بھی کہتے ہیں۔ "ہمیں اللہ نے کیا دیا، ہمارا اللہ نے کیا سنوارا"۔ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ اللہ پر ایمان نہیں۔ آخرت پر یقین نہیں، نبی کریم ﷺ سے تعلق نہیں۔ ظاہری دنیا پر ہی نظر ہے۔ جب دنیا جاتی نظر آتی ہے تو ناشکری کرنے لگتے ہیں۔

انہی لوگوں کا دوسرا حال یہ ہے۔ فرمایا، وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ کہ اگر اللہ انہیں نعمتیں دے دے، صحت دے، مال و دولت، عہدہ، اقتدار دے دے تو اُلٹا اکڑ جاتے ہیں۔ شکر کرنا تو درکنار خود خدا بننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب میں ہی سب کچھ ہوں۔ میرے پاس دولت ہے، اقتدار و اختیار ہے۔ اپنی مفلسی، تنگ حالی، بے بسی بھول جاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو ذاتی سمجھتے ہیں ان پر غرور کرتے ہیں، زعم میں مبتلا ہو کر اکڑتے ہیں۔ یعنی نہ افلاس میں اللہ سے راضی نہ دولت مندی میں اللہ سے راضی ہوتے ہیں۔ دولت مندی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ اُس حال ہی میں اطاعت نصیب ہوتی ہے نہ اس حال میں اطاعت نصیب ہے۔ دونوں حالتوں میں ناشکری کرتے ہیں۔

فرمایا، اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ "سوائے ان لوگوں کے جو صبر کرتے ہیں"۔ صبر کیا ہے؟ گناہ سے بچنا اور اللہ کی اطاعت پر کاربند رہنا صبر ہے۔ فرمایا، وہ لوگ جو ہر حال میں اللہ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ مشکل ہو یا آسانی، بیماری آ جائے یا اللہ صحت دے دے، دولت مند ہوں یا غریب، حکومت میں ہوں یا رعیت میں ہر حال میں اللہ کی اطاعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ہر حال میں اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک اعمال کرتے ہیں۔

عمل کے نیک ہونے کی دلیل:

یوں تو دنیا میں انسان جو بھی عمل کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اچھا عمل کیا۔ لیکن کسی بھی عمل کے اچھا ہونے کی دلیل کیا ہے؟ ایک ہی دلیل ہے کہ جو عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہے، یا سنتِ مطہرہ کے مطابق ہے وہ اچھا عمل ہے جو عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

صحتِ عمل کا ایک ہی معیار ہے۔ وہ ہے ذاتِ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ جو کام کرنے کا حضور ﷺ حکم دیں اور جس طریقے سے کرنے کو فرمائیں وہ اچھا ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ بُرا ہے خواہ بظاہر کتنا ہی

پرکشش اور خوشنما ہو۔

فرمایا، جو لوگ صبر کرتے ہیں۔ نیک اعمال کرتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے لیے میری بخشش ہے۔ انسان کو سوچنا چاہیے کہ بندہ نیکیاں کر کے بھی کوتاہی کر جاتا ہے۔ سجدہ کر کے بھی کمی رہ جاتی ہے۔ بندے میں وہ خلوص نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ وہ توجہ نہیں ہوتی۔ بظاہر بندہ سجدہ کرتا ہے اور سوچیں کہیں اور بھٹک رہی ہوتی ہیں۔ صلوٰۃ میں خشوع و خضوع نہیں ہوتا۔ نیکیاں کرتے ہوئے بھی کمی رہ جاتی ہے۔ پھر انبیاءؑ کے علاوہ تو کوئی معصوم عن الخطا نہیں ہوتا۔ ہر بندے سے گناہ ہو سکتا ہے۔ خطا ہو سکتی ہے۔ لیکن جو لوگ دامانِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وابستہ ہوتے ہیں، میں ان ہی کی غلطیاں معاف کرتا ہوں۔ انہی کی کوتاہیوں سے درگزر کرتا ہوں۔ میری مغفرت ان ہی کے لیے ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑪ ان کے لیے اللہ کی بے پناہ بخشش ہے۔ بہت بڑا اجر ہے۔ اتنا بڑا اجر کہ انسانی علم اور انسانی سوچ میں نہیں آ سکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ جلیلہ:

فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب جلیلہ یہ ہے کہ جو وحی میں ارشاد ہو، اسے علی الاعلان بیان فرمائیں۔ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ اس آیہءمبارکہ کا پس منظر یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے آباؤ اجداد کے مذاہب کو رد کرتے ہیں۔ ان کی تردید فرماتے ہیں اور انہیں گمراہی اور کفر قرار دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین پر عمل کرتے رہیں اور انہیں اپنے پر عمل کرنے دیں۔

یہ آیہءکریمہ بھی ان آیات میں سے ہے جن کا ترجمہ کرتے ہوئے اردو میں متبادل الفاظ نہ ملنے کے باعث ترجمے میں ابہام رہ جاتا ہے۔ دوسرے تراجم میں بھی دیکھا تو بات الجھ جاتی ہے کہ شاید جو وحی آتی تھی حضور ﷺ اس میں کچھ بیان نہیں کرتے چاہتے تھے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔

اس آیت کا درست مفہوم:

درست مفہوم یہ ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرضی سے کچھ ارشاد فرماتے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف حمد وثنا بیان کرتے۔ آخرت کے ثواب اور اجر بیان کرتے، قیامت کی، ملائکہ کی بات کرتے۔ لیکن جہاں کفر کی تردید آتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کریمانہ مزاج عالی کے مطابق شاید کوئی ایسی بات نہ کہتے جس سے ان (کفار) کو دکھ ہوتا۔ لیکن بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کی نہیں ہے بلکہ اللہ کریم کی منشا کی ہے۔ آپ ﷺ پر وحی آتی ہے اور

وحی کو من وعن بیان کرنا، اس کی وضاحت کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ جلیلہ ہے۔ آپ ﷺ حق بیان فرماتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ان کا دل دکھانا نہیں ہے بلکہ اللہ کریم کی نازل کردہ وحی کی وضاحت کرنا ہے۔ اس بات سے اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو اس کی مرضی۔

پس منظر یہ ہے کہ مشرکین مکہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ یہ لوگ دنیا بھر میں سفر کرتے تھے مکہ مکرمہ تجارتی مرکز تھا جہاں بڑی بڑی منڈیاں لگتیں، میلے ہوتے، خرید وفروخت ہوتی۔ گردونواح کے ممالک سے لے کر شام، روم، افریقہ، ایشیا، ہندوستان تک کے تجارتی سفر اہل مکہ کا پیشہ تھا۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف عقیدے تھے۔ آگ کے پجاری تھے۔ سورج، چاند، ستاروں کی پرستش کرنے والے، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہہ کر ان کی پوجا کرنے والے تھے۔ کاہنوں، نجومیوں اور جادوگروں کی پوجا کرنے والے تھے اور بت پرست بھی تھے مکہ کا جو شخص جس ملک میں جاتا، اسے جو پسند آتا، وہ اس مذہب کو اختیار کر لیتا تھا۔ مشرکین مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے بھی یہی خیال کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مذہب اختیار کر لیا ہے تو ٹھیک ہے ان کی مرضی۔ اس حد تک تو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن پہلے سے رائج تمام مذاہب دوسرے کے مذہب کو باطل نہ کہیں، کفر کہہ کر ردّ نہ کریں۔ اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے آباء واجداد کے اختیار کیے ہوئے مذاہب کو یکسر ردّ کرتے ہیں، ان کی تردید فرماتے ہیں، انہیں گمراہی اور کفر قرار دیتے ہیں۔ یہ بات بڑی تکلیف دہ ہے۔ انہیں چاہیے کہ خود اپنے مذہب پر عمل کرتے رہیں اور ہمیں اپنے مذہب پر عمل کرنے دیں۔

اس پر اللہ کریم نے فرمایا: فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر اپنی پسند سے ارشاد فرماتے تو ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی باتیں ارشاد نہ فرماتے جن سے دوسروں کی دل آزاری ہوتی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ ارشاد نہیں فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کہتے ہیں جو آپ ﷺ کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب جلیلہ یہ ہے کہ جو وحی ارشاد ہو وہ علی الاعلان بیان فرمائیں اور اس سے اگر کوئی خفا ہوتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

احقاقِ حق سے تردید باطل:

یہاں یہ بات سمجھ آتی ہے کہ احقاقِ حق سے تردید باطل از خود ہو جاتی ہے۔ خصوصی طور پر کسی کا نام لے کر تردید کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ دو خبروں میں سے سچ ایک ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا جو بات ارشادِ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہے اس کی تردید از خود ہو جاتی ہے۔ جیسے مشرکینِ مکہ کے باپ دادا اگر مشرک، کافر یا بے دین تھے تو انہیں خود

بیٹھ کر تجزیہ کرنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے وہ حق ہے تو بجائے باپ دادا کے مذہب کو پکڑے رکھیں انہیں اللہ کریم کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو تھامنا چاہیے لیکن یہ ایسے لوگ ہیں کہ حق اپنانے کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روکنا چاہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ہر حال میں حق بیان فرماتے رہیں گے۔ جو وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے رہیں گے۔ احکام بھی سنائیں گے آیات کا مفہوم بھی سمجھائیں گے اور جو حکم ملے گا اس پر عمل بھی کریں گے۔ اس پر کفار ناراض ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں۔ کوئی پروا نہیں۔

فرمایا، وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ پھر شاید اس بات سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہو کہ کفار کہتے ہیں کہ اگر یہ اللہ کے نبی علیہ السلام ہیں تو ان پر کوئی بہت بڑا خزانہ کیوں نازل نہیں ہوتا کہ بادشاہوں کا طریقہ یہی ہے کہ بادشاہوں کے پاس بڑے بڑے خزانے ہوتے ہیں۔ اس سے وہ لوگوں میں بانٹتے ہیں، مراعات وانعامات دیتے ہیں اس طرح لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر حکومتیں کرتے ہیں تو اگر یہ اللہ کے نبیؐ ہیں تو اللہ انہیں بہت بڑا خزانہ دے دیتا یہ لوگوں میں کروڑوں بانٹتے اور لوگ ان کا کلمہ پڑھتے رہتے۔ یا پھر اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ان کے ساتھ کوئی فرشتہ نازل ہوتا جو لوگوں کو بتاتا کہ یہ واقعی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اللہ کریم نے فرمایا، اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو ان کو ان کے انجامِ بد سے ڈرانے والے ہیں اور صرف اللہ ہی ہر چیز پر پورا اختیار رکھتے ہیں یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ پیسے دے کر ایمان نہیں خریدا جا سکتا۔ دولت کے لالچ میں کسی کی بات ماننے سے ایمان نہیں ملتا اور اگر ہم فرشتہ نازل کر دیتے تو نہ یہ فرشتے کو دیکھ سکتے نہ اس کی بات سن سکتے۔ اگر فرشتہ انسانی شکل میں آتا اور یہ اسے دیکھ لیتے، سن لیتے تو پھر وہی اعتراض کرتے کہ یہ تو ہمارے جیسا ہی ہے۔ ان کی یہ دونوں باتیں فضول ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں اس طرح ان کی دونوں باتوں کا رد ہو گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب جلیلہ تو اتنا عظیم ہے کہ جو اعمالِ بد یہ آج کر رہے اور جن کی حقیقت ان پر مرنے کے بعد منکشف ہوگی کہ جو یہ کرتے رہے وہ باطل تھا لیکن تب اعمال کی اصلاح کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ حقائق آج یہاں دارِ دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما رہے ہیں کہ توبہ اور اصلاح کا موقع دارِ دنیا میں ہے۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ توبہ اور اصلاح دو چیزیں نہیں بلکہ توبہ اصلاح کا نام ہے۔ محض زبانی اقرار یعنی توبہ توبہ کہنا اور عمل نہ کرنا کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور کوئی شخص زبانی اقرار نہ بھی کرے لیکن برائی کو چھوڑ دے اور نیکی اپنا لے تو یہ توبہ ہے۔ یعنی عملی

اصلاح کا نام توبہ ہے۔توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ اگر عقیدہ غلط ہے تو عقیدے کی اصلاح کرے اور عملاً نیکی کے راستے پر گامزن ہو جائے دنیا دارِ عمل ہے جس نے اصلاح کرنی ہے وہ کر لے۔میدانِ حشر میں توبہ کا وقت نہیں ہوگا۔کتنا عظیم احسان ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس ہستی کو بھیجنے والے اللہ کریم کا کہ جن نتائج کا سامنا قبر میں جا کر کرنا ہے ان اعمال کی خبر ہمیں دنیا میں دے دی کہ اس غلطی سے باز آ جاؤ اس پر یہ سزا مرتب ہوگی اور اس نیکی پر کاربند ہو جاؤ اس کا اتنا بڑا اجر ہے۔

فرمایا،خزانے سے ایمان نہیں خریدا جاسکتا۔ایمان ہر شخص کے نہاں خانہء دل کا فیصلہ ہے کہ وہ کس بات کو قبول کرتا ہے اور ایمان کی دلیل اس کے اعمال ہیں۔اگر مانتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے تو درست اور اگر کہتا ہے کہ مانتا ہوں لیکن عمل نہیں کرتا تو بھی مسلمان ہی گردانا جائے گا لیکن عنداللہ اس کا اسلام قابلِ اعتبار نہیں کہ جس پر وہ عمل نہیں کرتا اس کو مانتا کیا ہے؟

فرمایا،شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر ان کی یہ باتیں گراں گزرتی ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے ساتھ کوئی خزانہ ہوتا یا فرشتہ تصدیق کرنے آتا تو ہم آپ پر فوراً ایمان لے آتے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کفار کے لئے بھی دکھ محسوس ہوتا تھا کہ میری بعثت کے بعد بھی یہ محروم کیوں ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو رحمۃ للعالمین اور کریم ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ کاش یہ ایمان لے آتے اور اللہ کے عذاب سے بچ جاتے۔

اللہ کریم نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاجِ کریمانہ اپنی جگہ لیکن نتائج تو حقائق پہ آئیں گے۔جب یہ میرے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانیں گے تو کسی کرم کے مستحق نہ رہیں گے۔

ایمان تو عظمتِ الٰہی کے اقرار کا نام ہے۔ایمان کے لیے معبودانِ باطلہ کا انکار لازم ہے ایمان اپنی توقعات اللہ سے وابستہ کرنے کا نام ہے اور یہ سارا فعل نہاں خانہء دل کا ہے۔یہ خزانے بانٹ کر نہیں خریدا جاسکتا۔ اور رہی بات فرشتوں کے نازل ہونے کی تو فرشتے تو پہلے سے زمین پر اتنے موجود ہیں جتنی انسانی آبادی نہیں۔ایک ایک انسان کے ساتھ کئی فرشتے ہیں۔بارش کے ہر قطرے کے ساتھ فرشتہ ہے جو اسے وہاں پہنچا کر چھوڑتا ہے جہاں اس کا پہنچنا اللہ نے مقدر کیا ہے۔کیا کسی نے وہ فرشتے دیکھے ہیں؟ قدرت کا نظام ایسا ہے کہ انسانی وجود میں چبانے سے لے کر ہضم ہونے تک،خون،گوشت بننے تک ہر مرحلے پر فرشتوں کی ذمہ داری ہے۔جب کوئی بیماری آتی ہے تو اللہ کریم وہیں اس مقررہ فرشتے کو مقررہ کام کرنے سے روک دیتے ہیں۔فرشتہ اپنا کام چھوڑتا ہے تو بیماری بنتی ہے۔کیا ہم نے کبھی دیکھا کہ ہمارے ساتھ کتنے فرشتے کام پر لگے ہوئے ہیں۔اسی

طرح اگر کوئی فرشتہ نازل ہوتا تو انہیں نظر نہ آ سکتا۔ اگر اسے انسانی شکل میں بھیجا جاتا تو پھر یہی اعتراض ہوتا کہ یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے لہٰذا ان کی یہ دونوں باتیں فضول ہیں۔

اللہ کا اس سے بڑا احسان کیا ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نذیر بنا کر بھیجا۔ فرمایا، اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ط جن باتوں سے یہ برزخ اور میدان حشر میں جا کر آگاہ ہوں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہ نتائج دار دنیا، دارالعمل میں جہاں توبہ کا موقع ہے، اصلاح کی مہلت ہے آج بتا دیئے ہیں۔ وہ حقائق جو بعد از موت سامنے آئیں گے ان کی خبر یہاں پہلے سے دے دی ہے۔

اردو کا دامن تنگ ہے اور عربی وسیع المعانی زبان ہے لہٰذا نذیر کے معنی ڈرانے والا ہی لکھا جاتا ہے۔ اکرم التراجم میں، میں نے ڈرانے والے کے ساتھ بریکٹ میں (انجام بد) کر دیا ہے۔ اس سے کچھ وضاحت ہو جاتی ہے کہ فرداء قیامت جن نتائج کو یہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور چلائیں گے کہ یا اللہ ہمیں دنیا میں بھیج دے ہم خوب اچھی طرح تیری اطاعت کریں گے انہیں ان باتوں کی خبر آج دی جا رہی ہے اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن کے بھلے کی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم آج کر رہے ہیں وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنے سے روک رہے ہیں، آپ ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے ہیں، ایذا پہنچاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو ایذا دیتے ہیں۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ اور ہر چیز پر کامل اختیار رکھنے والا اللہ کریم ہے۔ فیصلے اللہ کے ہیں۔ ہر چیز کا مالک وہ ہے۔ کائنات کا خالق وہ ہے، چلانے والا وہ ہے، رب وہ ہے، انجام تک پہنچانا اس کا کام ہے۔ میرا منصب جلیلہ یہ ہے کہ میں تمہیں بھلائی کی طرف دعوت دوں۔ نیک اعمال کرنے پر نیک انجام کی بشارت دوں۔ برائی سے متنبہ کروں۔ یہ بتاؤں کہ کون سا فعل برائی ہے اور کون سی بات اللہ کو پسند نہیں۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ برائی کی سزا بہت سخت ہے۔

جس طرح دنیا میں ہم سفر کرتے ہیں۔ دوران سفر کوئی ہمیں روک کر بتا دے کہ چند میل آگے خطرناک ڈاکو ہیں آگے مت جاؤ تو ہم اس کے کتنے احسان مند ہوں گے لیکن میدانِ حشر میں کیا ہوگا، جہنم کی ہولناکیاں کیا ہیں؟ جس سمت ہم چل رہے ہیں یہ کہاں پہنچے گی۔ یہ سب کچھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمیں بتا رہے ہیں کہ برائی سے بچو، نیکی کے راستے پر چلو یہ تمہیں جنت تک لے جائے گا تو اس سے بڑا احسان کیا ہوگا، اس سے بڑی خیر خواہی کیا ہوگی!

انبیاءؑ کا کام محض دنیوی خزانے بانٹنا نہیں ہے۔ انبیاءؑ کا اس چیز سے کوئی واسطہ نہیں کائنات کا نظام چلانے والا اللہ کریم ہے۔ انبیاءؑ تو اس کے نور کے امین اور اس روشنی کو بانٹنے والے ہیں۔ بندوں کے سارے فیصلے اللہ کریم خود کرتا ہے۔

ہر فرد کا اللہ کریم سے ذاتی تعلق:

اس آیہء کریمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر فرد کا اللہ کریم سے ایک ذاتی تعلق ہے جس کے ساتھ جیسا تعلق ہے اس کے متعلق ویسے ہی وہ فیصلے فرماتا رہتا ہے اور یہ ایسا معاملہ ہے کہ اس کی ساری خبر اللہ کریم اپنے نبیوں ؑ کو بھی نہیں دیتے۔ جو بات اپنے نبیوں ؑ کو بتانا چاہیں اور جتنا بتانا چاہیں بتا دیتے ہیں اور جو نہ بتانا چاہیں وہ نہیں بتاتے۔ یہ اللہ کریم اپنی شان ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (البقرہ:6) جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری کاوش کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارا حق بیان کرنے کے باوجود کفر پر جمے ہوئے ہیں انہیں حضور ﷺ ان کے اعمالِ بد کے انجام سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لیے برابر ہے۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض لوگوں کے بارے اطلاع دی جارہی ہے کہ ان کا میرے ساتھ جو تعلق ہے وہ بگڑ چکا ہے اور اتنا بگڑ چکا ہے کہ صلح سے گزر گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر محنت نہ کیجیے۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے دلوں پر مہر ہوگئی، آنکھوں پر پردے ڈالے جاچکے، کانوں پر پردے ڈال دیئے گئے۔ اس لیے کہ انہوں نے اتنی نافرمانی کی کہ ان کے قلوب سیاہ ہو چکے ہیں۔ ان سے قبول ایمان کی استعداد زائل ہو چکی ہے۔

فرمایا، کائنات کے نظام کا مالک اللہ کریم ہے۔ میں اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ میں اپنی ذمہ داری پوری کرنے کا مکلف ہوں اور ہر چیز کا اختیار اللہ ہی کے پاس ہے مشرکین مکہ جب ہر طرح سے لاجواب ہو گئے تو کہنے لگے اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ انہوں نے قرآن اپنی طرف سے جوڑ لیا ہے۔ قُلْ فرمادیجیے فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ .... تو ایسی دس آیتیں تم بھی بنالاؤ۔

فرمایا، میں نے تم میں چالیس برس گزارے ہیں۔ ان چالیس برسوں میں میرے لبوں سے کوئی غلط لفظ نہیں نکلا۔ کوئی لائق مذمت، لائقِ اعتراض بات ادا نہیں ہوئی۔ کسی فرد پر جھوٹ نہیں بولا، کسی پر بہتان نہیں لگایا۔ جس ہستی نے چالیس برس میں مخلوق پر جھوٹ نہیں بولا وہ ہستی اچانک خالق پر جھوٹ بولنے لگ جائے۔ یہ ممکن نہیں۔ سمجھنے کے لیے یہ ایک ہی نکتہ کافی ہے لیکن اگر تمہیں سمجھ نہیں آتی تو تم مانے ہوئے زبان دان ہو۔ تم میں دانش ور کہلانے والے موجود ہیں، علوم وفنون کے ماہرین ہیں۔ تو تم سارے اکٹھے ہو جاؤ۔ اپنے معبودانِ باطلہ کو بھی بلالو، جادوگروں اور جنوں کو بھی مدد کے لیے بلالو۔ اگر بقول تمہارے قرآن، مخلوق کا لکھا ہوا ہے تو تم بھی مخلوق ہو، تم بھی ایسی دس سورتیں جوڑ کر، بنا کر لے آؤ۔ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

اگر تم اپنی بات میں سچے ہو۔

قرآنِ حکیم کا یہ چیلنج آج بھی موجود ہے۔ عالمِ کفر تب سے لے کر اب تک اپنا پورا زورِ صرف کر چکا لیکن ناکام رہا اور ہمیشہ ناکام رہے گا کہ قرآن حکیم کلامِ الٰہی ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ کریم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ○ (الحجر:9) یہ کتاب ہم نے نازل فرمائی ہے اور اس کی حفاظت بھی ہم ہی فرمائیں گے۔ ساڑھے چودہ سو سال بیت گئے کوئی شخص اس میں رتی برابر تبدیلی نہیں لا سکا۔ اللہ کریم نے اس کی حفاظت کا ایسا انتظام فرما دیا ہے کہ اسے مسلمانوں کے سینوں میں سمو دیا ہے۔ کاغذ پر کوئی کسی حرف کا شوشہ کاٹنے کی کوشش کرے گا لیکن مومن کے دل سے اسے کون کاٹ سکے گا۔ کلامِ الٰہی کو ایسی حفاظتِ الٰہیہ نصیب ہے کہ اللہ کریم نے اس کے پڑھنے والے، اس کو یاد رکھنے والے، اس کے مفاہیم بیان کرنے والے، اس کو روزانہ پڑھنے والے، ہر جمعہ کو، ہر جگہ، ہر مجلس میں بیان کرنے والے بے شمار لوگ مقرر فرما دیئے ہیں۔ فرمایا، اگر تم کہتے ہو کہ میں نے اپنی طرف سے مضمون بنا لیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ وحیِ الٰہی ہے تو اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو ایسی دس آیات ہی لکھ لاؤ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللہ اور جب تم ایسا نہ کر سکو کہ یہ ممکن ہی نہیں تو پھر حق بنتا ہے کہ کم از کم یہ بات مان لو کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جب مخلوق میں سے کوئی ایسا نہیں کر سکتا تو یہ ایک یقینی دلیل ہے کہ یہ خالق کا کلام ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے

وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ تمام آسمانی کتابوں اور سارے قرآن حکیم کا خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کا مستحق صرف اللہ واحد و لاشریک ہے۔ یہ مقام صرف اللہ کا ہے کہ اسی سے نفع کی اُمید رکھی جائے اور اسی کی ناراضگی سے ڈرا جائے اور جتنا بس میں ہو اس کی اطاعت کی جائے۔ جس بندے میں جس کام کے کرنے کی طاقت نہیں اس کے بارے اللہ کریم سوال نہیں کریں گے لیکن جو کام بندے کی ہمت کے مطابق ہے اس کے بارے اللہ کریم ضرور سوال کریں گے۔ قرآن حکیم کے تمام احکام اعتدال پر مبنی ہیں۔ قرآن حکیم صرف عقائد و عبادات اور احکام کا مجموعہ نہیں اس میں گزشتہ اقوام کی تاریخ بھی ہے، آئندہ زمانے کے بارے میں پیشین گوئیاں بھی ہیں، جو ہر زمانے میں اپنے وقت پر پوری ہوتی نظر آتی ہیں۔ اس میں علوم کے خزانے ہیں۔ ساڑھے چودہ سو سال پہلے قرآن نے بتایا کہ بچہ کس طرح نطفے سے بنتا ہے۔ گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، اس میں ہڈیاں بنتی ہیں، خون پیدا ہوتا ہے۔ اس پر کھال چڑھائی جاتی ہے پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ قرآن ہر پہلو سے مکمل، کامل و اکمل ہے تو تم کسی پہلو سے دیکھو اس کی ہر بات سچ ثابت ہوگی۔ جب حق اس طرح تمہارے سامنے واضح ہے تو پھر تم یہ مان لو کہ یہ اللہ کا

کلام ہے۔اس کلام کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝۱۴ تو کیا تم اب اسلام قبول کرتے ہو؟

ہر مسلمان کے لیے ایک آئینہ:

یہ آیہءِ مبارکہ ایک آئینہ ہے۔اس میں ہمیں اپنا عکس دیکھنا ہے۔انبیاءؑ کی تعلیمات کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔اس فلسفے پر غور کریں اور خود کو دیکھیں کیا ہم مسلمان ہیں؟ کیا ہمارا کردار ہمارے عقیدے سے مطابقت رکھتا ہے؟ کسی دوسرے کو کیا جج بنانا۔خود اپنے جج بن کر اپنا عقیدہ اور کردار قرآن پر پیش کریں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر پیش کریں۔کیا ہم اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں؟ آج وقت ہے، ابھی مہلتِ عمل باقی ہے۔توبہ اور اصلاح کے لیے یہی وقت ہے۔خود انصاف سے اپنا جائزہ لیں اور اصلاح کرلیں۔موت آگئی تو عملی زندگی ختم ہوجائے گی۔دارالجزا شروع ہوجائے گا۔وہاں تبدیلی اور اصلاح نہیں ہو سکے گی۔

اللہ کریم ہماری خطائیں معاف فرمائے، صحیح ایمان، صحیح عقیدہ نصیب فرمائے اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نصیب فرمائے۔

حصولِ دنیا کے لیے نیکی کرنا مذاہب باطلہ کی پیروی ہے:

عموی طور پر لوگوں کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات اچھے کام بھی کرتے ہیں اور ناروا کام بھی کرتے ہیں لیکن سب کا مقصد حصولِ دنیا ہوتا ہے۔رشوت لیں، سود کھائیں تو بھی حصولِ دنیا ہی مقصد ہوتا ہے اور عوامی فلاح و بہبود کے کام کریں تو بھی مقصد حصولِ دنیا ہوتا ہے۔شہرت و ناموری کے لیے یا کسی مادی فائدے کے لیے کرتے ہیں۔دنیوی فائدے کے لیے محنت ومجاہدہ کرنا تمام مذاہبِ باطلہ کی بنیاد ہے۔مذاہب باطلہ نے عبادات کے نام پر جتنی رسومات گھڑ رکھی ہیں ان سب کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ دنیا کا فلاں کام ہوجائے گا۔اس پوجا سے بیماری چلی جائے گی۔اس پوجا سے دولت مل جائے گی۔اس رسم سے اولاد ہوجائے گی۔کافر و بے دین ایسا کرتا ہے تو اس کی مرضی ہے کہ اس نے سچے دین کو نہیں اپنایا لیکن جب کلمہ گو بھی یہی کام کریں۔شہرت و اقتدار کے لیے، بزرگ اور نیک کہلوانے کے لیے فلاحی کام کریں حتیٰ کہ نمازیں بھی لوگوں سے پارسائی منوانے کے لیے پڑھیں تو کیا کہیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے) اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ(بخاری) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے کہ جو عمل کیا گیا وہ کس لیے کیا گیا؟ آخرت کے لیے، اللہ کے لیے یا دنیوی شہرت، دنیوی مال و دولت کے لیے۔ نیکی وہ ہے جو اللہ کی رضا کے لیے کی جائے۔

یہاں ارشاد ہوا مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا جو لوگ حصولِ دنیا کے لیے بھلائی کے کام کرتے ہیں۔ اچھے کام کرتے ہیں تاکہ ان کے پاس دولت آجائے یا لوگ انہیں اچھا سمجھیں یا ان کو بڑا مان لیں نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۝۱۵ تو اللہ کریم ان کے اچھے کام ضائع نہیں کرتے۔ اس کا پورا پورا بدلہ انہیں دنیا میں ہی دے دیتے ہیں کہ تمہارا مقصد حصولِ دنیا تھا تو دنیا میں اجر لے لو۔ اس میں ان کی کوئی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یعنی اگر کوئی بھلا کام کرتا ہے لیکن آخرت کے لیے نہیں کرتا تو اس کا اجر اسے کسی نہ کسی صورت میں دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ کبھی شہرت کی صورت میں کبھی بیماری ٹال کر۔ کرنے والے کی جو نیت ہو، جو مقصد ہو، اسے اس دنیا میں پورا کر دیا جاتا ہے۔ جتنی وہ نیکی کرتا ہے اتنا اس کو بدلہ دے دیا جاتا ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ دنیا وقتی ہے۔ یہ ختم ہو جائے گی محض دنیوی فوائد کے حصول کے لیے دنیا کی مہلتِ عمل ضائع کر دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ○ ایسے لوگ جب آخرت میں جائیں گے تو سوائے آگ کے ان کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ جو بھلے کام دنیوی فائدے حاصل کرنے کے لیے کیے تھے۔ شہرت کے لیے کیے تھے ان کا اجر تو دنیا میں مل گیا۔ آخرت کے لیے تو کچھ کیا نہیں۔ اللہ کی رضا کے لیے نہیں کیا۔ اتباعِ رسالت کے لیے نہیں کیا تو آخرت میں ان کے حصے میں صرف آگ ہوگی۔ فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۶ اور وہ جو دنیا میں کرتے رہے تھے سب برباد ہو گیا ضائع ہو گیا۔ آخرت کے لیے نہیں کیا تھا مقصد صرف حصولِ دنیا تھا تو اس کا اجر بھی دنیا ہی میں وصول ہو گیا۔ آخرت میں آئے تو خالی ہاتھ تھے۔ اس سے بڑا خسارہ کیا ہے کہ آدمی ساری زندگی محنت بھی کرتا رہے لیکن آخرت میں تہی دست ہو۔ جیسے دنیا میں ہو رہا ہے کہ دنیوی مفادات کے لیے لوگوں کی منت سماجت کی جاتی ہے لیکن اللہ کو سجدہ نہیں ہوتا۔ فرض نمازیں چھوڑ کر در در کی جبہ سائی میں مشغول رہنا پسند کرتے ہیں۔ فرمایا، جو دنیا کے حصول کے لیے نیکی کرتا ہے وہ مذاہب باطلہ کی پیروی کرتا ہے۔ آخرت میں اس کے لیے سوائے آگ کے کچھ نہیں ہوتا فرمایا، اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ط تقابل کر کے دیکھ لو ایک شخص جو دن رات محض محض حصولِ دنیا کے لیے کوشاں ہے اور دوسرا محض اللہ کی رضا کے لیے محنت کر رہا ہے اس کے پاس روشن دلیل یعنی اللہ کی کتاب ہے۔ قرآن حکیم ہے۔ اسے اللہ کی طرف سے ایک

کتاب ملی ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچائی ہے۔ وہ اس کتاب کو پڑھتا ہے اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اللہ کی طرف سے ایک گواہ ہے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہ اللہ کے نبی ﷺ کی پیروی کرتا ہے۔ وہ ایک واضح روشن راستے پر ہے اور جو شخص ان سب کا انکار کر کے محض دنیا کے پیچھے لگا ہوا عمر ضائع کر رہا ہے وہ اس کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟

قرآن پر صرف ایک ہستی گواہ ہے:

فرمایا، کتاب کے ساتھ اللہ کی طرف سے ایک گواہ بھی ہے جس نے یہ کتاب ہمیں پہنچائی۔ براہِ راست اللہ سے کسی نے نہیں لی۔ براہ راست وحی صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس لیے قرآن پر صرف ایک وہ ہستی ہی گواہ ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نے وحی نہیں سنی۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی اور آپ ﷺ نے لکھوائی کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور قرآن ہے۔

فرمایا، ایسا پہلی بار نہیں ہوا کہ اللہ کی طرف سے کتاب نازل ہوئی ہو۔ تم لوگ سب جانتے ہو کہ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ موسیٰؑ پر کتابِ الٰہی نازل ہوئی تھی جو پیشوا تھی رہبری فرماتی تھی اور اللہ کی رحمت کا خزانہ بھی تھی۔ جتنی بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں جتنے بھی صحیفے نازل ہوئے ان میں یہ دو خصوصیات تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کریم کی طرف سے نازل ہوئیں اور وہ عملی زندگی میں رہنمائی فراہم کرتی تھیں کہ ایسا کرو یہ بھلا کام ہے، اس سے رک جاؤ یہ فعلِ بد ہے اور دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ مجسم رحمتِ الٰہی تھیں۔ انہیں اللہ کی کتاب ماننا رحمت کا سبب تھا۔ اُن کے پڑھنے سے رحمت نازل ہوتی۔ ان پر عمل کرنے سے رحمت نصیب ہوتی۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہی لوگ ان (کتابوں) پر ایمان رکھتے ہیں۔

منکرین کا انجام:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ اور جو طبقے، جو قومیں، جو گروہ اللہ کی کتابوں کو نہیں مانتے ان کے ساتھ دوزخ کا وعدہ ہے۔ دو ہی تو راستے ہیں۔ ایک اطاعتِ الٰہی کا راستہ جو اللہ کی رحمت کو پانے کا راستہ ہے جو جنت کو جاتا ہے اور دوسرا گمراہی کا راستہ جو دوزخ کو جاتا ہے۔ دوزخ غضبِ الٰہی کا مظہر ہے۔

نیکی کی بنیاد یقین:

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ اے مخاطب! کسی شک میں مبتلا نہ ہونا۔ یہ سارا حق

ہے۔ یقینا یہ حق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے۔ اللہ کریم، رب دو جہان ہے۔ ہر ایک کی ہر ضرورت پوری کرنا اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ وہی پالنہار ہے۔ اپنی مخلوق کی رہنمائی فرمانا اسی کا کام ہے کہ رہنمائی انسانی ضرورت ہے۔ اس کے لیے رب کریم نے کتابیں نازل فرمائیں۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تیس پارے قرآن نازل فرمایا، ذخیرۂ احادیث تعامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہؓ۔ تابعینؒ، تبع تابعین، سلف صالحین علماءِ حق اس جادۂ حق پر صدیوں سے چل رہے ہیں۔ یہ سراسر حق ہے اس میں شبہ نہ کرنا۔ ارشاد باری میں شک کرنا بڑا ظلم ہے۔

یقین ہو تو بندہ عمل کرتا ہے۔ متردد ہو، شک ہو تو پھر پروا نہیں کرتا عمل نہیں کرتا۔ اور ایمان و عمل دونوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ تو پروردگار کی رحمت اور اس کی ربوبیت کی شان تھی کہ رہنمائی فرمائے۔ اس نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے انبیاؑ مبعوث فرمائے، ان پر کتابیں نازل فرمائیں اور پھر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ پھر کسی نئی نبوت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ قرآن حکیم جیسی کتاب نازل فرمائی اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ نے لے لیا۔ جس نے قیامت تک کے سارے مسائل سلجھا دیے۔ کوئی الجھاؤ باقی نہیں چھوڑا۔ اور یہ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب القرآن آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ﴿۱۷﴾ لیکن اکثر لوگوں کو ان باتوں کا یقین نہیں۔ یہ ایمان نہیں لاتے۔

ایمان تو یقین کا نام ہے۔ یقین ہی برائی سے روکتا ہے اور نیکی کے لیے مجاہدہ کروانے کا سبب ہے۔ لیکن اکثر لوگ یقین نہیں کرتے۔ کفار و مشرک تو ایمان نہیں لاتے اعمالِ صالحہ کیسے کریں گے لیکن خود کو مسلمان کہلوانے والے کس طرح یہ جرأت کرتے ہیں کہ اللہ نے جسے حرام قرار دیا ہے اسے حلال کہیں۔ قرآن حکیم میں شرعی سزاؤں کی دو اقسام ہیں۔ کچھ جرائم ایسے ہیں جن کی سزا کو قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ شرعی نظامِ عدل کی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے، قرائن و شہادتوں کو خوب دیکھ بھال سے جانچ کر محض اللہ کی رضا کے لیے فیصلہ کرے۔ کچھ جرائم ایسے ہیں جن کی سزا قرآن وسنت میں مقرر کر دی ہے۔ انہیں حدود کہتے ہیں۔ جیسے زانی کی سزا ہے کہ سرعام اسے پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ کتنی شدید سزا ہے لیکن سود اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا مقرر نہیں فرمائی بلکہ فرمایا، فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (البقرہ:279) جو سود کھاتا ہے اور سود کھانے سے باز نہیں آتا وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ تو جس بندے کو اللہ کے اس حکم پر یقین ہے کیا وہ اتنی جرأت کر سکتا ہے کہ سود لے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔

آج کے مسلمان معاشرے میں سود عام ہو گیا ہے۔ ہر شخص اسی کے چکر میں ہے اور چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اس روییے کی زد عقیدے پر پڑتی ہے۔ ایمان نہ رہے تو نیکی کی توفیق نہیں ہوتی۔

نیکی کی بنیاد ایمان اور عقیدے پر ہے کہ بندہ اللہ کی رضا کے لیے اور اپنی اخروی فلاح کے لیے سنت کے مطابق عمل کرے۔ جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جیسا صحابہ کرامؓ نے سمجھا، اس پر عمل کیا۔ انؓ کے عمل پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر تصدیق ثبت فرمائی۔ اسی راہِ حق پر تابعینؒ، تبع تابعینؒ کے قافلے چلے۔ یہ تعامل نیکی کی بنیاد ہے۔ تو جادۂ حق پر چلنے والوں کو جو بُرا بھلا کہے اس کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔

امام مالکؒ کا فرمودہ:

امام مالکؒ سے کسی نے سوال کیا کہ دنیا میں سب سے رزیل اور بدترین شخص کون ہے؟ انہوں نے فرمایا جو صحابہء کبار پر تنقید کرتا ہو۔ اس لیے کہ اللہ کے پیغام کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ سے براہ راست سیکھا، اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو پہنچایا۔ جب صحابہ کرامؓ کے مقام کو مجروح کیا جائے تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔ دین کی بنیاد ہل جاتی ہے۔ اور جو صحابہ کرامؓ پر طعن وطنز کرے اس نے گویا دنیا کی بنیاد اکھیڑ دی لہٰذا اس سے برا شخص دنیا میں کوئی نہیں۔

جنہیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین نہیں ہوتا وہ ایمان نہیں لاتے۔ برائی سے باز نہیں آتے اور پھر یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ برائی کو جائز کروایا جائے۔ جیسے سود کو حیلے حوالے سے حلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر انہیں ایسے فتویٰ فروش بھی مل جاتے ہیں جو رقم لے کر غلط فتویٰ لکھ دیتے ہیں۔ فرمایا، یہ دونوں ایک جیسے ہیں۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ط جو اللہ پر جھوٹ بولے اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے۔

اللہ پر جھوٹ باندھنا کیا؟

اپنی طرف سے رسومات ایجاد کر کے انہیں باعث ثواب سمجھنا۔ انہیں دین کا حصہ بنانا اور یہ کہنا کہ ان سے اللہ راضی ہوگا تو یہ اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔

اللہ کے حرام کردہ اعمال کو کسی حیلے حوالے سے جائز قرار دینا۔ اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ اللہ کے حکم میں ہیرا پھیری کر کے جواز تلاش کرنا اور غلط فتوے دینا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ جیسے بعض فتویٰ فروشوں نے حیلے حوالے

سے سود کے جائز ہونے پر فتوے دے رکھے ہیں پھر دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا بینک بلاسودی کام کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی بینک سارا سود پر چلتا ہے۔ بلاسودی بینک کہلوانے والوں کا اسی قومی بینک میں حصہ ہے۔ آدھے سے زیادہ حصص اگر سودی سرمایے کاری کے ہیں تو پھر یہ تفریق کیسے ممکن ہے اور ان کا بینک سود سے کیسے پاک ہے؟ اسی قومی بینک سے شرائط طے ہوتی ہے اور کبھی کم ریٹ دیا جاتا ہے کبھی زیادہ تو ایسے حیلے حوالے کرنے سے حرام کو جائز قرار دینا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اس عمل کے نتیجے کا اس وقت پتہ چلے گا جب یہ لوگ پروردگار کے سامنے اپنے اعمال کے ساتھ پیش ہوں گے اور وہ گواہ بھی موجود ہوں گے جو یہ کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ بولا۔ اللہ کے فرشتے تو گواہ ہیں ہی۔ خود بندے کے اعضاء گواہ بن جائیں گے کہ یہ اللہ پر جھوٹ بولتا تھا۔ حرام کاموں کے جواز کے فتوے لاتا تھا۔ فرمایا، یہ سب امور بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوں گے اور اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ خبردار سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ لعنت کا معنی ہے اللہ کی رحمت سے مکمل دوری۔ کُلّی محرومی یعنی رحمت کا کوئی ذرّہ بھی نصیب نہ ہونا۔ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہوگی اس لیے کہ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ غلط فتوے دے کر، چور دروازوں کے ذریعے حیلے حوالے نکال کر اور دین میں ٹیڑھا پن تلاش کر کے اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ درحقیقت یہ آخرت کے منکر ہیں۔ اگر انہیں آخرت پر یقین ہوتا تو حیلے حوالے کر کے برائیوں کے لیے جواز پیدا نہ کرتے۔ ان کا یہی عمل اس بات پر گواہ ہے کہ ان کا آخرت پر ایمان نہیں ہے، یقین نہیں ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ان حیلوں حوالوں کے باوجود دنیا میں بھی ان کی مرضی نہیں چل سکتی۔ وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا۔ جسے وہ بیمار کرنا چاہتا ہے یہ اسے صحت مند نہیں کر سکتے۔ اگر وہ کسی کو صحت دینا چاہے تو یہ روک نہیں سکتے۔ یہ لوگ تقدیرِ الٰہی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ان کی مدد کر سکے۔ یہ کائنات اللہ کریم کی ہے جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہاں ان حیلے حوالوں اور کج بحثی کا نتیجہ یہ ہے کہ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ اللہ ان کے لیے عذاب دوگنا کر دیتا ہے۔ ایک عذاب جرم کرنے کا اور دوسرا اس جرم کا غلط جواز پیدا کرنے کا مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اور جس پر اللہ کریم عذاب نازل کر دیتے ہیں اسے نہ سنائی دیتا ہے نہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ بظاہر تو کان

ہوتے ہیں۔ اسے سنائی دیتا ہے لیکن بھلے کی بات، آخرت کی بات اس کے پلے نہیں پڑتی گویا اس کے کان ہی نہیں ہیں۔ بظاہر اسے دکھائی دیتا ہے لیکن وہ حق کو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سزا تو انہیں دنیا میں دی جاتی ہے کہ انہیں حق کو سننا بھی نصیب نہیں ہوتا اور حق کو دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ أُولَٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢١﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا اور اپنا نقصان کیا۔ ان سے وہ سب کچھ جاتا رہا جو کہ وہ گھڑا کرتے تھے۔ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿٢٢﴾ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آخرت میں یہ سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے۔ سب سے زیادہ نقصان میں یہی لوگ ہوں گے جو دنیا میں بظاہر بڑے پارسا بنے رہے۔ دکھاوے کی نیکیاں کر کے بڑی شہرت پاتے رہے لیکن آخرت میں اللہ پر جھوٹ بولنے کے مجرم ٹھہرائے گئے۔ انہیں سخت ترین سزا ہو گی اور دوگنی ہو گی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ وہ لوگ جو ایمان لائے پھر نیک کام کیے اور پورے خلوص دل سے پوری عاجزی، پورے خشوع وخضوع سے اللہ کے روبرو کیے أُولَٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٣﴾ ایسے لوگ جنت میں رہنے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اہل جنت کی نشانیاں:

یہاں تین چیزیں ارشاد فرمائی گئیں۔ ایمان لانا۔ ایمان کی دلیل یہ ہے کہ بندے کے کام اللہ کے حکم کے مطابق ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق کیے جائیں۔ گویا ایمان یہ ہے کہ بندے کو نیکی پر مجبور کر دے۔ اسے آخرت کا اس قدر یقین ہو کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو چھوڑ نہ سکے۔ اور بتقضائے بشریت غلطی ہو بھی جائے تو اللہ سے معافی مانگے اور آئندہ بچنے کی کوشش کرے تو اللہ کریم کی مغفرت اسے بخشنے کے لیے کافی ہے۔ اور سب کچھ خلوص دل سے کرے، دکھاوے کے لیے نہ کرے اہلِ جنت میں یہ تین نشانیاں ضرور ہوں گی۔ اول صاحب ایمان دوم، درجہء ایمان ایسا جو اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مجبور کر دے اور تیسرا یہ کہ خلوصِ دل سے صرف اللہ کی رضا کے لیے کرے۔

دونوں فریقوں کا تقابل:

فرمایا، ان دو طبقوں کی مثال ایسی ہے مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ

جیسے ایک اندھا اور بہرہ ہو اور دوسرے کی آنکھیں بھی ٹھیک ہوں، کان بھی درست ہوں۔ جس نے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پروا نہیں کی اس سے بڑا اندھا اور بہرہ کون ہوگا؟ جس کی بظاہر آنکھیں نہ بھی ہوں اسے کانوں سے سنائی نہ دیتا ہو وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہو تو سننے والی بات اس نے سن لی اور دیکھنے والی بات دیکھ لی۔ اللہ پر جھوٹ باندھنے والے دل کے اندھے ہیں دل کے بہرے ہیں اور اطاعت شعار دل کے بینا ہیں اور دل سے سننے والے بھی ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ کیا یہ دونوں ایک جیسے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴿۲۴﴾ پھر تم اس سے کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ اس پر سوچتے کیوں نہیں۔ یہ جو ساری بات ارشاد فرمائی گئی ہے اس پر غور کیوں نہیں کرتے۔

سوچو! ابھی وقت ہے۔ یہ وقت گزر گیا تو پھر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ دارِ عمل ختم ہو گیا تو دارِ جزا شروع ہو جائے گا۔ یعنی مہلتِ عمل ختم ہو جائے گی۔ اس نکتے پر غور کیوں نہیں کرتے؟ دن بھر دنیوی امور پر سوچتے رہتے ہو دائمی زندگی کے لیے کیوں نہیں سوچتے کہ جو نافرمانی کر رہا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور جو اطاعت کر رہا ہے اسے کیا کیا درجات ملیں گے۔ اس پر غور کرو اور بھلائی کا راستہ اختیار کرو۔

سورۃ ھود رکوع 3 آیات 25 تا 35

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖۤ ۡ اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّکُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِہٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْکُمْ ؕ اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَاَنْتُمْ لَھَا كٰرِھُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَیٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَلٰکِنِّیْۤ اَرٰىکُمْ قَوْمًا تَجْھَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُکُمْ لَنْ یُّؤْتِیَھُمُ اللّٰہُ خَیْرًا ؕ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِھِمْ ۚۖ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِہِ اللّٰہُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا یَنْفَعُکُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَکُمْ اِنْ کَانَ اللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ ؕ ھُوَ رَبُّکُمْ ۟ وَاِلَیْہِ

تُرْجَعُوْنَ۝۳۴ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَىَّ اِجْرَامِىْ وَاَنَا بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ۝۳۵ وَاُوْحِىَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝۳۶

اور یقیناً ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (تو انہوں نے فرمایا) بے شک میں تمہارے لیے (انجام بد سے) صاف صاف ڈرانے والا ہوں ﴿۲۵﴾ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو بے شک مجھے تمہاری نسبت درد دینے والے دن کے عذاب کا خوف ہے ﴿۲۶﴾ تو ان کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا کہ ہم تم کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی سمجھتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی بھی ان ہی لوگوں نے کی جو ہم میں ادنیٰ درجے کے ہیں (اور وہ بھی) ظاہر رائے سے (یعنی غور و خوض سے نہیں کی) اور ہم تمہاری اپنے اوپر کسی طرح کی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ ہم تم کو جھوٹا خیال کرتے ہیں ﴿۲۷﴾ انہوں نے فرمایا اے میری قوم! بھلا دیکھو تو اگر میں اپنے پروردگار (اللہ) کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے رحمت (نبوت) بخشی ہو پھر (اس کی حقیقت) تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہو تو کیا ہم اس کے لیے تمہیں مجبور کر سکتے ہیں اور تم اس سے ناخوش ہو رہے ہو ﴿۲۸﴾ اور اے میری قوم! اس کے بدلے میں نے تم سے مال و زر نہیں مانگا میرا صلہ تو اللہ کے ذمہ ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں میں انہیں نکالنے والا نہیں۔ بے شک وہ تو اپنے پروردگار سے (خوش و خرم) ملنے والے ہیں اور لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت کر رہے ہو ﴿۲۹﴾ اور اے میری قوم! اگر میں ان کو نکال دوں تو اللہ کے مقابلے میں کون میری مدد کر سکتا ہے پس تم غور کیوں نہیں کرتے ہو؟ ﴿۳۰﴾ اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ یقیناً میں فرشتہ ہوں اور نہ ان لوگوں کے بارے جو تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں کہتا ہوں کہ

اللہ ان کو ہرگز بھلائی نہ دے گا۔ اللہ خوب جانتے ہیں جو ان کے دلوں میں ہے (اگر میں ایسا کہوں) تو یقیناً میں بے انصافوں میں سے ہوں ﴿۳۱﴾ کہنے لگے اے نوح (علیہ السلام!) یقیناً تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت زیادہ جھگڑا کیا اگر تم سچے ہو تو جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو وہ لے آؤ ﴿۳۲﴾ فرمایا اگر اللہ چاہیں گے تو یقیناً اس کو تمہارے سامنے لے آئیں گے اور تم (اس کو) عاجز نہیں کر سکتے ﴿۳۳﴾ اور میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گی اگر میں چاہوں بھی کہ تمہیں نصیحت کروں اگر اللہ تمہیں گمراہ کرنا چاہے تو وہ تمہارا پروردگار ہے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۳۴﴾ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ (حضرت محمد ﷺ) نے یہ (قرآن اپنے پاس سے) بنا لیا ہے۔ فرمایئے اگر میں نے اسے بنا لیا ہے تو میرے جرم کا وبال مجھ پر (ہوگا) اور جو گناہ تم کرتے ہو میں اس سے بری الذمہ ہوں ﴿۳۵﴾

تفسیر و معارف

قرآنِ حکیم کا مقصد تاریخ بیان کرنا نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم میں تاریخی واقعات کو بطورِ مثال پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس قصے کا متعلقہ حصہ بیان کر دیا جاتا ہے یا انبیاءؑ کی حیاتِ مبارکہ کا متعلقہ واقعہ ارشاد فرما دیا جاتا ہے۔ یہاں نوحؑ کی مثال بیان ہو رہی ہے۔ فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ کہ ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا۔ آپؑ نے فرمایا: اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾ آپؑ نے اپنی ذمہ داری کا اعلان فرمایا کہ میں تمہارے برے کاموں کے ان نتائج سے آج باخبر کرنے آیا ہوں جو تمہیں مرنے کے بعد یا یومِ حشر کو پیش آئیں گے اور میں ان نتائج کو واضح کر کے بیان کر دوں گا تاکہ کوئی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔

کسی بھی انسان کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اسے آنے والے خطرے سے بروقت آگاہ کر دیا جائے۔ تمام انبیاءؑ کا یہی فریضۂ نبوت ہے۔ انسان دنیا میں محو ہو کر آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ دنیا کا حسن، مادی چیزوں کی

لذتیں محسوس ہوتی ہیں کہ وہ سامنے ہوتی ہیں جبکہ آخرت کو دیکھنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔

اخروی حقائق دیکھنے کا ذریعہ:

آخرت کو دیکھنے کا واحد ذریعہ ایمان ہے۔ ایمان نہ ہو تو آخرت نہ دکھائی دیتی ہے، نہ سجھائی دیتی ہے۔ اس کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ حالانکہ آخرت اور دنیا ساتھ ساتھ چلتے ہیں؟ سید عبدالعزیز دباغ کی الابریز میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ اس علاقے کا گورنر بڑا ظالم، بدکار اور سخت گیر تھا۔ بادشاہ نے اسے معطل کر دیا۔ واقعہ نقل کرنے والے لکھتے ہیں کہ میں اپنے شیخ کی خدمت میں گیا اور عرض کی کہ اللہ کریم نے اہل شہر پر رحم فرمایا ہے اور اس سخت گیر گورنر کو بادشاہ نے ہٹا دیا ہے لیکن شیخ نے فرمایا ایسا نہیں ہے کیونکہ جہنم میں اس کے لیے جو عذاب تیار ہو رہے ہیں ان میں مزید اضافہ ہو رہا ہے اگر وہ معطل کر دیا گیا ہوتا تو اُس کا ظلم رک جاتا اور ساتھ ہی ظلم پر مرتب ہونے والا عذاب بھی رک جاتا لیکن اس کے اخروی عذابوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی اثناء میں خبر آگئی کہ اسے بحال کر دیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جو دنیوی زندگی بسر کرتے ہیں اس کے ساتھ آخرت کی تعمیر ہو رہی ہوتی ہے۔ معراج شریف کے واقعات میں ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اپنی امت کو فرمایئے گا کہ جنت تو ایک چٹیل میدان ہے۔ اس میں اپنے لیے جگہ بنانا، رہائش کے سامان مہیا کرنا، اس کی زیب و زینت کا سامان مہیا کرنا تمہارا کام ہے تم دنیا سے یہاں بھیجتے رہو گے تو یہاں آکر وہ سب پالو گے۔ اسی طرح جہنم بھی ایک خالی جگہ ہے اس کا ایندھن بھی دنیا سے لے کر آؤ گے یا بھیجتے رہو گے۔ اب یہ انسانوں کے اپنے فیصلے ہیں کہ کوئی جہنم میں اپنے لیے ایندھن جمع کر رہا ہے اور کوئی جنت میں اپنا گھر بنا رہا ہے۔ ہماری زندگی کا ہر سانس، ہر لمحہ ہماری نقدی ہے جسے ہم خرچ کر رہے ہیں۔ ہمارا ارادہ، ہماری سوچ، ہمارا عمل، ہمارا ایمان، ہمارا عقیدہ ہر لمحے ہماری تعمیرِ آخرت کر رہا ہے۔ اور آخرت کو دیکھنے کے لیے نورِ ایمان چاہیے۔ ظاہری دنیا کو دیکھنے کے لیے اللہ نے ظاہری آنکھوں میں نور بھر دیا ہے اور آخرت کو دیکھنے کے لیے قلب کی آنکھ چاہیے۔ قلب کی آنکھ کو نورِ ایمان سے ملتا ہے۔

فریضۂ نبوت یہ ہے کہ کفر و برائی کے اخروی انجام کو دارِ دنیا میں بیان کر کے لوگوں کو دعوت دیں کہ نورِ ایمان کی طرف آؤ اور ان حقائق کو دل کی نظر سے دیکھو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں جلوہ افروز تھے۔ ایک صحابیؓ مسجد میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا: ''یا حارِثُ کیف أَصبَحْتَ؟ قال: اَصبَحتُ مُؤْمِناً حقاً. فَقَالَ انْظُرْ ما تقولُ، إِنَّ لِكُلِّ حَقٍّ حَقِيقَةً قال: اَلَستُ قَدْ عَزَفْتُ الدُّنيا عنْ نَفسِيْ، وَ أَظْمَأْتُ نَهَارِي، وَأَ سهرتُ لَيلِي، وَ كَأَنَّ أَنْظُرُ إِلى عَرْشِ رَبِّيْ

بَارزاً، و كَأَنِّي اَنْظُرُ إلى اَهْلِ الجَنَّةِ يَتَزَاوَرُوْنَ فيها، وَ كَأَنِّي اَنْظُرُ أَلَى اَهْلِ النَّار يَتَضَاغَوْنَ فِيْها يَعْنى يَصِيئوْنَ قال: يا حَارِثُ، عَرَفْتَ فَالْزَمْ ثَلاثَ مَرَّاتٍ"(مسند عبد بن حمید) باب (الحارث بن مالک الانصاری)

آج کیسے صبح کی یعنی تم نے کس حال میں صبح کی؟ انہوں نے عرض کیا، ایمان کے ساتھ۔ آپ ﷺ نے پوچھا، تمہارے پاس ایمان کی کیا دلیل ہے؟ یعنی تمہیں کیسے یقین ہے کہ تم نے ایمان سے صبح کی؟ عرض کیا میں یہاں کھڑا محشر کو دیکھ رہا ہوں، حساب کتاب ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ اہل جنت کو جنت جاتا دیکھ رہا ہوں اور اہل دوزخ کو جہنم جاتا دیکھ رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے سچ کہا اور تم نورِ ایمان سے دیکھ رہے ہو۔

نبی علیہم السلام اسی نعمت کے بانٹنے کے لیے تشریف لاتے ہیں اور ساری امت کے نبیؐ ہوتے ہیں۔ نبیؐ امیروں کا یا غریبوں کا، مسافروں کا یا مقیم لوگوں کا نبی نہیں ہوتا نبیؐ کا تعلق انسانیت سے ہوتا ہے۔ جو بھی جتنے خلوص سے نبیؐ کا دامن تھام لیتا ہے اسے اتنا ہی نورِ قلب نصیب ہو جاتا ہے۔

فرمایا، ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا اور انہوں نے قوم کو اعلانیہ فرمایا: اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾ میں تمہارے لیے ان خطرات کو واضح کر کے بیان کرنے والا ہوں جن سے تم باخبر نہیں ہو۔ تم محض دنیا کی لذت کے لیے دنیوی اقتدار، دنیوی دولت کے حصول کے لیے اندھا دھند حلال وحرام، جائز و ناجائز کیے جا رہے ہو۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی لیکن اگر تم میری بات مان لو تو تمہیں سمجھ آ جائے گی۔ اور میری بات یہ ہے کہ ان لا تعبدوا الا اللہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اطاعت الٰہی عبادت ہے:

اصلِ عبادت، کمالِ عبادت تو یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس لیے کی جائے کہ وہ عبادت کا مستحق ہے۔ اس نے ہمیں انسان بنایا۔ ساری مخلوق میں شرف بخشا۔ یہ شرف کیا ہے؟ یہ معرفتِ باری کی استعداد ہے۔ باقی ساری مخلوق اس کے حکم کی پابند ہے خالق کی ذات کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکی۔ صرف انسان ہے جسے معرفتِ الٰہی کا شعور بخشا، جسے اللہ نے اس استعداد سے نوازا، اب وہ اپنے اس آئینے کو توڑ دے یا اسے کیچڑ، مٹی میں لتھیڑ دے۔ یعنی اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے در پر دھکے کھاتا پھرے تو یہ کتنا ظلم ہے۔

صرف سجدہ کرنا عبادت نہیں۔ سجدہ کرنا بھی عبادت ہے۔ روزہ رکھنا، حج کرنا بھی عبادت ہے لیکن عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ اطاعت کی جائے۔ اطاعت الٰہی عبادت ہے۔

انسان مدنی الطبع ہے۔مل جل کر رہنے والی مخلوق ہے لوگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں تب نظام زندگی چلتا ہے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے، معاملات کرنے، لین دین کرنے، صلح و جنگ کرنے کے اصول اور طریقے اللہ کریم نے مقرر کر دیئے ہیں۔ ان کے اندر رہ کر سارے کام کیے جائیں تو یہ اطاعتِ الٰہی ہے۔ جہاں ہم دوسروں کو خوش کرنے کے لیے اللہ کی اطاعت چھوڑ کر دوسروں کی اطاعت کریں گے تو یہ دوسروں کی عبادت کرنا ہوگی۔ اور اگر ہم اللہ کی اطاعت چھوڑ کر اپنے نفس کی بات مان لیتے ہیں تو ارشادِ باری ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (الجاثیہ:23) کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے اپنی خواہشاتِ نفس کو معبود بنالیا ہے!

اب کوئی خواہشات کا بُت بنا کر اس کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا لیکن اللہ کا حکم چھوڑ کر خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ اسے ہی خواہشات کی عبادت کہتے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور سے نفع کی اُمید یا نقصان کے ڈر سے اس کی اطاعت کرنا، درحقیقت اس کی عبادت کرنا ہے۔

نوحؑ نے فرمایا۔ تم اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے نفع کی امید رکھتے ہو۔ دوسروں سے نقصان پہنچنے کے ڈر سے ان کی اطاعت کرتے ہو اور اللہ کی بات نہیں مانتے۔ اور جب تم اللہ کو چھوڑ کر مخلوق کی باتیں مانتے ہو تو پھر تم مخلوق کی عبادت کرتے ہو۔ اسی لیے تمہیں، توحید باری، عظمتِ باری اور آخرت کی سمجھ نہیں آتی۔ میرا تو فریضہ ہے کہ برائی کے انجام بد سے تمہیں واضح طور پر آگاہ کر دوں اور نیکی کے راستے کی رہنمائی کروں۔ یاد رکھو! نیکی کی بنیاد اس پر ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾ مجھے ڈر ہے کہ اس دردناک دن تم پر اللہ کا عذاب نہ آپڑے۔ وہ دن بہت دکھ دینے والا ہے جس دن ساری مخلوق کو اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس دن تم پر عذاب مسلط نہ ہو جائے۔ اس لیے اللہ کے سوا دوسروں سے امیدیں چھوڑ دو۔ اپنی ساری امیدیں ذاتِ باری سے وابستہ کرو پھر تم صرف اللہ کی اطاعت کرو گے اور اگر تمہاری امیدیں دوسروں سے وابستہ ہوں گی تو تم پھر تم اطاعت بھی انہی کی کرو گے۔

نور و بشر:

ان کی قوم سے کفار کے بڑے بڑے سردار، دولت مند، بااثر لوگ کہنے لگے فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ہم تو آپ کو اپنے جیسا بشر ہی پاتے ہیں۔ آپ بھی ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں۔ آپ کے بھی ہماری طرح بیوی بچے، گھر بار ہیں۔ تو جیسے ہم ہیں ویسے آپ ہیں پھر آپ کو کیسے نبیؑ مانیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اللہ نے نبیؑ بھیجنا تھا تو غیر بشر کو بھیجتے ہیں حق یہ ہے کہ بشریت کی فضیلت

یہی ہے کہ اس کے سر پر معرفتِ الٰہی کا تاج رکھا گیا ہے۔ معرفتِ الٰہی کے سب سے بڑے امین انبیاءؑ ہیں۔ نبیؑ نور بھی ہیں اور بشر بھی۔ انبیاءؑ اس اعتبار سے نور ہیں کہ دلوں کا نور ہوتے ہیں، ایمان کے نور کا خزانہ ہوتے ہیں، نورِ ایمان کی روشنی ان کی ذات سے نصیب ہوتی ہے لیکن آدمؑ کی اولاد سے ہوتے ہیں۔ نبیؑ کی بشریت کا انکار عظمتِ نبوت کا انکار ہے۔ نبی بشر ہوتا ہے، انسان ہوتا ہے لیکن خیر البشر ہوتا ہے۔ نبیؑ جیسا کوئی دوسرا بشر نہیں۔ انسانیت میں سب سے بلند اور آخری مقام و درجہ نبیؑ کا ہے۔

عوام الناس میں یہ بحث چلتی رہتی ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں نبیؑ نور ہیں بشر نہیں یہ غلطی تب لگتی ہے جب ہم نبیؑ کی بشریت کو خود پر قیاس کرتے ہیں۔ جب ہم اپنا کردار دیکھتے ہیں، اپنے حالات کو دیکھتے ہیں، اپنے برے اعمال کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ بشریت ہے تو پھر نبیؑ بشر نہیں ہو سکتے۔

اصل بشر تو نبیؑ ہوتے ہیں۔ ہمارے بشر ہونے کی ایک ہی سند ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہوں۔ عقیدے اور عمل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں۔ جب تک ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں ہیں، ہم بشر ہیں۔ جہاں سے ہم غلامی چھوڑ دیتے ہیں وہاں سے بشریت کے مقام سے نیچے گر جاتے ہیں۔ اسی لیے جو اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت نہیں کرتے ان کے بارے اللہ کریم کا ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط (الاعراف:179) یہ تو چوپایوں، جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔

لہٰذا نبیؑ بشر کامل ہوتے ہیں اور بشریت کے لیے باعث فخر ہوتے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات اس لیے ہے کہ نورِ نبوت انسانوں میں ہے۔ انسان کیوں ہمیشہ رہے گا؟ کہ معرفتِ الٰہی کی استعداد صرف انسان کو دی گئی ہے۔ انبیاءؑ نورِ نبوت کا خزانہ ہیں اس لیے نور ہیں اور آدمؑ کی نسل سے ہیں اور بشر ہیں لیکن بشر کامل ہیں۔ امتی کا نبیؑ کی بشریت سے کوئی مقابلہ نہیں۔

کفار کا معیار:

منکرین نے نوحؑ پر پہلا اعتراض تو یہ کیا کہ آپ ہمارے جیسے بشر ہیں تو نبیؑ کیسے ہو سکتے ہیں اور دوسرا اعتراض یہ تھا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا کہ آپ کی پیروی کرنے والے معاشرے کے وہ لوگ ہیں جو ہم میں ادنیٰ درجے کے ہیں۔ اَرَاذِلُنَا جو سب سے رذیل لوگ ہیں بَادِيَ الرَّاْيِ ج اور ان کی رائے بھی کمزور ہے۔ ان کے نزدیک رذالت سے مراد غریبی اور مفلسی تھی اور شرافت کا معیار محض دولت مند ہونا تھا خواہ دولت ڈاکے چوری، لوٹ مار سے کمائی ہوئی ہو۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی۔ آپؑ کی

محنت کا ثمر اسی کے قریب مرد و خواتین تھے اور وہ بھی غرباء میں سے تھے لیکن وہ نیک، شریف صالح، سچے اور اعلیٰ درجے کے ایمان والے باکردار لوگ تھے۔ اصحابِ رائے تھے۔ نیکی پر کاربند اور نیکی کو اپنائے رکھنے کے فیصلے کرنے والے تھے۔

اسلام کا معیار:

اسلام کا معیارِ شرافت کیا ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات:13) تم میں سے جو جتنا زیادہ پرہیزگار ہے اتنا وہ اللہ کے نزدیک معزز و محترم ہے۔ اسلام میں عزت اور بڑائی کا معیار انسان کا کردار ہے کہ وہ سچ بولے، حلال کھائے، دنیا کی دولت کم ہے تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے پاس ایمان کی دولت ہو، عملِ صالح کا خزانہ ہو۔

عہد حاضرہ:

بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے ہر چیز الٹ دی ہے۔ آج نوحؑ کی قوم کے کافروں کا معیار ہی رائج ہو چکا ہے۔ آج جس کے پاس دولت ہے وہی معزز ہے۔ غریب کی کوئی عزت نہیں۔ سودخور، لوٹ کر کھا جانے والے، بدکار، شرابی بااثر ہیں اور معاشرے میں انہیں بڑا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ آج کافروں سے اس قدر مرعوب ہیں کہ شلوار قمیض پہن کر کسی دفتر میں چلے جائیں تو کوئی بیٹھنے نہیں دیتا اور مغربی لباس میں ملبوس ہو کر جائیں تو دفتری عملہ اپنی Seat سے اٹھ کر مصافحہ کرتا ہے اور بیٹھنے کو جگہ دیتا ہے۔

نوحؑ کی قوم کے منکرین نے ایمان دار لیکن مفلس لوگوں کے لیے رذیل کا الفاظ استعال کیا۔ ان کے نزدیک غربت ایسا جرم تھا کہ مفلس کی نہ کوئی عزت تھی نہ اس کا کوئی حق۔ اور اس کی رائے کو بھی گھٹیا سمجھتے تھے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کہنے لگے مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ﴿۲۷﴾ ہمیں تو تم لوگوں میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جس میں تم ہم سے بڑھے ہوئے ہو۔ تم لوگوں میں کوئی فضیلت ایسی نہیں جو ہم میں نہ ہو۔ دولت، جائیداد، حکومت، اقتدار و اختیار تو ہمارے پاس ہے۔ چند غرباء آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبیؐ ہیں اور یہ غرباء آپ کے صحابی ہیں۔ تو یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آتا۔

گویا ان کے نزدیک اس بات کی کوئی حیثیت نہیں تھی کہ اللہ نے اپنے بندے کو لوگوں کی ہدایت کے لیے نبیؐ مبعوث فرمایا۔ جو ایمان لائے ان کی فضیلت انہیں نظر نہیں آئی۔ اللہ پر ایمان لانا، اللہ کا قرب حاصل کرنا، اللہ کی منشا جاننا، کس کام سے وہ راضی ہے، کس کام پر خفا ہوتا ہے، احکامِ الٰہی پر عمل کرنا، اس سب کی ان کے نزدیک کوئی

حیثیت نہیں تھی۔ ان لوگوں کو نہ ایمانیات سے غرض تھی نہ کردار سے ان کا ایک ہی معیار تھا کہ جس کے پاس دولت ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ حالانکہ دنیا کا ایک اٹل اصول ہے کہ جو جتنا امیر ہوتا ہے اتنا ہی وہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اپنے تمام کاموں کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے امارت قائم رکھنے کے لیے مددگار چاہیں۔ اپنے امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھنے کے لیے ملازم مددگار چاہیں۔ غریب اپنا ہر کام خود کر لیتا ہے اور دنیا میں سب سے اچھا وہ ہے جو کسی کا محتاج نہیں۔

رسالت ایک نعمت:

اللہ کریم کی معرفت کی استعداد ہر فرد بشر کو دی گئی ہے۔ بندے کی اس طلب کو پورا کرنے کے لیے اللہ کریم نے ہر زمانے میں انبیاءؑ بھیجے۔ جب نورِ نبوت نے انسان کے دل کو روشن کیا تو بندہ کہہ اٹھا، میرے پروردگار آپ کس بات پر راضی ہیں، کس بات پر آپ ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں کس سے پوچھوں، مجھے کون بتائے، کیونکہ مجھ میں تو ذاتی طور پر یہ جاننے کی استعداد نہیں۔

یہ کام ہے اللہ کے نبیؑ کا جن کی ذات کا ایک رخ ذاتِ باری کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ دوسرا رخ مخلوق کے ساتھ۔ نبیؑ اللہ سے علم حاصل کرتا ہے اور مخلوق تک پہنچاتا ہے۔ اللہ سے دور لوگوں کو اللہ سے ملا دیتا ہے۔ اتنی بڑی ہستی جو اللہ سے بندے کو ہمکلام کر دے وہ نبیؑ کے علاوہ کوئی نہیں۔

اور اس ہستی، نوحؑ کو منکرین کہتے ہیں کہ ہمیں تو آپ میں کوئی فضیلت نظر نہیں آتی۔

یہی اعتراض کافروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا کہ آپ کے پاس کوئی بہترین باغ ہوتا آپ اس میں سے کھاتے پیتے، سونے اور دولت کے خزانے ہوتے آپ اپنے ماننے والوں پر لٹاتے جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اللہ کریم نے جواب دلوایا کہ میں ایک عظیم الشان کام کے لیے مبعوث ہوں کہ اللہ سے بچھڑی مخلوق کو اللہ سے واصل کر دوں۔

حضرت نوحؑ نے ان منکرین سے فرمایا:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح، خوب صورت اور روشن احکام لے کر آیا ہوں۔ جو میں کہہ رہا ہوں کیا ان میں کوئی خرابی ہے۔ اگر عقیدے سے عمل تک ساری باتیں اچھی ہیں تو یہ یقیناً میرے اللہ نے مجھے تعلیم فرمائی ہیں۔ یہ میرے پروردگار کی طرف سے ہیں۔ وہ میرا پروردگار ہے۔ انسانوں کی ضرورت ہے کہ ان کی رہنمائی کی جائے۔ اس نے تمہاری رہنمائی کا فریضہ مجھے سونپا ہے۔

میری ذمہ داری لگائی ہے کہ میں تم تک اس کا پیغام پہنچاؤں۔ اٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ جتنے کام میں تمہیں بتا رہا ہوں ان سب سے اللہ کی رحمت نصیب ہوتی ہے کہ نبوت اللہ کی رحمت ہے۔ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْؕ لیکن مصیبت یہ ہے کہ تم وہ بینائی کھو چکے ہو جس سے نبوت کی رحمت دیکھ سکو۔ تمہاری نظر میں سونے کی چمک تو آتی ہے۔ چاندی اور دولت کی چمک تو دیکھتے ہو۔ دنیوی چیزوں کے ڈھیر تمہیں نظر آتے ہیں۔ آخرت کی نعمتیں تمہاری نظر سے اوجھل ہیں۔ تمہارے دل اندھے ہو گئے ہیں آخرت کی طرف سے تم اندھے ہو چکے ہو۔ لیکن یہ تو تم دیکھ سکتے ہو کہ دنیا کے اعتبار سے تعلیماتِ نبوی کس اعلیٰ معیار کی ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے، شرمندگی اور بے عزتی ہوتی ہے یا خوشی اور اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ یہ تو تم دیکھ سکتے ہو۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ۝۲۸ جب تم نبوت کی برکتوں کو پسند ہی نہیں کر رہے ہو۔ اس سے کراہت کر رہے ہو تو ہم تم کو زبردستی مجبور نہیں کر سکتے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہیں پکڑ کر جنت لے جائیں۔ اللہ نے راستہ منتخب کرنے کا اختیار تمہیں دیا ہے۔ میں اللہ کا نبیؑ ہوں اور تمہیں نیکی اور برائی کے راستوں کے نتائج بتانے کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ یہ میری ذمہ داری نہیں ہے کہ میں تمہیں پکڑ کر زبردستی کسی راستے پر چلا دوں۔

مسلمانوں کے لیے ان آیات میں درسِ عبرت ہے کہ دولتِ دنیا کے حصول کے لیے رات رات بھر جاگ کر ڈیوٹی دے لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ اتنی رقم مزید ملے گی لیکن عبادات کے لیے کہتے ہیں دعا کریں میں اللہ کو یاد کروں۔ روزمرہ کے کام کرنے کے لیے تو کوئی دعا کے لیے نہیں کہتا۔ سب کام اپنی ذمہ داری سے کرتے ہیں۔ اللہ کا نام لینے کے لیے دعا کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہمیت کا فرق ہے اگر اللہ کی یاد کی اہمیت ہوگی تو یہ اولین ترجیح پر ہوگا اور اگر دنیوی کام اہم ہوں گے تو اللہ اللہ اولین ترجیح نہیں ہوگا۔ اور اگر اس کی اہمیت دنیوی کاموں جتنی بھی نہیں ہے تو پھر کسی بندے کی کیا حیثیت ہے کہ پکڑ کر کسی کو جنت لے جائے۔

یہ کائنات اللہ کی ہے۔ اس کی اپنی مرضی ہے جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی نبیؑ کسی ولی، کسی مقرب بندے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اللہ سے اس کے حکم کے خلاف کام بھی کرا لیتا ہے یہ غلط ہے۔ جہالت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنا جس کو قرب نصیب ہوتا ہے اتنا وہ احکامِ الٰہی کا زیادہ پاس کرتا ہے، حکم بجالانے کا زیادہ اہتمام کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے جو اللہ کی رضا ہو۔ کسی نیک بندے کے بارے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ اللہ سے اپنی پسند منوا سکتا ہے۔ سراسر غلط ہے۔ اللہ کے مقربین اللہ کی پسند پر جینا پسند کرتے ہیں۔ اللہ کی مرضی پر راضی رہنا پسند کرتے ہیں۔

سو فرمایا، تم اندھے ہو چکے ہو، راہ گم کردہ ہو چکے ہو۔ میں تمہیں پکڑ کر ہدایت کی طرف نہیں لا سکتا جبکہ تم خود

اس سے نفرت کر رہے۔ ہدایت قبول کرنا تو دور کی بات ہے تم اسے پسند بھی نہیں کر رہے تو میں تمہیں پکڑ کر کیسے لے آؤں۔ فرمایا، قَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اے میری قوم! میں نے تم سے کوئی دولت طلب نہیں کی۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ میرا معاوضہ میرے اللہ کے ذمے ہے۔

نوحؑ کا ذکر خیر چل رہا ہے کہ کس طرح خلوص و محبت سے سینکڑوں برس آپؑ نے تبلیغ فرمائی اور قوم کے سرکردہ افراد نے طرح طرح کے اعتراض ہی کیے لیکن پیغمبرؑ نے انہیں سمجھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بطورِ دلیل ارشاد فرمایا کہ میں جو تمہیں سینکڑوں برس سے تبلیغ کر رہا ہوں تو کیا میں نے تم سے کوئی دولت چاہی ہے؟ میں نے اس ساری محنت، سارے مجاہدے کے بدلے کوئی مال طلب نہیں کیا تو اس بات پر غور کرو کہ اگر میں تم سے دنیا کی کوئی نعمت نہیں مانگ رہا تو یقیناً میرا مجاہدہ آخرت کے لیے ہے۔ اور میں جو محنت کر رہا ہوں، اس راستے پر جو تکلیفیں اٹھا رہا ہوں، تمہارے ایذا دینے کے باوجود تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں تو اس سارے کا معاوضہ میرے اللہ پر ہے۔ اس سب کا اجر مجھے اللہ کریم دے گا۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میرا مقصد تو اللہ کی رضا ہے اور میرا معاملہ میرے اللہ کے ساتھ ہے۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔

قرآن حکیم میں جتنے انبیاءؑ کا تذکرہ آیا ہے۔ سب میں دو امور مشترک رہے ہیں۔ اول یہ کہ تمام انبیاءؑ نے اللہ کی توحید کی دعوت دی۔ سب کا کلمہ توحید مشترک تھا لا الہ الا اللہ اور دوم یہ کہ کسی نبیؑ نے بندوں سے کوئی دنیوی معاوضہ طلب نہیں فرمایا۔ نہ کوئی چندہ مانگا نہ کسی طرح کی خدمت اور نہ اپنے لیے کسی قسم کی کوئی بڑائی چاہی۔ یہی فرماتے رہے کہ ہم اللہ کریم کے لیے کام کر رہے ہیں اور ہمارا اجر اللہ کریم ہی ہمیں عطا فرمائیں گے۔ جس کا کام ہے وہی مزدوری دے گا۔

علماء و صوفیا کے لیے درس:

علماء و صوفیاء کے سمجھنے کے لیے یہ بہت ضروری بات ہے کہ جب ہم دین کا کام کرتے ہیں تو اس کے معاوضے میں دنیا طلب نہیں کرنا چاہیے۔ جو علماء مدارس یا مساجد میں تنخواہ پر کام کرتے ہیں وہ ان کے دینی کام کا بدلہ نہیں ہوتی۔ انہیں دینی خدمت کا اجر اللہ کریم دے گا۔ تنخواہ تو انہیں بطورِ معاوضہ اس وقت کی دی جاتی ہے جس کا انہیں پابند کیا جاتا ہے۔ ان حضرات کو چونکہ وقت کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں اور جا نہیں سکتے۔ نہ کاروبار کر سکتے، ملازمت نہیں کر سکتے تو جو وقت ان سے لیا جاتا ہے اس کا معاوضہ انہیں دیا جاتا ہے لہٰذا ایسے لوگوں کو اسی معاوضے پر قناعت کرنا چاہیے اور یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ کوئی انہیں تحائف لا کر دے یا ان کی خدمت کرے۔

ایسا کرنا دین کے خلاف ہے۔

دین کے نام پر علماء کو، خصوصاً صوفیاء کو بہت اہمیت ملتی ہے۔ لوگ احترام کرتے ہیں، مقام دیتے ہیں۔ یہاں صوفیاء کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ اگر کوئی کسی کو اللہ اللہ سکھاتا ہے تو اللہ کے لیے سکھائے بندوں سے معاوضہ نہ چاہے نہ ان پر احسان دھرے۔ جو لوگ اپنے دینی مقام کو استعمال کرتے ہوئے عوام سے ووٹ مانگتے ہیں، یہ درست نہیں۔ دینی خدمت کا بدلہ اللہ سے لیں اور ووٹ لینے کے لیے عام شخص کی طرح مانگیں اس میں دینی خدمت کا حوالہ نہ دیں۔

لوگ مشائخ کی خدمت کرتے ہیں لیکن شیخ کا کام ہے کہ اس کے پاس کوئی فقیر آجائے تو اس کی بھی وہی تربیت کرے اور جو بڑے سے بڑا تحفہ لے آئے اس کی بھی ویسی ہی کرے۔ امیر غریب میں تفریق نہ کرے۔ شیخ کو چاہیے کہ اپنا کام کرے اور اللہ کی رضا کے لیے کرے۔ فرمایا، وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اور تم سمجھتے ہو کہ جو غریب لوگ ایمان لے آئے ہیں تو ان کی رائے صائب نہیں ہیں۔ چونکہ یہ مفلس ہیں، معاشرے میں ان کی عزت نہیں ہے اور تمہارے لیے یہ عار ہے کہ تم ایمان لا کر ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان کو اپنے سے دور کر دوں تو پھر تم ایمان لاؤ گے۔ فرمایا، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نہ صرف امیروں کا نبیؐ ہوں نہ صرف غریبوں کا نبیؐ ہوں۔ میں اللہ کی طرف سے، پوری قوم کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ قوم میں اُمراء بھی ہیں اور غرباء بھی۔ میرا کام سب تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔

تم مال واقتدار کے نشے میں اللہ کی عظمت کو بھول گئے ہو اور یہ اہل ایمان گو غریب سہی لیکن اللہ کی عظمت کو مانتے ہیں۔ میں ایمان والوں کو اپنے پاس سے دور کرنے والا نہیں ہوں۔ اللہ کی بارگاہ میں نیت، ارادہ اور خلوص قبول ہوتا ہے اور تم اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہو اور دوسروں کو حقیر جانتے ہو تو تمہاری یہ سوچ بنیادی طور پر غلط ہے۔ تم بھی مخلوق ہو۔ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ اللہ نے کسی کو کم دولت دے دی ہے اور کسی کو زیادہ۔ انہیں بھی اللہ کی بارگاہ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ میں حاضر ہونا ہے اور تمہیں بھی اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اللہ کریم ان کے ایمان وخلوص سے واقف ہے اور تمہارے کفر اور تمہاری سخت دلی کو بھی دیکھ رہا ہے۔ میں نے تو نہ انہیں بدلہ دینا ہے نہ تمہیں۔ میں نے تو سب کو اللہ کی طرف دعوت دینی ہے۔ جو قبول کرے گا، اپنا اجر اللہ سے لے گا۔ جو رڈ کر دے گا وہ بھی اپنے انجام کو پا لے گا۔ سب کو بہر حال اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے وہ جانیں اور پروردگار جانے۔ کس کو کتنا درجہ دیتا ہے۔ کس کو بخشتا ہے یہ بندوں کے اندر کی بات ہے جسے وہ خود جانتا ہے۔ اس کے مطابق ان سے سلوک کرے گا۔ لٰکِنِّیْٓ

اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ محض جہالت کر رہے ہو۔ تم دولت کے گھمنڈ میں، اقتدار و اختیار کی وجہ سے نری جہالت کر رہے ہو۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، یہ کتنی جاہلانہ بات ہے۔ یہ لوگ جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے آئے بیٹھے ہیں۔ یہ میرے پاس اس لیے آئے ہیں کہ مجھ سے اللہ کا دین سیکھیں۔ اللہ کی اطاعت کا طریقہ سیکھیں، وہ راستہ سیکھیں جس سے ہمارا پروردگار ہم سے راضی ہو جائے۔ اگر میں انہیں غریب سمجھ کر چھوڑ دوں تو یہ اللہ کے بندے اللہ کے لیے آئے بیٹھے ہیں۔ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ تو اے میری قوم! اللہ کریم کے مقابلے میں میری مدد کو کون آئے گا۔ میرا کام اللہ کی طرف بلانا ہے بھگانا نہیں۔ اس لیے میرے پاس جو بھی آئے گا میں اسے اللہ کا راستہ دکھاؤں گا۔ اللہ کا نام سکھاؤں گا۔ اللہ کی عبادت کا طریقہ بتاؤں گا۔ یہ بتاؤں گا کہ کن کاموں سے اللہ کریم راضی ہوتے ہیں، کن کاموں سے اللہ کریم خفا ہوتے ہیں۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ کیا تم میں اتنا بھی شعور نہیں۔ اتنی بات بھی تمہیں سمجھ نہیں آتی تم مقامِ نبوت کو سمجھتے ہی نہ ہو۔

مقامِ نبوت:

اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ میں نے تو تمہیں نہیں کہا کہ میں اللہ کے خزانے بانٹتا ہوں میں تو اللہ کا نبیؑ و رسولؑ ہوں۔ نبیؑ اور رسولؑ کے ذمہ اللہ کا فرمان، اللہ کا پیغام، اللہ کے احکام مخلوق تک پہنچانا ہے۔ دنیوی خزانے بانٹنا اللہ کریم کا اپنا کام ہے۔ جس کو چاہے دولتِ دنیا دے، صحت دے یا مرض بھیج دے۔ یہ اس کا اپنا نظام ہے۔ جو اس کائنات میں چل رہا ہے۔ بیماری بدکاروں پر آتی ہے اور نیکوں پر بھی۔ بدکار بھی امیر ہو جاتے ہیں اور نیک بھی۔ اللہ کے نظام میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ اور میں نے کب یہ کہا ہے کہ اللہ کے خزانے میرے پاس ہیں میں بانٹ دوں گا۔ میں نے تو کہا ہے میں اللہ کا نبیؑ ہوں اور اللہ کا پیغام پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ میں غیب جانتا ہوں۔ کسی نبی کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ غیب جانتا ہے۔

علمِ غیب کیا؟

وہ علم جو کسی ذریعہ سے معلوم نہ کیا جا سکے، کسی سبب سے پتہ نہ چلے وہ علمِ غیب ہے۔ اور جو بات بتا دی جائے وہ علم غیب نہیں رہتی۔ اللہ کریم علمِ غیب میں سے جو بذریعہ وحی، فرشتہ بھیج کر یا القاء کر کے بتا دیں تو وہ اطلاع عن الغیب کہلاتی ہے۔ علم غیب نہیں۔ جیسا ارشاد باری ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (ال عمران:179) اللہ کریم ہر ایک کو غیب پر اطلاع نہیں دیتے۔ اپنے نبیوںؑ میں سے جسے چاہتے ہیں اور جس بات کے بارے چاہتے ہیں اس پر اطلاع کر دیتے ہیں۔ لہٰذا نبیؑ کو اطلاع عن الغیب ہوتی ہے۔

یعنی نبیؑ کو غیب پر مطلع فرما دیا جاتا ہے۔ یہ اطلاع عن الغیب ہوتی ہے۔ علم غیب نہیں۔

علمِ غیب صرف اللہ کا خاصہ ہے۔ اس کا علم ذاتی ہے اسے کسی سبب کی ضرورت نہیں۔ نہ کسی کے بتانے کی نہ کہیں سے پڑھنے کی۔ ہر چیز اس کے علم میں حاضر ہے۔ اس کا علم حضوری ہے۔ اس کے ہاں ماضی، حال، مستقبل نہیں ہے۔ ہر چیز ہمہ وقت اس کے علم میں دست بستہ حاضر ہے۔ جو کچھ گزر چکا ان کو بھی وہ ویسے ہی جانتا ہے۔ جو لمحہ گزر رہا ہے وہ اس کے سامنے ہے اور جو آنے والا زمانہ ہے وہ اس کے علم میں موجود ہے۔ علم غیب اللہ جل شانہ کا خاصہ ہے۔ مخلوق کے پاس علم جاننے کے ذرائع ہیں۔ جو علوم اللہ کریم انبیاءؑ کو عطا فرماتے ہیں اور انبیاءؑ کو اللہ کریم کی عطا سے ملتے ہیں۔ جب اللہ کریم بتا دیتے ہیں تو پھر وہ علم غیب نہیں رہتا۔ نبیؑ کی شان اتنی بلند ہے کہ انہیں علومِ غیبیہ بتا دیئے جاتے ہیں۔ انبیاءؑ بحکم الٰہی اللہ کے بندوں کو ان امور غیبیہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ نبیؑ پر اعتبار کرنے سے ایمان بالغیب لانا نصیب ہوتا ہے۔

نوحؑ نے بھی اپنی قوم کو ایمان بالغیب کی دعوت دی۔ قوم کو بتایا کہ اللہ واحد و لاشریک ہے۔ اللہ کے فرشتے ہیں۔ موت ضرور آئے گی۔ موت کے بعد حساب کتاب ہوگا۔ جنت و دوزخ کے راستے جدا ہیں۔ کسی ایک مقام پر ٹھکانہ ہوگا۔ یہ سارا غیب نہیں تھا یہ اطلاع عن الغیب تھی۔

جب انبیاءؑ بھی عالم الغیب نہیں ہیں۔ غیب جاننے والے بھی نہیں ہیں۔ عالم الغیب صرف اللہ جل شانہٗ ہے اور انبیاءؑ کو اللہ مطلع فرماتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے تو پھر ماء و شماء کی کیا حیثیت ہے۔ جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو شخص بھی حلیہ بنا کر تسبیح پکڑ کر بیٹھ جائے تو لوگ کہتے ہیں ان کے پاس تو غیب کی خبریں ہیں۔ یہ نری جہالت ہے۔ جو لوگوں سے اپنے بارے میں سن کر یہ سمجھے کہ وہ غیب جانتا ہے تو وہ خود سب سے بڑا جاہل ہے۔

غیب خاصہء خداوندی ہے۔ مخلوق علم حاصل کرنے میں ذرائع کی محتاج ہے۔ اللہ کریم اہل اللہ کو کشف، القاء یا وجدان عطا فرما دیتے ہیں۔ اگر کشف سے کسی کو کوئی بات سمجھ آ گئی تو وہ علمِ غیب نہیں ہوگا کیونکہ اس کے کشف کا مدار شریعتِ مطہرہ پر ہے۔ اگر کشف نبیؑ کے ارشاد سے مطابقت رکھتا ہو تو درست مانا جاتا ہے۔ اگر شریعتِ سے ٹکرائے تو مردود ہے۔ ہو سکتا ہے دیکھنے والے کو دیکھنے میں غلطی لگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ نبیؑ کے کشف کی ساری امت مکلف ہے اور ولی کو صحیح کشف بھی ہو تو صرف وہ خود اس کے ماننے کا مکلف ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس کے کشف پر عمل کرنے کا مکلف نہیں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ولی اگر اپنے کشف پر خود عمل نہ کرے تو اسے کچھ گناہ نہیں نہ اس کا آخرت میں کچھ نقصان ہوگا۔ البتہ ہو سکتا ہے کچھ دنیوی نقصان ہو جائے آخرت کا بہر حال کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ

صرف نبیؑ کے کشف پر عمل واجب ہے۔ اور یہ کسی دوسرے کا مقام نہیں۔

پھر فرمایا، وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ میں نے تو یہ بھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں فرشتہ ہوں بلکہ تو تمہاری طرح کا انسان ہوں۔ کھاتا پیتا ہوں، گھر بار ہے، بیویاں اور اولادیں ہیں۔ ان کے لیے محنت و مشقت سے رزقِ حلال کماتا ہوں اور اس کے ساتھ میں اللہ کا نبیؑ ہوں۔ اللہ کی مخلوق کو اللہ سے ملاتا ہوں۔

حضرت نوحؑ ساڑھے نو سو سال تبلیغ فرماتے رہے۔ اپنی قوم کے ساتھ محنت کرتے رہے جب بات انتہا کو پہنچی تو یہ سارے دلائل قوم کے سامنے رکھے اور انہیں دعوتِ فکر دی۔ پوری طرح بات واضح فرما دینے کے بعد فرمایا، لَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ؕ اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جو لوگ میرے ساتھ ایمان لے آئے ہیں اور تمہاری نظر میں وہ حقیر ہیں، اللہ انہیں خیر نہیں دے گا۔ جو ایمان لائے ہیں اللہ تو ان پر انعام کرے گا۔ یہ تو اللہ کا اور ان کا معاملہ ہے۔ غریب بھی اس کی مخلوق ہیں اور امیر بھی اس کی مخلوق ہیں۔ جو خلوص سے اس کی ذات پر ایمان لاتا ہے اس کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ نوازتا ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ اللہ جانے اور اس کے بندے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ اللہ بہتر جانتا ہے کہ جو دعویٰ ایمان لیے بیٹھے ہیں ان کے دل میں کتنا خلوص ہے، کتنی طلبِ الٰہی ہے، طلبِ رضائے الٰہی ہے۔ یہ کتنی اطاعت کرتے ہیں اور کس خلوص سے کرتے ہیں۔ دلوں کے حال جاننا میرا کام نہیں ہے میرا کام یہ ہے کہ جو ایمان لاتا ہے اسے دین کی تعلیم دیتا جاؤں، اس کی تربیت کرتا جاؤں۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اسے اللہ بہتر جانتا ہے۔ اِنِّیْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ اگر میں کہوں کہ یہ تو غریب و مفلس ہیں، انہیں اللہ کچھ نہیں دے گا تو یہ زیادتی ہوگی، ظلم ہوگا جو میں نہیں کر سکتا۔ ہاں! میں یہ بتا سکتا ہوں کہ خلوص سے ایمان لاؤ۔ اللہ کے حکم پر عمل کرو اللہ کریم راضی ہوں گے اور انعامات عطا فرمائیں گے۔

یہ سب کچھ سن کر وہ انکار پر قائم رہے۔ ان کی بدبختی جاگی اور کہنے لگے قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا ایک مدت سے آپ نے ہمارے ساتھ جھگڑا کھڑا کر رکھا ہے۔ ذرا ان کا نظریہ دیکھیں کہ تبلیغِ حق کو فساد کہہ رہے ہیں حالانکہ ایک مدت سے یعنی ساڑھے نو سو سال سے تو نوحؑ انہیں تبلیغ کرتے رہے اور یہ کہتے ہیں کہ ساڑھے نو سو سال سے آپ وہی بات دہرائے چلے جا رہے ہیں اب اس جھگڑے کو ختم کریں اور یہ جو عذاب کی نوید آپ ہمیں سناتے رہتے ہیں کہ اللہ کو نہ ماننے پر، اللہ کی اطاعت نہ کرنے پر گرفت آ جائے گی۔ اللہ کے آگے عاجزی نہیں کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے تو ایسا کریں وہ طوفان اور بربادی آپ لے آئیں۔ یہ ان کی بدنصیبی کی انتہا تھی۔

ابوجہل نے بھی بیت اللہ کے پردے پکڑ کر کہا تھا اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا

حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ (سورۃ الانفال:32) کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر یہ سارا حق ہے تو اللہ ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا دردناک عذاب بھیج دے۔ بدر میں جب اس پر اللہ کی گرفت آئی تو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ ان منکرین کی بھی جب بدبختی آئی تو انہوں نے کہا قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا۔

قلبی مشابہت:

آج بھی اگر دین پر طنز کرنے والوں کی باتیں سنیں تو وہ بھی وہی جملے دہراتے ہیں، وہی باتیں کہتے ہیں جو صدیوں پہلے کے منکرین نے کہی تھیں۔ جو جملے منکرین نے نوحؑ کے بارے کہے تھے، جو باتیں کفار و مشرکین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کہی تھیں وہی باتیں آج دین پر طنز کرنے والے کہتے ہیں۔ آج بھی لوگ احکام الٰہی بتانے والوں کے بارے کہتے ہیں ایک تو ان مولویوں نے جھگڑا ڈالا ہوا ہے۔ آج کے لوگوں کو یہ جملے کس نے سکھائے؟ یہ قلبی مشابہت کا نتیجہ ہے۔

اگر قلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑا ہو گا تو قلب کی مشابہت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گی اور زبان سے وہی کلمے نکلیں گے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے۔ اگر کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور کفر کی راہ اپنائے گا تو اس کے منہ سے وہی جملے ادا ہوں گے جن کی مشابہت ان کفار سے ہو گی۔ جو انبیاء سے ضد کرتے اور عناد رکھتے تھے۔ اسی قلبی مشابہت کی وجہ سے ان کی زبان پر وہی جملے آئیں گے جو کفار کہتے تھے۔ جیسے نوحؑ کے زمانے کے کفار نے کہا آپؑ ہم سے جھگڑا کر رہے ہیں، آپؑ فساد کا باعث ہیں تو آج بھی لوگ کہتے ہیں یہ سارا فساد مولویوں کا ڈالا ہوا ہے۔ مولویوں کو تو جہاز بھر کر سمندر میں ڈبو دینا چاہیے معاشرے میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ سود خور ہیں، گانا بجانا کرنے والے، آبرو باختہ بھی ہیں فسادی اور قتل و غارت کرنے والے بھی ہیں۔ اور کسی کو جہاز بھر کر ڈبونے کی بات کوئی نہیں کرتا جب کوئی اللہ کا نام لیتا ہے، آخرت کی بات کرتا ہے، نفاذِ اسلام کی بات کرتا ہے تو کہتے ہیں اس نے نیا فساد ڈال دیا ہے۔

دین کو فساد کہنا زمانہ قدیم سے کفار کا شیوہ ہے۔ نوحؑ کی قوم کے منکرین نے کہا اور نبی آخر الزماں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے بھی مکہ کے کفار و مشرکین نے کہا کہ مکہ میں بے شمار مذاہب تھے۔ ہر ایک اپنی مرضی سے جی رہا تھا، اپنی اپنی عبادت کرتا۔ محمد (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک نیا فساد ڈال دیا۔ سب مذاہب کو کہہ

دیا ہے کہ یہ باطل ہیں، غلط ہیں۔ حق صرف ایک ہے کہ اللہ واحد لاشریک ہے اور اسلام دینِ حق ہے۔

ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ میرے دل کی مشابہت کس کے ساتھ ہے، میرے دل میں کفار والی طعن وطنز کی باتیں آتی ہیں یا انبیاء والی خوب صورت باتیں آتی ہیں؟ فرمایا ان منکرین نے کہا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ جن عذابوں سے آپ ہمیں روز ڈراتے ہیں ہم تو انہیں نہیں مانتے اور اگر آپ سچے ہیں تو ان عذابوں کو لے آئیں۔ نوحؑ نے فرمایا، عذاب لانا یا انعام دینا اللہ کا کام ہے۔ میں اللہ کا نبیؑ ہوں۔ میرا منصب یہ ہے کہ تمہیں بروقت آگاہ کردوں کہ ان کرتوتوں پر اللہ کی گرفت آئے گی، عذاب آئے گا۔ اور یہ بھی بتادوں کہ اللہ کو ماننے پر اس کے احکامات پر عمل کرنے پر انعامات ملیں گے۔ قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُم بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ ان شاء اللہ اگر اللہ نے چاہا تو یقیناً وہ عذاب آئے گا وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ۝ پھر تم اسے روک نہیں سکو گے۔ پھر تم میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ عذاب الٰہی کو روک سکو۔ اور یہ بھی تمہیں بتادوں جب تم نے اللہ سے بات بگاڑ لی ہے اور اتنے دیدہ دلیر ہو گئے ہو کہ عذاب کا مطالبہ کررہے ہو وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ ط تو میری نصیحت بھی کام نہیں کرے گی۔ تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی کیونکہ نصیحت بھی تب فائدہ دیتی ہے جب بندے کا اللہ سے تعلق ہو۔ جب تعلق ہوگا تو اللہ کی بات سنے گا۔ جب تمہارے قلب و باطن کا تعلق ہی اللہ سے منقطع ہو گیا اور تم اللہ کو للکارنے لگے کہ جو کرسکتا ہے کرلے، ہمارا جو بگاڑ سکتا ہے بگاڑ لے تو اس حال میں میری نصیحت بھی تمہیں فائدہ نہیں دے گی۔ میں تو نصیحت کرتا رہوں گا، میں تبلیغ کرتا رہوں گا لیکن تمہیں فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوگی۔

جب گناہ اور برائیاں بڑھتے ہیں تو اللہ سے تعلق کمزور ہونے لگتا ہے اور جب یہ حد آجائے کہ صرف برائیاں ہی رہ جائیں تو اللہ سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور آدمی کہہ اٹھتا ہے، پتہ نہیں اللہ ہے بھی کہ نہیں۔ فرمایا، تمہاری بات اس حد سے آگے بڑھ گئی۔ جب اللہ سے تمہارا تعلق ٹوٹ گیا۔ اللہ نے تم میں قبولیت کی جو استعداد رکھی تھی وہ سلب کرلی اور تم میں صرف بغاوت رہ گئی تو پھر میری نصیحت تمہیں کیا فائدہ دے گی۔

هُوَ رَبُّكُمْ وہ تمہارا پروردگار ہے۔ خالق و مالک اور رازق ہے۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا، عقل و شعور دیا، تمہیں مکلف بنایا۔ تمہیں روزی دے رہا ہے، مال و دولت، عہدے، گھر بار دیا اور سامان زندگانی دیے جارہا ہے۔ اور

تم نے اس ذات پاک سے بگاڑلی ہے اس سے عذاب مانگ رہے ہوتو اب معاملہ تمہارے اور اس کے درمیان ہے۔ وہ جانے اور تم جانو۔

هُوَ رَبُّكُمْ ۚ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٣٤﴾ اور سن لو، مجھے اور تمہیں سب کو اسی کی بارگاہ میں لوٹ کر جانا ہے یہاں تک نوحؑ کی قوم کے اعتراضات کے جوابات تھے۔ اگلی آیت کفار کے اس اعتراض کا جواب ہے جو انہوں نے قرآن کے بارے کیا۔

صداقتِ قرآن:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ (قرآن اپنے پاس سے) بنالیا ہے۔ لفظ افْتَرَاء کا معنی ہے کسی پر جھوٹ باندھنا۔

إِنِ افْتَرَيْتُهُ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا جارہا ہے کہ تم کہتے ہو کہ جو کچھ وحی الٰہی بیان کرتا ہوں یہ میں نے از خود بنالیا ہے اللہ کی ذات وصفات، آخرت، فرشتے، قیامت، فرائض، واجبات یہ سارا میں نے اللہ پر جھوٹ باندھ لیا ہے۔ یہ صحیفہ بھی میں نے گھڑلیا ہے تو یہ دیکھو! اگر میں نے جھوٹ باندھا ہے تو اس کا جرم بھی مجھے بھگتنا ہوگا۔ تبلیغ کے بدلے میں نے تم سے تو کچھ نہیں لیا۔ نہ مال و دولت لیا نہ حکومت و اقتدار مانگا۔ تم خود کہتے ہو میں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے تو تم سے تو کچھ نہیں لیا۔ تم سے تو میں بری ہوں

فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾ اگر یہ غلط ہوگا تو اس کا جرم مجھ پر ہوگا لیکن یہ بھی یاد رکھو جو تم کر رہے ہو اس کا نتیجہ تم بھگتو گے۔ میں اس سے بری ہوں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے۔ اللہ نے اپنے محبوب خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ اللہ کریم ہر پہلو سے اس کی صداقت کے دلائل ارشاد فرماتے ہیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی اصدق الصادقین ہستی پر جو اعتبار نہ کرے اس کے ہر عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بری ہیں۔

ایک لطیف نکتہ:

اس آیہء مبارکہ میں ایک بڑی لطیف سی بات ہے۔ اللہ کریم سمجھ دیں تو بندے کو سمجھ آجاتی ہے کہ جو بات نبیؑ

سے ثابت نہ ہو۔ خلفائے راشدین سے ثابت نہ ہو سلف صالحین سے ثابت نہ ہو۔ بندہ خود بنالے اور کہے کہ یہ باعث ثواب ہے تو اس کے ذمہ دار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوں گے۔ یہ وہ جانے اور اس کا رب جانے۔

اسی روش کا نتیجہ ہے کہ لوگ فرائض کی پروا نہیں کرتے اور انسانوں کے ایجاد کردہ وظائف کرتے ہیں۔ لوگوں نے خود درود شریف گھڑ رکھے ہیں جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ملتی۔ کسی کے ساتھ کوئی نتیجہ جوڑ لیا ہے کسی کے ساتھ کچھ اور کہ چالیس دن پڑھو تو یہ کام ہوجائے گا۔ کسی کو تیس دن پڑھو تو فلاں مرض ٹھیک ہوجائے گا۔ یاد رہے ایسی تمام چیزوں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذمہ داری نہیں لیں گے۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے مجھ سے پوچھا کہ قصیدہ غوثیہ پڑھتا ہوں، کیا پڑھا کروں؟ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ پیر غوث اعظم کا قصیدہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ پیر غوث اعظم یہ قصیدہ پڑھا کرتے تھے؟ کہنے لگا نہیں یہ تو بعد میں کسی نے لکھا ہے۔ میں نے کہا اگر تم اُن کا اتباع کرنا چاہتے ہو تو وہ پڑھو جو آپ پڑھا کرتے تھے۔ کہنے لگے تو بتائیے وہ کیا پڑھتے تھے۔ میں نے کہا وہ تو قرآن پڑھتے تھے تم قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟ قصیدہ تو کسی شاعر نے کہا ہے اس میں مبالغہ بھی ہوسکتا ہے۔ قصیدہ کا وظیفہ پڑھنے کے بجائے قرآن پڑھو، حدیث پڑھو، وظیفہ پڑھنا ہے تو مسنون درود شریف پڑھو۔ وہ درود پڑھو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کردہ ہیں۔

خود سے گھڑ لینا اور کہنا کہ اس کا بڑا فائدہ ہوگا یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ اس لیے عبادت کے نام پر جو کچھ بھی کرنا ہے اسے تلاش کرو کہ کیا یہ سنت میں موجود ہے۔ اگر یہ کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہو تو سر کے بل کرو۔ اگر کسی نے خود جوڑ کر بنالیا ہے تو ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔ وہ شخص ہمارا نبی نہیں ہے۔ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ علماء، صوفیہ، اہل اللہ اور نیکوں کا کام یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں عوام تک پہنچائیں نہ یہ کہ چونکہ وہ نیک ہیں لہٰذا اپنی طرف سے چند اشعار یا وظیفے جوڑ کر لوگوں کو بتاتے پھریں کہ انہیں پڑھو تمہارے کام بن جائیں گے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے لوگوں پر زیادتی ہے اور اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم ہے۔ کارساز صرف اللہ ہے۔ لہٰذا اہل اللہ سے اللہ کا راستہ سیکھو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا طریقہ وسلیقہ سیکھو۔

جو شخص رسومات کی طرف لے جائے، بدعات کا راستہ دکھائے وہ خود بھی گمراہ ہے اور جو اس کے ساتھ چلے گا اس کو بھی گمراہ کردے گا۔

سورۃ ھود رکوع 4 آیات 36 تا 49

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰی نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۴۵﴾

قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ‌ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ‌ۖ فَلَا تَسۡـَٔـلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝ قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ‌ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝ تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ‌ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا‌ ۛؕ فَاصۡبِرۡ‌ ۛؕ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۝

اور نوح (علیہ السلام) کی طرف وحی کی گئی کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ ہرگز کوئی ایمان نہ لائے گا پس آپ ان کے کردار کا غم نہ کھائیں ﴿۳۶﴾ اور ہمارے روبرو ایک کشتی بنائیں اور ہماری وحی کے مطابق۔ اور غلط کاروں کے بارے ہم سے کچھ نہ کہئے بے شک وہ (ضرور) غرق کر دیئے جائیں گے ﴿۳۷﴾ اور وہ (نوح علیہ السلام) کشتی بناتے تھے اور جب ان کی قوم کے سرداران کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے۔ وہ فرماتے اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو یقیناً (ایک روز) ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے جیسے تم مذاق اڑاتے ہو ﴿۳۸﴾ پس تم کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا اور کس پر ہمیشہ کا عذاب نازل ہوتا ہے ﴿۳۹﴾ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور (سے بھی پانی) جوش مارنے لگا تو ہم نے فرمایا کہ ہر قسم (کے جانور میں) سے جوڑا جوڑا اس (کشتی) میں رکھ لیجئے اور اپنے گھر والوں کو (بھی) مگر اس شخص کے علاوہ جس پر بات طے ہو چکی ہے اور جو ایمان لا چکے ہیں (ان کو) اور ان کے ساتھ بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے تھے ﴿۴۰﴾ اور فرمایا اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا۔ بے شک میرا پروردگار بخشنے والا

مہربان ہے ﴿۴۱﴾ اور وہ ان کو لے کر پہاڑوں جیسی موجوں میں چلنے لگی اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور وہ (کشتی سے) الگ تھا کہ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ مت رہو ﴿۴۲﴾ اس نے کہا میں ابھی پہاڑ کے ساتھ جالگوں گا وہ مجھ کو پانی سے بچالے گا۔ انہوں نے فرمایا آج اللہ کے حکم (عذاب) سے بچانے والا کوئی نہیں سوائے اس کے جس پر وہی رحم فرمائیں اور (اتنے میں) دونوں کے درمیان لہر حائل ہوگئی پھر وہ ڈوبنے والوں میں ہوگیا ﴿۴۳﴾ اور حکم دیا گیا اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان! تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور وہ (کشتی) جودی (پہاڑ) پر جا ٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ بے انصاف لوگوں پر لعنت ہو ﴿۴۴﴾ اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے پروردگار کو پکارا۔ پس عرض کیا اے میرے پروردگار! بے شک میرا بیٹا بھی میرے اہل میں سے ہے اور یقیناً آپ کا وعدہ سچا ہے اور آپ سب فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں ﴿۴۵﴾ ارشاد ہوا اے نوح (علیہ السلام)! بے شک وہ آپ کے اہل میں سے نہیں ہے یقیناً اس کے اعمال ناشائستہ ہیں سو مجھ سے ایسی چیز کی درخواست نہ کریں جس کی آپ کو خبر نہیں۔ بے شک میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ نادان نہ بنیں ﴿۴۶﴾ انہوں نے عرض کیا اے میرے پروردگار! یقیناً میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ آپ سے کسی ایسی چیز کا سوال کروں جس کی مجھ کو خبر نہیں اور اگر آپ مجھے نہ بخشیں گے اور مجھ پر رحم نہیں فرمائیں گے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا ﴿۴۷﴾ ارشاد ہوا اے نوح (علیہ السلام) اتریں ہماری طرف سے سلام اور برکتیں لے کر جو آپ پر اور جوان لوگوں (جماعتوں) پر (نازل) ہوں گی جو آپ کے ساتھ ہیں اور (ایسی) امتیں (بھی) ہوں گی جن کو ہم (دنیا کے) فائدے دیں گے پھر ان کو ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۴۸﴾ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جن کو ہم آپ کی طرف وحی

کرتے ہیں ان کو اس سے پہلے نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔ سو صبر کیجئے
یقیناً انجام پرہیز گاروں ہی کا بھلا ہے ﴿۴۹﴾

تفسیر ومعارف

حضرت نوحؑ کی قوم کا ذکر ہو رہا ہے کہ انبیاءؑ کا مقابلہ کرنا ان کو کس انجام سے دوچار کر گیا۔ اللہ کی کائنات میں اس کے اصول کارفرما ہیں۔ اتمامِ حجت کے بعد عذابِ الٰہی آتا ہے لہٰذا جو انبیاءؑ پر ایمان نہ بھی لائے تو اسے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ انبیاءؑ کرام علیہم السلام سے جھگڑا کرنے والوں کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں۔

یہی حکم اللہ کے نیک بندوں کا ہے کہ عامۃ الناس میں سے اگر کوئی ان کی بات نہیں مانتا تو کم از کم ان سے جھگڑا یا ان سے مقابلہ نہ کرے۔ بات نہ ماننے والا اہل اللہ کی برکات سے محروم رہتا ہے لیکن اگر جھگڑا شروع کر دے تو پھر اس پر عذابِ الٰہی واقع ہوتا ہے اور وہ تباہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ تمام اہل اللہ وہی پیغام آگے پہنچاتے ہیں جو اللہ کا پیغام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی طرف سے بات کہتا ہے تو پھر وہ اہل اللہ میں سے نہیں ہے۔ اہل اللہ اللہ کی بات آگے پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ نجات ماننے میں ہے۔ جو نہ مانیں وہ اگر جھگڑا نہ کریں تو دنیوی زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ آخرت کی مصیبت بھگتنی پڑتی ہے لیکن جو مقابلہ شروع کر دیتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں ان کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ان پر دنیا میں بھی عذاب آجاتا ہے۔

نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو سو سال کا مجاہدہ تھا۔ دن رات آپؑ کا یہی کام تھا لیکن قوم کی اکثریت نے نہ مانا۔ نہ ماننے کا بھی ایک اثر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ دل سیاہ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ سیاہی حد سے بڑھ جائے تو اللہ کریم اس پر مہر کر دیتے ہیں۔ پھر واپسی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے انکار کیا بلکہ ایذائیں دیں، طعن و تشنیع کرتے رہے۔ آخر اللہ کریم نے فرمایا، اب ان میں کوئی ایسا نہیں رہا جس کے دل میں قبولیت کی استعداد کا کوئی ذرہ بھی باقی رہا ہو۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ کہ ہم نے نوحؑ پر وحی کی کہ جو چند افراد ایمان لا چکے ہیں ان کے بعد اب پوری قوم میں سے کوئی بھی ایمان لانے والا نہیں۔ یعنی ان کے قلوب اس قدر سیاہ ہو چکے ہیں کہ ان پر مہر لگ چکی ہے۔

فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ آپ ان کے انجامِ بد پر غم نہ کھائیں۔ یہ دکھ نہ کریں کہ انہوں

نے کیا کر دیا۔ یہ ان کا اپنا کیا دھرا ہے۔ انہوں نے جو کمایا وہی انہیں ملے گا۔ جس راستے پر چلتے رہے اسی منزل پر پہنچیں گے۔ آپؑ کیوں دکھ کرتے ہیں۔

نوحؑ کی شفقت کا یہ عالم ہے کہ ساڑھے نو سو سال کے مجاہدے کے بعد بھی جنہوں نے نہیں مانا ان کی دنیا و آخرت برباد ہونے کا غم کھا رہے ہیں۔ نبیؑ اپنی امت پر اس قدر مہربان ہوتے ہیں کہ ہر حال میں ان کے خیر خواہ ہوتے ہیں، ان کے لیے متفکر ہوتے ہیں اور دعا گو رہتے ہیں۔

احکام الٰہی پر عمل نہ کرنا، ایذائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک قسم:

ہم اندازہ کریں کہ جب ہم اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا دکھ پہنچتا ہے۔ ہم نافرمانی کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن اس کا اثر ذات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچے تو ذاتی نہیں رہتا۔ اور پھر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ خیر ہے اللہ کریم ہے بخش دے گا۔ اس کی بخشش میں تو کوئی شک نہیں لیکن اس کا کرم ان کے لیے ہے جو اس سے کرم طلب کرتے ہیں۔ اور کرم طلب کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے۔ اتباع نبوت کو چھوڑ کر حصول کرم الٰہی کی کوئی دوسری راہ نہیں۔ اور جو غضب کو دعوت دیتے ہیں ان پر کرم نہیں ہوتا۔ چونکہ انسان باشعور ہے، مکلف ہے۔ اللہ نے اسے عقل دی ہے، معرفت باری کی استعداد دی ہے۔ اس سب کو ضائع کر کے اگر وہ نبیؐ کی اطاعت نہیں کرتا تو نہ صرف اپنا نقصان کر رہا ہے بلکہ ایذائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سبب بھی بن رہا ہے کہ نبیؐ کو دکھ ہوتا ہے کہ انؐ کی بعثت کے بعد بھی بندہ کیوں جہنم جائے۔

اطلاع عن الغیب:

اللہ کریم کے علاوہ کوئی غیب دان نہیں ہے۔ جو غیب انبیاءؑ بیان کرتے ہیں وہ اطلاع عن الغیب ہوتی ہے۔ یعنی اللہ کریم انہیں اس پر مطلع فرما دیتے ہیں۔ جو چاہیں بتاتے ہیں اور جو نہ چاہیں نہیں بتاتے جیسا کہ ابراہیمؑ پر ایک وقت تھا کہ اللہ نے زمین و آسمانوں کی کائنات ان کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ فرمایا، وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ الانعام:75) اور آپؑ کو اس کا معائنہ کروا دیا۔ انہی ابراہیمؑ پر وہ وقت آیا کہ بیٹا ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ آپؑ نے اپنی اور اسماعیلؑ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور بیٹے کو لٹا کر ان کی گردن پر چھری چلا دی۔ وہ تو اللہ کریم کی مرضی کہ اسمٰعیلؑ کے بجائے مینڈھا ذبح کروا دیا۔ لیکن ابراہیمؑ کو پتہ نہ چلا۔ یہ اللہ کی مرضی کہ کبھی تو پوری کائنات کھول کر دکھا دی اور کبھی یہ نہیں بتایا کہ بیٹا نہیں دنبہ ذبح ہوگا۔

اسی طرح یعقوبؑ سے آپؑ کے بیٹے یوسفؑ بچھڑ گئے۔ کنعان کے کنوئیں میں پڑے رہے یعقوبؑ کو پتہ

نہیں چلا۔ پھر یوسفؑ کو قافلے والوں نے نکالا۔ مصر کے بازار میں بکے۔ بادشاہ نے پالا، پھر جیل بھیج دیے گئے۔ جیل سے باعزت باہر لائے گئے بادشاہ نے اپنا نائب سلطنت بنا دیا۔ جب مصر کے حاکم بنے تو بھائیوں کو اپنا کُرتا دے کر کہا والدین کو بھی لے آؤ۔ جب قافلہ مصر سے نکلا تو کنعان میں بیٹھے یعقوبؑ نے فرمایا، وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝ (سورۃ یوسف:94) آج مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔

یہ ہے اطلاع عن الغیب کہ اللہ کریم جب جو دکھا دے سب نظر آجاتا ہے اور جو نہ دکھائے وہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ اس لیے کہ علم غیب اللہ کا علم ہے۔ باقی سب کو وہ جتنا چاہے عطا کرے۔

یہاں بھی نوحؑ کو غیب پر اطلاع دی کہ ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ آپؑ اپنے دل کو آزردہ نہ کریں بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝ یہ مصیبت انہوں نے خود خریدی ہے۔ یہ ان کے اعمال کا ثمر ہے۔ ان پر کوئی زیادتی نہیں ہورہی۔ انہوں نے اپنے لیے یہی راستہ چنا ہے۔ فرمایا، آپ ایسا کریں وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا آپ ہماری وحی کے مطابق ہمارے روبرو ایک بحری جہاز بنائیں۔ مفسرین کرام نے بِاَعْيُنِنَا، روبرو سے مراد یہ لیا ہے کہ اللہ کریم کی نگرانی میں کام ہوا۔ اللہ کریم تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ ہر چیز ان کے سامنے ہے۔ ہر کام ان کے روبرو ہو رہا ہے۔ یہاں روبرو سے مراد ہے کہ جیسی ہم چاہتے ہیں ویسی درست اندازے پر صحیح پیمائش کے ساتھ ہو۔ تمام کمروں کی ترتیب درست ہو، منزلیں متوازن ہوں۔ یہ طے کر کے بنایا جائے کہ انسان کہاں رہیں گے، کھانا کہاں بنائیں گے، کہاں سوئیں گے۔ جانوروں کے لیے کون سی جگہ متعین ہوگی۔ اس سب کی ترتیب خوب صورت اور متوازن ہو۔ درست اندازے پر ہو، وَوَحْيِنَا ہم آپؑ کو بتاتے جائیں گے آپؑ بناتے رہیے۔ یہی ہوا۔ جبرئیل امین آتے۔ طریقہ بتاتے۔ درخت کاٹے جاتے۔ میخیں لگا کر نمونہ بنایا جاتا۔ اس کے مطابق کام ہوتا تھا۔

علومِ دنیا جاننا سنتِ انبیاءؑ:

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنی بھی ایجادات ہوئیں ان کی ابتداء وحی الٰہی اور تربیتِ الٰہی سے ہوئی۔ صنعتیں بھی انبیاءؑ کو بذریعہ وحی سکھائی گئیں۔ پھر لوگوں نے ہر دور میں اس میں اضافے کیے، سنوارا اور حالات کے مطابق ڈھالا لیکن ابتداءً تمام ایجادات انبیاءؑ سے ہوئیں۔

حصولِ علم غلبہ دین کا سبب:

اس کا معنی یہ ہے کہ ایجادات اور صنعت کا علم جاننا سنتِ انبیاءؑ ہے اور منشاءِ باری ہے۔ روزگار کا بہترین

ذریعہ اور دنیا پر غلبے کا سبب ہے۔ ہم نعرے لگاتے ہیں کہ اسلام نافذ کیا جائے۔ اسلام نعروں سے نافذ نہیں ہوتا۔ دین دار لوگوں کو چاہیے کہ صنعتِ وحرفت میں ترقی کریں۔ سائنسی علوم میں ترقی کریں، ایجادات کریں یہ غلبہء دین کا سبب بنے گا۔ جب دین دار لوگوں کو غلبہ نصیب ہوگا تو دین نافذ ہوگا۔ یہی طریقہء قدرت ہے، سنت انبیاءؑ ہے۔ غالب قوت بننے کے لیے صنعت کو جاننا ضروری ہے۔ جب نئی نئی ایجادات اور صنعتوں پر مسلمان عبور حاصل کریں گے اپنا مقام پیدا کریں گے تو لوگ ان کے ساتھ جمع ہوں گے۔ اس میں لوگوں کو حلال روزگار ملے گا۔ حلال کمائیں گے، حلال کھائیں گے اور ایک مثبت قوت بنیں گے علم وعمل کی قوت مسلمانوں کے پاس ہوگی تو یہ طاقت اسلام نافذ کرے گی۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تھا تو اسلام نافذ ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکّی زندگی میں جو تبلیغ ہوئی اس جیسی تبلیغ کون کرسکتا ہے لیکن ریاستی سطح پر اسلام تب نافذ ہوا جب مدینہ منورہ میں ریاست بنی۔ جب غلبہ حاصل ہوا تو اسلام نافذ ہوگیا لہٰذا اسلامی قوتوں کو چاہیے کہ غلبہ حاصل کریں۔

غلبہ حاصل کرنے کے جو طریقے آج رائج ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ بندوق اٹھا لو لوگوں کو ڈراؤ، دھمکاؤ ساتھ ملا لو جیسا آج کل عام ہو رہا ہے اور اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ یہ انبیاءؑ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ غیر شرعی طریقہ ہے۔ خود اسلام کے خلاف ہے۔ جائز اور درست طریقہ یہ ہے کہ صنعت وحرفت کے علوم پر عبور حاصل کیا جائے۔ دینی علم رکھنے والے لوگ صنعت وحرفت میں تجربہ حاصل کریں تاکہ صنعت نیک لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائے۔ جہاں لوگوں کو روزگار ملے، حلال روزی ملے اور لوگوں کی تائید نیکوں کے ساتھ ہو تو نیکوں کو غلبہ مل جائے۔ جب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگا تو وہ اسلام نافذ کریں گے۔

قرآنِ حکیم علوم کا خزانہ ہے۔ کسی موضوع کو دیکھنا چاہیں تو تسلی بخش مواد مل جاتا ہے۔ صنعت وحرفت کو لے لیں۔ مختلف انبیاءؑ کے ذریعے مختلف ایجادات سے بنی نوعِ انسان روشناس ہوا۔ حضرت سلیمانؑ کے بارے ملتا ہے کہ ان کے سفر کے وسائل اتنے تیز رفتار تھے اور اتنے قوت والے تھے کہ ان کا تخت پورے لشکر کو لے کر اڑ جاتا تھا اور ایک مہینے کی مسافت ایک دن میں طے کر لیتا تھا۔ وہ ہوائی جہاز کی کتنی ترقی یافتہ شکل تھی۔ یوں حضرت سلیمانؑ ہوائی جہاز کے موجد ٹھہرے۔ نوحؑ نے تربیتِ الٰہی اور وحی الٰہی کی نگرانی میں عظیم الجثہ، نہایت موزوں کشتی، جہاز بنایا تو نوحؑ بحری جہاز کے موجد ٹھہرے۔ اسی طرح تلاش کرتے جائیں تو جتنی عظیم ایجادات ہیں وہ انبیاءؑ سے ہیں اور مومن کا سرمایہ ہیں۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم نے ان علوم سے ہاتھ اٹھا لیا۔ صنعتیں کفار کے ہاتھ میں آ گئیں۔ ان کو غلبہ نصیب ہوگیا۔ اب وہ دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ جو کام ہمیں کرنا چاہیے تھا وہ ہم نے چھوڑ

دیا۔ اس لیے ہمارے اسلاف غلبہء اسلام کا باعث تھے اور ہم کیا ہیں!

تذکرہَ نوحؑ جاری ہے۔ آپؑ نے حکم کی تعمیل میں کشتی، جہاز بنانا شروع کر دیا۔ وحی الٰہی آتی رہی اور اس کے مطابق کشتی تیار ہوتی رہی۔ چونکہ انبیاءؑ کے قلوب بہت نرم ہوتے ہیں اس لیے فرمایا، وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ جن لوگوں نے زیادتی کی ہے ان کے لیے پھر دعا نہ کیجیے گا۔ جب طوفان آئے گا تو آپؑ ان ظالموں کے لیے اپنے دستِ دعا مت اٹھایئے گا۔

جہلاء کا طرزِ عمل:

دعا کے بھی آداب ہیں۔ ناجائز کام کے لیے دعا کرنا بھی ناجائز ہے۔ جاہلوں نے دعا کو بھی رسم بنالیا ہے۔ پیر صاحب بیٹھے ہیں جو آتا ہے کہ دعا کریں تو پیر صاحب ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ قاتل کے وارث آجاتے ہیں کہ دعا کریں، قاتل بری ہو جائے تو دعا شروع ہو جاتی ہے۔ مقتول کے ورثاء آجائیں کہ دعا کریں انصاف ملے تو دعا ہو جاتی ہے۔ یہ جائز نہیں۔ ناروا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ کوئی مقروض قرض کی ادائیگی کے لیے دعا کروائے یا بے روزگار کسی جائز روزگار کی تلاش کر رہا ہو اور دعا کروالے یا کوئی بیمار کہے میری صحت کے لیے دعا کریں لیکن وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر کمربستہ رہیں اور رسماً دعا کروانے آجائیں کہ انہیں کامیابیاں نصیب ہوں تو یہ اسی زمرے میں آئے گا جس سے اللہ کریم اپنے نبی نوحؑ کو منع فرما رہے ہیں کہ ان ظالموں نے خود اپنے ساتھ زیادتی کی ہے ان کے بارے دعا مت کیجیے۔ فرمایا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ ان کا فیصلہ ہو گا۔ انہیں غرق ہونا ہے۔ جہاں نوحؑ کا مسکن تھا وہاں صحرا ہی صحرا تھا۔ پانی تو مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ نوحؑ اپنا کام کرتے رہتے تھے وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ کشتی بناتے تھے۔ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ اور جب قوم کے سردار اور اُمراء وہاں سے گزرتے تو نوحؑ کا مذاق اڑاتے کہ اب یہ صحرا میں، ریگستان میں بحری جہاز چلائیں گے، بحری کشتیاں چلائیں گے۔ ان کا تو دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کے نبیؑ ہیں اور لوگوں کو جنت لے جائیں گے جبکہ ان کی عقل کا یہ عالم ہے کہ صحرا میں، ریگزاروں میں بحری جہاز بنا رہے ہیں۔

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فرمایا، آج تم میرا مذاق اڑا رہے ہو وقت آنے دو کل تمہارا مذاق اڑایا جائے گا۔ دنیا تمہارا مذاق اڑائے گی اور لوگ کہیں گے کہ انہیں اتنی عقل بھی نہ آسکی کہ نبیؑ کی اطاعت کر لیتے۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

تم بہت جلد جان لوگے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے ذلیل کر دیتا ہے اور جو دائی ہوتا ہے۔صرف یہی نہیں کہ غرق ہوئے بلکہ غرق ہوکر جہنم پہنچے اور ابدالآباد عذاب الہٰی میں گرفتار ہو گئے۔فرمایا، تمہیں جلد پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، جس راستے پر چل رہے ہو یہ دائمی تباہی کا راستہ ہے۔صرف یہی نہیں کہ دنیا کا عذاب آیا، زندگی ختم ہوگئی مر گئے۔یہاں بات ختم نہیں ہوتی۔تم پر تو وہ عذاب آ رہا ہے جو تمہیں دنیا میں بھی ذلت کی موت مارے گا اور تم برزخ میں بھی ذلیل ہوگے اور آخرت میں بھی ذلیل رہو گے عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٩﴾ تم پر ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا مستقل عذاب آ رہا ہے۔تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ کس پر عذاب واقع ہوکر اسے ذلیل کرتا ہے اور وہ عذاب پھر اس پر ہمیشہ کے لیے مسلط ہو جائے گا۔

برزخ کا عذاب اور ہے، عذاب مقیم اور:

ہر اچھے یا بُرے کام کے نتائج دو طرح سے مرتب ہوتے ہیں۔ایک ظاہری طور پر دنیا میں نظر آتے ہیں دوسرے اخروی نتائج۔یہ دونوں پہلو بہ پہلو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ان کی سمجھ قرآن پڑھنے سے آتی ہے۔حدیث مبارک سے آتی ہے۔اللہ کسی کو کشف، وجدان، الہام یا القاء کر دے۔خود کسی کو بتا دے ورنہ عامۃ الناس کو سمجھ نہیں آتی۔آج کل تو لوگ کہتے ہیں کہ پتہ نہیں برزخ میں عذاب و ثواب ہے بھی کہ نہیں۔جبکہ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ فرعون اور اس کے لشکری سمندر میں ڈوب گئے أُغْرِقُوْا فَأُدْخِلُوْا (سورۃ نوح:25) اور داخل آگ میں ہوئے۔ایک رخ یہ ہے کہ ظاہری آنکھ نے تو دیکھا کہ وہ سمندر میں غرق ہو گئے لیکن حقیقتاً وہ آگ میں جا پہنچے۔یہ دوسرا رخ ہے۔تو جو لوگ کہتے ہیں کہ برزخ میں عذاب و ثواب نہیں وہ غور کریں کہ آل فرعون تو سمندر میں غرق ہوئی اور قیامت تو قائم نہیں ہوئی لہٰذا وہ ابھی تک برزخ میں ہی ہیں۔قرآن حکیم میں دوسری جگہ یہ بات یوں ثابت ہے کہ فرمایا، اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا (غافر:46) صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں۔قیامت سے پہلے صبح و شام ان پر جو یہ آگ بھیجی جا رہی ہے یہ تو برزخ کا عذاب ہے۔جب نوحؑ کا جہاز مکمل تیار ہو گیا۔اللہ کا حکم آن پہنچا۔فرمایا، حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ اور تنور ابلنے لگے۔

عربی میں تنور بلندی کو بھی کہتے ہیں، سطحِ زمین کو بھی اور خاص اس چولہے کو بھی کہتے ہیں جس میں روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔بعض حضرات نے لکھا ہے کہ نوحؑ کو یہ نشانی بتائی گئی تھی کہ جب تنور جہاں ہمیشہ آگ جلتی ہے، سے پانی ابلنے لگے تو آپؑ خود بھی کشتی میں سوار ہو جایے۔جتنے لوگ آپ کے ساتھ ایمان لائے ہیں انہیں بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی سوار کرا لیجیے۔انسانی ضرورت کے لیے جتنے خشکی کے جانور ہیں ان کا بھی جوڑا، جوڑا سوار کرا لیجیے۔

اگر فَارَ التَّنُّوْرُ سے بلندی مراد لی جائے تو پہاڑوں کے دامن میں تو عموماً خیمے ہوتے ہیں تو اس سے مراد ہوگا کہ جب چوٹیوں سے پانی ابلنے لگے۔ اگر اس سے سطح زمین مراد لی جائے تو بھی درست ہے کہ ساری زمین ہی پانی چھوڑ دے۔ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ فرمایا، ہم نے حکم دیا کہ اب کشتی میں سوار ہو جائیے۔ اس میں ہر قسم کے جانوروں کا جوڑا جوڑا سوار کرا لیجیے۔ اپنے گھر والوں کو بھی اور ان لوگوں کو بھی جو آپؑ کے ساتھ ایمان لا چکے ہیں۔

کشتی میں انسانی ضرورت کے جانوروں کے لیے علیحدہ جگہ تھی، انسانوں کے لیے علیحدہ۔ کشتی میں مومن مرد اور مومن عورتیں تھیں۔ نوحؑ اور آپؑ کے اہل خاندان تھے۔ آپؑ کی تین بیویاں سوار تھیں۔ چوتھی بیوی کفار کے ساتھ غرق ہوگئی۔ تین بیٹے کشتی میں سوار تھے چوتھا کفار کے ساتھ رہ گیا۔ اور نوحؑ کے ساتھ بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے۔ مفسرین کے مطابق ساڑھے نو سو سال کی تبلیغ کے نتیجے میں اتنے ہی لوگ تھے یعنی (80) اسی یا (82) بیاسی مرد و خواتین جو کشتی میں سوار ہوئے۔ اس بات میں مفسرین کے ہاں اختلاف ہے کہ کیا ساری زمین ڈوب گئی یا کچھ علاقہ ڈوبا تھا۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس وقت جہاں تک انسانی آبادی تھی وہ سب ہی غرق ہوگئی۔ بڑے بڑے پہاڑ تک غرق آب ہو گئے۔ اگر کوئی ہمالہ بھی تھا تو پانی اس سے اوپر تھا اور کوئی انسان نہیں بچا سوائے ان کے جو کشتی نما جہاز میں سوار تھے۔ اسی لیے طوفان نوحؑ کے بعد جب زمین دوبارہ آباد ہوئی اور جتنی انسانی نسل آج تک چل رہی ہے یہ سب نوحؑ کی اولاد ہے۔ نوحؑ کو اسی لیے آدمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

فرمایا آپ اپنے گھر والوں کو بھی سوار کرا لیجیے اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ سوائے ان کے جن پر تقدیر جاری ہو چکی ہے۔ اپنے گھر والوں میں سے بھی انہیں چھوڑ دیں، ان کی پروا نہ کریں جنہوں نے آپؑ کا راستہ نہیں اپنایا بلکہ آپؑ کی مخالفت کی اور کفار کا راستہ اپنایا۔ اس حکم میں آپؑ کی ایک بیوی اور ایک بیٹا شامل تھا۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اور فرمایا اس میں سوار ہو جاؤ۔ اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے۔ میرا پروردگار یقیناً بہت بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

اللہ کے کرم کی کوئی حد نہیں۔ جو محروم رہتا ہے وہ بدقسمت خود کو اس سے الگ کر لیتا ہے۔ کرم کو چھوڑ کر غضب کو دعوت دیتا ہے۔ بندہ اپنے ہر عمل میں یا اللہ کی مغفرت مانگ رہا ہوتا ہے یا اس کا کردار غضب الٰہی کو دعوت دے رہا ہوتا ہے۔ درمیان میں کچھ نہیں ہے۔ جو کرم کا راستہ اختیار نہیں کرتا اس کا جو قدم اٹھتا ہے وہ غضب الٰہی کی طرف اٹھتا ہے۔ بندہ ہر کام میں دو میں سے کسی ایک سمت جا رہا ہوتا ہے۔ بات کہے، سنے یا عمل کرے یا اللہ کی بخشش کو پاتا ہے یا

اس کی ناراضگی مول لیتا ہے۔ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۗ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ
ایسی موجیں اٹھ رہی تھیں جیسے بڑے بڑے پہاڑ ہوں۔ ان میں کشتیِ نوحؑ اپنے سواروں کو لے کر آرام سے چلنے لگی تو
نوحؑ کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔ وہ تیرتا ہوا پہاڑ کی طرف جا رہا تھا وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ تو نوحؑ نے اپنے بیٹے کو
آواز دی جو کفار کے ساتھ رہ گیا تھا اور کشتی میں سوار نہیں ہوا تھا یٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا

امان کے لیے نبیؑ کی معیت شرط:

نوحؑ نے فرمایا، بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ اور کافروں کے ساتھ مت
رہو۔ ارْكَبْ مَّعَنَا میں معنا یہ بتاتا ہے کہ سوار ہونے کے لیے نبیؑ کی معیت شرط تھی۔ ایمان شرط تھا۔ فرمایا، ہمارے
ساتھ شامل ہو جاؤ، کشتی میں سوار ہو جاؤ یعنی ایمان لے آؤ۔ ایمان نہ لاتا تو کشتی میں سوار ہونے کی توفیق ہی نہ ملتی۔
آپؑ نے دعوت دی کہ کشتی میں سوار ہو جاؤ، ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ، ایمان لے آؤ اور کافروں کا ساتھ نہ دو۔

کافروں کا ساتھ کیا ہے؟

کافروں کا عقیدہ اختیار نہ کرو۔ کافروں کا کردار نہ اپناؤ۔ کافروں کے شعار اختیار نہ کرو خواہ وہ شعار لباس و
حلیہ کے ہوں یا تہذیب و معاشرت کے۔ مومن کی اپنی شناخت ہونی چاہیے کافر سے الگ ہونی چاہیے۔ کردار میں،
رکھ رکھاؤ میں بھی نظر آنا چاہیے کہ یہ مومن ہے یہ غیر مومن۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے مَنْ تَشَبَّهَ
بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (سنن ابی داؤد) جس شخص نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی قیامت میں ان میں سے اٹھایا
جائے گا۔ گویا لباس، حلیے، تہذیب و معاشرت کا اتنا اثر ہے لہٰذا نہ کفر کی تہذیب اختیار کرنا چاہیے نہ معاشرت نہ حلیہ اور
نہ لباس ان جیسا ہونا چاہیے۔

اللہ کا رحم نورِ ہدایت ہے:

جب نوحؑ نے بیٹے کو فرمایا کہ کافروں کا ساتھ نہ دو تو اس نے کہا قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ میں ابھی پہاڑ
سے جا لگوں گا۔ میں پہاڑ کی طرف جا رہا ہوں، میں پہاڑ تک پہنچ جاؤں گا، اونچی جگہ چڑھ جاؤں گا يَّعْصِمُنِيْ مِنَ
الْمَآءِ ۭ یہ پہاڑ مجھے پانی سے بچا لے گا۔ نوحؑ نے فرمایا قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ آج
اللہ کے حکم، اللہ کی گرفت سے، اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ پہاڑ بچا سکتا ہے اور نہ کوئی اور۔ ہاں!
اللہ خود رحم فرما دے۔ اور اللہ کا رحم نورِ ہدایت ہے۔ اللہ جس پر رحم فرمائے اسے ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ مزید مہربانی

کرے تو توفیق عمل نصیب ہوتی ہے اور اللہ کا بندہ بنتا ہے۔

یہاں سے یہ پتہ چلا کہ یہ جو عام کہا جاتا ہے کہ اعمال میں کیا رکھا ہے بس اللہ کا رحم چاہیے۔ اللہ تو رحم کرنے والا ہے بندہ اپنی سی کوشش تو کرے عملاً نافرمانی کے راستے کو اپنانا، اسی پر چلتے رہنا اور زبانی زبانی کہتے رہنا کہ اللہ تو بڑا رحم کرنے والا ہے۔ یہ درست روش نہیں کہ اللہ کا رحم یہی ہے کہ بندے کو دنیا کی مہلت میں ہدایت نصیب ہو جائے۔

یہاں سے یہ بھی پتہ چلا کہ نبیؑ کے ساتھ نسبی رشتہ ہو اور ایمان و اتباع نہ ہو تو اس رشتے کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایمان ہو، نبیؑ کا اتباع نصیب ہو اور پھر نسبی رشتہ بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے۔ یہ اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے لیکن انبیاءؑ کے ساتھ پہلا رشتہ ایمان کا ہے، نسبی رشتہ ثانوی ہے۔

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ﴿۴۳﴾ اتنے میں ایک لہر اٹھی اور اس کو لے گئی۔ ان کے درمیان حائل ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیٹا آپؑ کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو گیا۔ نبیؑ کی اولاد ہونے کے باوجود ایمان نہ لایا تو محض نسبی رشتہ ہونا کسی کام نہ آیا بلکہ دُہرا جرم بن جاتا ہے کہ نبیؑ سے نسبی رشتہ ہونے کے باوجود اطاعت نہیں کر رہا۔

وَقِيلَ يَٰأَرْضُ ابْلَعِي مَآءَكِ اور ہم نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا **وَيَٰسَمَآءُ أَقْلِعِي** اور اے آسمان تھم جا! پانی برسانا بس کر دے **وَغِيضَ الْمَآءُ** اور پانی خشک کر دیا گیا **وَقُضِيَ الْأَمْرُ** اور کام تمام کر دیا گیا۔ کوئی کافر زندہ نہ بچا۔ سب غرق آب ہو گئے اور اللہ کی بے شمار مخلوق کی تباہی کا سبب بن گئے۔ چیونٹی سے لے کر بڑے بڑے جانوروں تک اور چرند پرند سے نباتات تک، درخت، فصلیں، کھیتیاں ہر چیز اجاڑ کر رکھ دی۔ اس ساری تباہی کی ذمہ داری ان پر آتی ہے جن کا کردار طوفان لانے کا سبب بنا۔

ایک رائے:

اللہ کریم نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا۔ تو زمین کا وہ حصہ جہاں طوفانِ نوح کا سارا پانی جذب ہوا وہ حصہ آج بھی اتنا جاذب ہے اس میں اللہ کے حکم کی خصوصیت آج بھی باقی ہے کہ جو سمندروں کے درمیان اس تکون پر چلا جائے خواہ عظیم الجثہ بحری جہاز ہو وہ ڈوب جاتا ہے اور صرف ڈوبتا ہی نہیں اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح اس کے اوپر کوئی ہوائی جہاز اڑتا ہوا گزرے تو یہ تکون اسے بھی کھینچ لیتی ہے۔ وہ بھی ایسا ڈوبتا ہے کہ اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح اس کے اوپر کوئی ہوائی جہاز اڑتا ہوا گزرے تو یہ تکون اسے بھی کھینچ لیتی ہے۔ وہ

بھی ایسا ڈوبتا ہے کہ اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ کوئی نہیں جانتا یہ سب کہاں چلے جاتے ہیں۔ یہ Bermuda Triangle کے نام سے پوری دنیا کے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ سائنسدانوں کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ یہاں ایک مقناطیس کا پہاڑ ہے جو ہر شئے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

میری رائے ہے، جو میں سمجھا ہوں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے حکم سے زمین نے پانی جذب کیا تھا۔ اس میں وہ خصوصیت ہمیشہ کے لیے رہ گئی ہے کہ جو چیز سامنے آتی ہے وہ نیچے چلی جاتی ہے۔ سمندر کا جو پانی کھڑا ہے وہ، وہی ہے جتنا اللہ اسے باقی رکھنا چاہتے تھے۔ بہر حال یہ میری سمجھ کے مطابق میری رائے ہے جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ سائنسدانوں نے اسے مقناطیسی کشش بتایا ہے لیکن اگر یہ مقناطیس ہے تو جتنے جہاز ڈوبے ہیں وہ اس کے ساتھ چپکے ہوئے ہونے چاہیں۔ ان کا کوئی ٹکڑا، کوئی حصہ تو وہاں ہونا چاہیے مقناطیس کھینچتا تو بحری جہاز اس مقناطیسی پہاڑ کے ساتھ چمٹے ہوتے۔ پہاڑ نگل نہیں سکتا۔ لیکن وہاں تو کچھ نہیں ملتا۔

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ اور کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھہری۔ جودی پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے کوہ ارارات اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جس پر جا کر کشتی ٹھہری۔ اہل مغرب نے امن کا ایک نشان بنا رکھا ہے جس میں ایک فاختہ ہے اس کی چونچ میں سبز ٹہنی ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب کشتی چل رہی تھی تو دور سے پہاڑ کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ ارارات کی چوٹی پر زیتون کے درخت تھے۔ کشتی تو ابھی موجوں میں گھری ہوئی تھی کہ فاختہ نے وہ درخت دیکھ لیے وہ اڑی اور زیتون کے درخت کی ایک چھوٹی سی شاخ توڑ کر لائی اور نوحؑ کو پیش کی کہ ہم خشکی کے قریب پہنچ گئے ہیں اور خشکی کی سمت کی نشاندہی کی کہ اس طرف آگے خشکی ہے۔

الْفُلْكَ کا ترجمہ کشتی کر دیا جاتا ہے۔ جہاز بھی کشتی ہی ہوتی ہے۔ نوحؑ کی کشتی بھی پورا ایک بحری جہاز تھا جس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی تھی۔ اس میں بڑے بڑے کمرے تھے اور وہ ایک بڑی عمارت جتنی بڑی تھی۔

وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ اور اعلان کر دیا گیا کہ ظلم کرنے والے اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ بے انصاف لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو خود اللہ کی رحمت سے دور کر دیا اور لعنت یہی ہے کہ اللہ کی رحمت سے دوری ہو جائے۔

جب نوحؑ کا بیٹا غرق ہو گیا تو آپؑ نے دعا فرمائی وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ اپنے پروردگار کو پکارا، عرض کی فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ اے اللہ! میرا بیٹا تو میرے خاندان میں سے ہے۔ میرا سگا بیٹا ہے۔ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ آپ کا وعدہ تو برحق ہے، سچا ہے اور آپ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

انبیا کرام کو اللہ تعالیٰ بہت وسیع علم عطا فرماتے ہیں۔ جس غرض سے مبعوث ہوتے ہیں اس پر انہیں پورا عبور حاصل ہوتا ہے۔ ہر ہر پہلو سے اس پر نظر بھی رکھتے ہیں لیکن بات وہی ہے کہ انبیاء کو جو علم دیا جاتا ہے وہ اللہ کریم کی طرف سے اطلاع عن الغیب ہوتی ہے علمِ غیب نہیں ہوتا۔ علم غیب خاصہء خداوندی ہے۔ نوحؑ نے اپنے انداز سے غرض پیش کی اللہ! آپ کا وعدہ تھا کہ آپ میرے خاندان کو محفوظ رکھیں گے اور یہ میرا سگا بیٹا ہے اور بارالٰہ تُو ہر چیز پر قادر ہے، جو چاہے کرسکتا ہے، اسے بچالے۔ ارشاد ہوا قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اے نوحؑ! یہ آپؑ کے خاندان سے نہیں ہے۔ انبیاء کے ساتھ مقدم رشتہ ایمان کا ہے۔ اگر ایمان نہیں ہے تو پھر کوئی رشتہ نہیں کہ بغیر ایمان کے نبیؑ کے ساتھ رشتہ نہیں رہتا تو ظاہر ہے جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کا رشتہ نبیؑ کی امت کے ساتھ بھی نہیں رہتا۔ اسی لیے مومن اور کافر میں نکاح نہیں ہوسکتا، رشتہ اخوت، بھائی چارا نہیں ہوسکتا۔ باقی تمام دنیوی معاملات کافر اور مومن کے درمیان ہوسکتے ہیں۔ خرید و فروخت، لین دین، کاروباری تعلقات کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں مومن کے لیے تاکید ہے کہ دیانتداری سے کریں۔ کسی کی جان، مال اور آبرو کو نہ چھیڑیں یعنی شرعی حدود کے اندر کافر سے بھی تعلق رکھا جا سکتا ہے اور جہاں شریعت روک دے وہاں تعلق رکھنا جائز ہے۔ بین الاقوامی تعلقات تجارت و کاروبار کے معاملات، صلح و جنگ سب کے اپنے اپنے قاعدے ہیں۔ لیکن رشتہء اخوت یعنی بھائی بھائی بن کر رہنا جسے اردو میں بھائی چارا کہتے ہیں یہ رشتہ مومن اور کافر کے درمیان نہیں ہوسکتا۔

یہاں اس آیہء مبارکہ میں اللہ کے اولوالعزم رسول نوحؑ کا سگا بیٹا ہے لیکن اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں کہ بے شک یہ آپ کے گھر والوں میں سے ہے، لیکن آپ کے اہل یعنی خاندان سے نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ اس کا عقیدہ کافروں جیسا ہے اور جیسا عقیدہ ہوگا ویسا ہی کردار ہوگا۔ اس کے اعمال برے ہیں۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اور آپؑ کو جن باتوں کی خبر نہ ہو ان کے لیے دعا نہ فرمائیں۔ وہ چیز مجھ سے نہ مانگیں جس کی حقیقت کو آپ نہیں جانتے۔ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٤٦﴾ آپؑ کو نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ نادانوں جیسی باتیں نہ کریں۔

نازک ترین مقام:

قرآن حکیم میں انبیاء علیہم السلام سے اللہ کریم کا جو انداز تخاطب ہے یہ صرف اللہ کریم کو سزاوار ہے۔ وہ خالق و مالک ہے، پروردگار ہے، پالنہار ہے، رتبے اور عزتیں دینے والا ہے۔ انبیائے کرام اللہ کے پیارے بندے

ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کو جو چاہے کہہ سکتا ہے جیسے اس آیہء مبارکہ میں فرمایا کہ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ نادانوں جیسی باتیں نہ کریں لیکن چونکہ یہاں لفظ الْجٰھِلِیْنَ استعمال فرمایا ہے تو اگر کوئی یہاں سے لے کر نوحؑ کو (معاذ اللہ) جاہل کہے گا تو کہنے والا کافر ہو جائے گا۔ یہ کسی عالم فاضل کی یا عام بندے کی حیثیت نہیں۔ اس کے لیے صرف قرآن کے الفاظ کی تلاوت کا حکم ہے۔ یہ مقام صرف اللہ کا ہے۔ اللہ اپنے نبیؐ سے بات کر رہا ہے اور جس انداز سے چاہے بات کر سکتا ہے۔

اسی طرح حضرت یونسؑ نے خود کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (سورۃ الانبیا: 87) یہاں آپؑ خود اپنے آپ کو ظالم کہہ رہے ہیں لیکن کوئی دوسرا یہاں سے اسم فاعل بنا کر یونسؑ کو ظالم کہے گا تو کافر ہو جائے گا۔ ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ آج کل تو اردو خواں طبقے میں رواج چل نکلا ہے کہ قرآن پڑھ کر جو منہ میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نازک مقامات ہیں۔ ایمان بچانے کے لیے محتاط ہونا لازم ہے کہ دیکھیں مخاطب کون ہے، کس سے مخاطب ہے، کہنے والی ہستی کون ہے، سنائے جانے والے کا کیا مقام ہے اور بات کا سیاق وسباق کیا ہے؟ ان ساری باتوں کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کرنا چاہیے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اِنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ آپؑ نے عرض کی اے پروردگار عالم! میں آپ کی ہی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جن باتوں کی مجھے خبر نہیں ان کے لیے میں آپ سے سوال کروں۔

یہاں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب تک اصل بات کا پتہ نہ ہو دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھانے چاہیں۔ دعا کرنا حاصل عبادت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے دعا عبادت کا مغز ہے۔ الدعا مخ العبادۃ او کما قال رسول اللہ ﷺ۔ اللہ کریم کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار اور اللہ کریم سے رضامندی کی طلب اور دعا حاصلِ عبادت ہے۔ لیکن جس کا اللہ پر ایمان نہیں ہے اس کے لیے اس کی زندگی میں ہدایت کی دعا کی جاسکتی ہے کہ اللہ کریم اسے ہدایت دے۔ کفر پر مر جائے تو اس کے لیے دعا کرنا حرام ہے خواہ وہ اولاد ہو، والدین، قریبی رشتہ دار یا دور کے رشتہ دار ہوں۔ کسی کافر کے لیے مرنے کے بعد دعا نہیں کی جاسکتی۔ اور جن باتوں کے بارے علم نہ ہو، جب تک حقیقت حال کا علم نہ ہو، پتہ نہ ہو کہ کس کام کے لیے دعا کرنی ہے تو ہر آنے والے کے لیے دعا کرنا درست نہیں۔ اگر کوئی کہتا ہے میرے لیے دعا کر دیں تو اچھی بات ہے اس کے لیے ایمان پر خاتمے کی دعا کر دیں۔ ہدایت کی دعا کر دیں لیکن کسی خاص کام کے لیے دعا کرنے کو کہے تو کیا خبر وہ کام جائز کر رہا ہے یا ناجائز۔ اس کا حق بنتا ہے یا نہیں۔ لہٰذا ہر کام کے لیے ہاتھ اٹھانا گستاخی اور بے ادبی شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ دعا مانگنا سب سے اچھی عبادت ہے۔ اللہ کریم سے

ہی مانگنا حاصلِ عبادت ہے لیکن کسی ناجائز ناروابات کے لیے ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔

اسی لیے نوحؑ فرما رہے ہیں اے رب العالمین، اے میرے پروردگار میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ میں ان باتوں کے لیے دعا کروں جن کی مجھے خبر نہیں جس بات کی حقیقت کا مجھے پتہ نہیں میں اس کے لیے دعا کروں۔

دورِ حاضر میں جاہلیت کا یہ عالم ہے کہ دعاؤں پر بھی نذرانے لیے جاتے ہیں اور جنازے کے لیے جائیں تو لوگ اپنی پارسائی ظاہر کرنے کے لیے چند منٹ میں نماز جنازہ پڑھا دیتے ہیں اور دعاؤں پر طویل وقت لگاتے ہیں جبکہ نماز جنازہ میں کتنے بیمار اور معذور بھی شریک ہوتے ہیں۔ جنازے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ میت کو غسل دیں، نماز جنازہ پڑھیں، قبر میں اتاریں، مٹی ڈالیں اور قبر برابر کر کے دعا کریں۔ نماز جنازہ پڑھ کر میت سامنے رکھ کر دعا مانگنا مسنون نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنازے پر دفن ہونے سے پہلے دعا نہیں فرمائی۔ لوگ اسے مسنون ثابت کرنے کے لیے حدیث مبارک کا ایک حصہ لے لیتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ پوری حدیث یہ ہے کہ غزوۂ موتہ میں جو صحابہ کرامؓ شہید ہوئے اور وہیں دفن ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ مدینہ منورہ میں پڑھی اور جنازہ پڑھنے کے بعد ان کے لیے دعا فرمائی لہٰذا ان جب میت سامنے ہو تو نماز جنازہ کے بعد دعا پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں۔

انبیاء اللہ کریم کے سامنے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ اسی عاجزی سے اپنی برأت چاہی اور عرض کی کہ آئندہ کے لیے بھی مجھے اپنی پناہ میں لے لیں میں ایسی بات نہ کر سکوں فرمایا، وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَتَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۴۷﴾ یا اللہ اگر تو نہ بخشے اور رحم نہیں فرمائے تو خسارے میں پڑ جاؤں گا۔

حضرت نوحؑ اللہ کے اولوالعزم رسولؑ ہیں۔ آپؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے کیونکہ اس طوفان کے بعد روئے زمین پر جتنی انسانیت پھیلی یہ صرف آپؑ کی اولاد ہے۔ پوری کشتی میں اسی یا بیاسی افراد تھے جو آپؑ پر ایمان لائے تھے ان میں آپؑ کی تین بیویاں اور تین بیٹے تھے۔ ایک بیوی اور ایک بیٹا طوفان میں غرق ہو گئے۔ کشتی میں سوار تمام اہل ایمان تھے۔ ان میں سے صرف نوحؑ کی اولاد پھلی پھولی۔ دوسرے تمام لوگوں کی اولاد نہیں ہوئی۔ اسی لیے ہر قوم کا شجرہ نسب نوحؑ کے بیٹوں سے ملتا ہے۔ اس عظمت کی حامل ہستی، اللہ کے اولوالعزم رسولؑ عرض کر رہے ہیں کہ اللہ کریم اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں بہت نقصان میں چلا جاؤں گا۔ اگر انبیاء اس طرح لرزتے دلوں کے ساتھ عرض کرتے ہیں تو ہمیں اپنی پارسائی پر ناز کیسا؟

ارشاد باری ہوا قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ اے نوحؑ! آپ کی کشتی خشکی کے ساتھ لگ گئی۔ ہماری طرف سے آپؑ سلامتی کے ساتھ اتریں۔ یعنی وہ زمین جس پر غضبِ الٰہی نازل ہوا، طوفان آیا اور لوگ غرق آب ہو گئے وہی زمین آپؑ کے لیے سلامتی کا سبب ہے۔ وَبَرَکٰتٍ عَلَیْكَ آپؑ پر میری طرف برکات نازل ہوں گی۔ روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ دنیوی نعمتیں بھی عام ہو جائیں گی۔ باغات، کھیت اور فصلیں ہوں گی۔ دولت کی فراوانی ہوگی اور نعمتیں عام ہوں گی۔ آپؑ کی اولاد پھلے پھولے گی۔ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ط ان لوگوں پر بھی نعمتیں نازل ہوں گی جو آپؑ کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے۔ ان پر بھی اللہ کی رحمت ہوگی۔

ایک اصول:

فرمایا: سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴۸﴾ ہم تمام لوگوں پر نعمتیں عام کر دیتے ہیں لیکن شرط وہی ہے۔ اصول ایک ہی ہے۔ اگر اطاعت نہیں کریں گے تو ہماری طرف سے ان پر دردناک عذاب آئے گا۔ یہ صورت حال سامنے رہے کہ طوفان نوح میں ہلاک ہونے والی بھی ہماری مخلوق تھی۔ میں نے انہیں پیدا کیا، رزق دیا، اولادیں دیں، دولت دی، امراء اور سردار بنایا۔ جب انہوں نے نافرمانی کی تو غرق ہو کر تباہ ہو گئے اور آخرت کے عذاب میں گرفتار ہو گئے لہٰذا یہ اصول یاد رہے کہ آپؑ پر بھی نعمتیں عام ہوں گی۔ مال و دولت کی فراوانی ہوگی۔ آپؑ کی اولاد پھلے پھولے گی۔ ان کی اولاد در اولاد ہوگی۔ گھر بار، قوت و طاقت، سرداری اور عہدے ہوں گے لیکن اگر یہ لوگ اطاعت نہیں گے اور نافرمانی کریں گے تو بالآخر عذاب کا شکار ہو جائیں گے۔

فرمایا: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ یہ ساری باتیں غیب کی باتیں ہیں۔ نوحؑ کو گزرے مدت ہو گئی۔ کوئی بتانے والا نہیں۔ کوئی جانتا نہیں۔ کسی کتاب اور کسی تاریخ میں یہ قصہ موجود نہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قصہ گو سے کچھ سنا نہیں، کسی مدرس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ کسی انسان سے کچھ سیکھا نہیں۔ تو یہ ساری باتیں غیب کی باتیں ہیں جو اللہ نے بتائیں اور نُوْحِیْهَآ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا اور نزول قرآن سے پہلے ان سارے حقائق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے خبر تھے اور آپ ﷺ کی پوری قوم کو بھی ان حالات کا علم نہیں تھا۔ قرآن حکیم کے نزول سے یہ تمام باتیں معلوم ہوئیں۔

یہ آیہء مبارکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے کہ سارے حقائق اللہ کریم کی طرف سے بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہزاروں برس پہلے کے گزرے ہوئے واقعات کو عین حقیقت کے مطابق بغیر کمی بیشی کے ٹھیک ٹھیک بیان فرما رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون بتا رہا

ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کا ذریعہ کیا ہے؟ اللہ وحدہٗ لاشریک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی وحی آتی ہے اور یہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری باتیں بتاتی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیا کو بتا رہے ہیں۔ قیامت تک آنے والے لوگوں تک یہ بات پہنچتی جائے گی۔ فَاصْبِرْ سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبر کریں۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوحؑ کا قصہ سنایا گیا۔ نوحؑ نو سو پچاس برس تبلیغ فرماتے رہے اور اتنے ہی برس آپؑ کی مخالفت ہوتی رہی۔ چند غریب، مفلس اور بے کس لوگ آپؑ پر ایمان لائے۔ سردار اور اُمراء ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ ایذائیں دیتے رہے لیکن آپؑ نے صبر کیا۔ یعنی اللہ کی اطاعت پر قائم رہ کر سب کچھ برداشت فرمایا، اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بھی صبر فرمایئے اس لیے کہ پرہیز گاروں کا انجام ہی بھلا ہے۔

کامیابی پرہیز گاروں کا حصہ ہے:

فرمایا، اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٩﴾ یہ یقینی بات ہے کہ انجام کار پرہیز گار ہی کامیاب ہوں گے۔ دنیا میں کتنے ہی انقلابات آ جائیں۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں لے لے۔ کتنے ہی لوگ اقتدار میں آئیں اور کتنے ہی اقتدار سے باہر جائیں۔ کچھ بھی ہو۔ آخر کامیابی ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ جن کا اللہ سے تعلق ہوتا ہے۔ جو اللہ کے حضور کھڑے رہتے ہیں۔ جو تقویٰ اور پرہیز گاری کرتے ہیں۔ پرہیز گاری تو اللہ کی رضا پر راضی ہونے کا نام ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی پانچ نمازیں پڑھنا شروع کر دے تو سمجھتا ہے کہ وہ اتنا نیک اور پارسا ہو گیا ہے کہ اب دنیا میں وہ ہونا چاہیے جو وہ چاہتا ہے۔ جو عبادت کرتا ہے وہ تو اللہ کا بندہ بنتا ہے۔

یہ منصب تو رب العالمین کا ہے کہ جو چاہے وہ ہو جائے بندے کا نہیں ہے۔ اگر کسی کو پارسائی نصیب ہے تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسے اللہ نے ہدایت عطا کر دی اللہ کا احسان ہے کہ توبہ کی توفیق دے دی اور اسی حیاتِ مستعار میں دے دی ورنہ مرنے کے بعد تو کافر بھی پکاریں گے کہ اللہ ہم توبہ کرتے ہیں ایک مرتبہ پھر ہمیں دینا میں بھیج پھر دیکھ، ہم تیری کتنی اطاعت کرتے ہیں۔

فرمایا، میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ صبر کیجیے کہ یقیناً آخر کار بھلائی اور کامیابی پرہیز گار کا حصہ ہے۔

سورۃ ھود رکوع 5 آیات 50 تا 60

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝٥٠ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى الَّذِىْ فَطَرَنِىْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٥١ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝٥٢ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِىْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝٥٣ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّىْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْۤا اَنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝٥٤ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِىْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝٥٥ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٥٦ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّىْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ حَفِيْظٌ ۝٥٧ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝٥٨ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝٥٩ وَاُتْبِعُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝٦٠

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ھود (علیہ السلام) کو (بھیجا) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں تم (شرک کر کے) محض بہتان باندھتے ہو ﴿۵۰﴾ اے میری قوم! میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا صلہ تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا فرمایا پھر تم کیوں نہیں سمجھتے ﴿۵۱﴾ اور اے میری قوم! اپنے پروردگار (اللہ) سے بخشش مانگو پھر اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور تم کو طاقت دے کر تمہاری طاقت بڑھادے گا اور گناہگار بن کر روگردانی نہ کرو ﴿۵۲﴾ انہوں نے کہا اے ھود (علیہ السلام)! تم ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل نہیں لائے اور صرف تمہارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہی ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں ﴿۵۳﴾ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تم کو خرابی (آسیب وغیرہ) میں مبتلا کر دیا ہے انہوں نے فرمایا بے شک میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو (جن کی تم) اس کے علاوہ (پوجا کرتے ہو) ﴿۵۴﴾ پس تم سب مل کر میرے بارے میں (جو) تدبیر (کرنا چاہتے ہو) کرو پھر مجھے مہلت نہ دو ﴿۵۵﴾ بے شک میں نے اللہ پر بھروسہ کیا جو میرا پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں ان کی چوٹی اس نے پکڑ رکھی ہے۔ یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے ﴿۵۶﴾ پھر اگر تم روگردانی کرو گے تو جو پیغام مجھ کو دے کر تمہاری طرف بھیجا گیا تھا تو یقیناً وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ اور میرا پروردگار تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو (زمین میں) بسا دے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے ﴿۵۷﴾ اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے ھود (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ساتھ اہل ایمان تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور ہم نے ان کو ایک سخت عذاب سے نجات دی ﴿۵۸﴾ اور یہ (قوم) عاد تھی جنہوں نے (جان بوجھ کر) اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا

اور اسکے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو جابر (ظالم اور) ضدی تھے ﴿۵۹﴾ اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (رہے گی) دیکھو! بے شک عاد نے اپنے پروردگار سے کفر کیا۔ خوب سن لو! رحمت سے دوری ہوئی عاد کو جو ھود (علیہ السلام) کی قوم تھی ﴿۶۰﴾

تفسیر و معارف

فرمایا، وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ اسی طرح ہم نے قوم عاد کی طرف انہی کے بھائی حضرت ہودؑ کو معبوث فرمایا۔ یہاں لفظ اَخَاهُمْ سے مراد دینی برادری نہیں ہے کہ کافر اور مومن میں دینی برداری یا اخوت نہیں ہوتی۔ اس سے مراد ہے کہ آپؑ ان کے قومی بھائی تھے ان کے قبیلے سے تھے۔

قوم عاد کے افراد بہت قد آور، بہت طاقت ور اور بڑے شہ زور تھے۔ وہ بڑے بڑے درختوں کو گاجر مولی کی طرح اکھیڑ لیتے۔ پہاڑوں کو تراش کر عمدہ گھر بناتے۔ آج بھی دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ پورا پہاڑ ایک چٹان ہے اور اس میں دو منزلہ گھر بنے ہوئے ہیں۔ ان کے برآمدے اور ستون اتنی صفائی سے تراشے ہوئے ہیں کہ گویا کسی مشین نے تراشا ہو۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ کوئی مشین بھی اتنا اچھا نہیں تراش سکتی۔ یہ بڑے ذہین، بڑے کاریگر اور بہت طاقتور تھے۔ اسی طاقت کے نشے میں عظمتِ الٰہی کو بھول گئے تو اللہ کریم نے انہی کے قومی بھائی حضرت ہودؑ کو قوم عاد کی طرف بھیجا۔

آپؑ نے فرمایا، قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اللہ سے اُمید رکھو، اللہ سے ڈرو، اللہ کی نافرمانی پر اللہ سے خوف کرو۔ ہر چیز کے ملنے کی امید صرف اللہ سے رکھو۔ اسی کو اپنا حاجت روا سمجھو۔ وہی مشکل کشا ہے۔ وہی تمام ضرورتیں پوری کرنے والا ہے۔ وہی تمہارا رب ہے۔ اسی کو رب سمجھو۔ عبادت صرف اللہ واحد و لاشریک کا حق ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اس بات کو اس انداز میں فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ: 21)

اے لوگو! اللہ کی عبادت کرو کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی پیدا فرمایا۔

اللہ کریم اگر عبادت پر اجر دیتا ہے یا آخرت میں عطا فرمائے گا تو یہ اس کا انعام ہے۔ بندے پر اللہ کا حق ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔ اس لیے کہ اس کا اجر تو بندہ پہلے لے چکا ہے۔ فرمایا اللہ کی عبادت اس لیے کرو کہ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ عبادت کی یہ اجرت تم پیشگی وصول کر چکے ہو۔ اگر وہ پیدا نہ فرماتا تو تم کہاں ہوتے۔ پھر اپنے وجود کو دیکھو۔ اللہ نے اس میں کتنے کمالات رکھے ہیں۔ ایک ایک ذرّے کو جوڑ کر، ترتیب دے کر کیسا نازک اور پیچیدہ نظام بنایا ہے۔ سماعت، بصارت، نظام ہضم کس طرح اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

پھر ان نعمتوں کو دیکھو جن پر تمہیں ناز ہے۔ اولاد، گھر بار، دولت، عہدہ، علم، مقام و مرتبہ۔ جس کسی کے پاس جو کچھ ہے اس نے کہاں سے لیا؟ سب کے پاس جو کچھ ہے رب العالمین کی عطا ہے۔ اب اس کے مطابق اس کا شکر بھی ادا کرو۔ رہی آخرت تو آخرت اس کا انعام ہے۔ تمہاری مزدوری پر نہیں دے گا اپنی شان کے مطابق انعام عطا فرمائے گا۔ زندگی میں تم جتنی بھی عبادت کرلو اس سے زیادہ اجرت تم لے چکے ہو۔ لہٰذا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے جس کی عبادت کی جائے۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ۝۵۰ تم نے شرکیہ عقائد بنا رکھے ہیں جو فرضی معبود اور پروردگار بنا رکھے ہیں۔ یہ سب اللہ پر بہتان باندھا ہوا ہے۔ تمہارے یہ فرضی عقائد و نظریات کسی الہامی کتاب میں، کسی نبیؑ کے پیغام میں نہیں ہیں۔ یہ تم نے اللہ پر جھوٹ باندھ رکھا ہے۔ اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں کہ وہ دوسروں کی حاجت روائی کرے۔ اگر کوئی اور حاجت روا ہوتا تو وہ بھی عبادت کا مستحق ہوتا۔ ساری کائنات کے ذرّے ذرّے کا حاجت روا وہ خود ہے۔ پھر آپؑ نے وہی بات دہرائی جو ہرؑ رسول فرماتے رہے ہیں۔ فرمایا، یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝۵۱

صداقت پیغمبرؑ پر دلیل:

یہ بات تو عقلاً سمجھ آجاتی ہے کہ کوئی شخص بھی جان جوکھوں میں ڈال کر کوئی کام کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اقتدار چاہتا ہے، دولت جمع کرنا چاہتا ہے یا کوئی دنیوی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فرمایا، میں نے تو تمہاری جیسی زور آور قوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقیقت بیان کی ہے۔ اور تمہارے بھلے کے لیے بیان کی ہے۔ میرا کوئی ذاتی مفاد اس سے وابستہ نہیں۔ نہ میں نے تم سے اقتدار کا مطالبہ کیا، نہ دولت کا تو سوچو میری اس محنت و مشقت کی مزدوری کون دے گا؟ فرمایا، وہ دے گا جس کے لیے میں کام کر رہا ہوں۔ یہ میری صداقت پر دلیل ہے کہ میں اللہ کا نبیؑ ہوں اور اللہ کے لیے سب مشقت برداشت کر رہا ہوں۔

اللہ کے کسی نبیؑ ورسولؑ نے اپنے مخاطبین سے کبھی کوئی اجر طلب نہیں فرمایا نہ اس کی لوگوں سے کبھی توقع رکھی۔ فرمایا، میرا اجر اس ذات پر ہے جس نے مجھے پیدا فرمایا، مجھے نبوت سے سرفراز فرمایا تو میرا اجر اس پر ہے جس کے دین کی سرفرازی کے لیے میں محنت کر رہا ہوں۔ اگر مجھے اقتدار کی خواہش ہوتی تو میں تم سے کہتا کہ مجھے حکمران بنادو۔ مجھے دولت کی خواہش ہوتی تو میں تم سے چندے لیتا۔ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ میں نے تم سے اس تبلیغ کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ میرا معاوضہ اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ توتم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔

علماء وپیروں کے لیے راہ عمل:

علماء حضرات اور پیر صاحبان کے لیے بھی اس آیہ مبارکہ میں راہ عمل واضح کر دی گئی ہے کہ ان کے پاس جو آتا ہے وہ اللہ کا بندہ ہے۔ وہ نیکی سیکھنے آتا ہے۔ اسے سکھانا ان پر فرض ہے اور اس پر معاوضہ لینا جائز نہیں۔ کام اللہ کا ہے معاوضہ بھی وہی دے گا۔ انبیاءؑ نے اپنی تبلیغ پر کوئی معاوضہ نہ لیا نہ کسی سے لینے کی توقع رکھی۔ علماء اور پیر بااتباع نبیؑ اسی روش پر چلنے کے پابند ہیں۔ لہٰذا کسی پیر، کسی مولوی کو کسی بندے سے ایسی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ اس شرط پر تعلیم دینا کہ تم مجھے کچھ دوگے تو میں تمہیں سکھاتا ہوں۔ یہ ناجائز ہے۔ دین کا کام اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔

جو لوگ علماء اور پیر صاحبان کی از خود خدمت کرتے ہیں تو وہ بھی اللہ کی رضا کے لیے کریں۔ اللہ انہیں اجر دے گا۔ ان کی نیت بھی خالص رضائے الٰہی کی ہو نہ کہ خود کو نمایاں کرنے یا کسی اور مقصد کے حصول کے لیے ہو۔

پیر صاحبان اور علماء حضرات کو چاہیے کہ وہ اس میں تفریق نہ کریں کہ کس نے تحفہ دیا اور کس نے نہیں دیا بلکہ بہتر ہے کہ شیخ کو پتہ ہی نہ ہو کہ کسی نے کچھ دیا ہے یا نہیں دیا۔ اسے پتہ کرنا بھی نہیں چاہیے جو دیتا ہے وہ اللہ کو دیتا ہے۔ اللہ اسے اجر دے گا۔ اور جو نہیں دیتا اس کا بھی اتنا ہی حق ہے کہ اس کی ویسی ہی تربیت کی جائے۔ اس کو ویسی ہی سہولیات ملیں اور اس کا عزت واحترام بھی ویسا ہی ہو ان کے صدق وخلوص اور للّٰہیت کا یہی تقاضا ہے۔

ہر مصیبت کا علاج:

حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے فرمایا،

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ اے میری قوم! اپنے رب سے مغفرت طلب کرو۔ آج تک جو گناہ کر چکے ہو ان سب کی معافی مانگو ثُمَّ تُوْبُوْٓا پھر توبہ کرو یعنی یہ وعدہ کرو کہ آئندہ اس طرح کے کام نہیں کروگے۔ جو ہو چکا اس کا علاج استغفار ہے۔ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اس کا فائدہ تمہیں دنیا میں یہ ہوگا کہ تم پر آسمانوں سے بارشیں

برسیں گی وَّیَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ اور تمہاری دنیاوی طاقت بھی بڑھ جائے گی۔ اللہ کریم کی مغفرت طلب کرنا، رحمت الٰہی کے حصول کا سبب ہے۔ آسمانوں سے بارشیں برسنا، زمین سے پیداوار اگنا دنیاوی قوت کو بڑھائے گا۔ اللہ اپنی رحمت سے تمہیں اولاد سے، مال و دولت اور اقتدار سے بھی نوازے گا۔ اور فرمایا، میری قوم! لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ اور گناہگار بن کر اللہ کی بارگاہ سے روگردانی نہ کرو۔ تو استغفار پڑھنا ہر مصیبت کا علاج ہے۔ سب سے بڑی مصیبت اللہ کی نافرمانی ہے۔ اگر بندہ استغفار پڑھتا رہے تو اللہ کریم اسے گناہوں سے بچنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ آخرت بھی بنتی ہے اور دنیاوی برکات بھی نصیب ہوتی ہیں۔

استغفار نہ کرنا یا اللہ کریم سے مغفرت نہ چاہنا اپنی بڑائی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اپنی بڑائی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی بندہ بڑائی کا مستحق نہیں۔ سارے بندے عاجز اور اللہ کے سامنے محتاج ہیں۔

ہودؑ نے تو انہیں بہت کارگر نسخہ بتایا کہ گناہوں سے توبہ کرو، استغفار کرو، رجوع الی اللہ کرو، اللہ سے مغفرت چاہو تو تمہارے دو عالم سنور جائیں گے۔ اللہ کریم تم پر دنیا کی نعمتیں بھی عام کر دے گا، تمہاری طاقت بھی بڑھا دے گا، مال و اولاد بھی دے گا اور تمہاری آخرت بھی سنور جائے گی۔ تو قوم نے کہا قَالُوْا یٰھُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَۃٍ آپ (علیہ السلام) کے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ آپ ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں لائے۔ ایک ہی دلیل دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی (علیہ السلام) ہیں اس لیے ہم آپ کی بات مان لیں تو یہ دلیل نہیں۔ ہم آپ کی بات کیوں مانیں۔

نبیؑ کی نبوت پر دلیل نبیؑ کی زندگی ہے:

نبیؑ کی پوری زندگی نبیؑ کی صداقت پر گواہ ہوتی ہے۔ قبل از بعثت کا وقت جو انبیاءؑ گزارتے ہیں وہ ان کی نبوت کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ نبیؑ ہمیشہ صادق اور امین ہوتے ہیں۔ نبیؑ سے پوری زندگی کسی پر جھوٹ ثابت نہیں ہوتا تو وہ خالق پر جھوٹ کیسے بولے گا۔ لیکن انہیں یہ دلائل نہیں چاہیے تھے۔ انہیں تو شعبدہ بازی چاہیے تھی۔

انسانی مزاج جب مسخ ہوتا ہے تو شعبدہ بازوں کو صاحب کمال سمجھا جاتا ہے۔ شعبدہ باز ان کے سامنے کچھ ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں محض نظر کا دھوکہ اور ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔ انہیں وہ دلائل سمجھتے ہیں اور اس شخص کو صاحب کمال۔

نبیؑ اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے اللہ کریم معجزہ عطا فرما دیتے ہیں۔ یہ اللہ کریم کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ نبیؑ کا معجزہ باطل کے مقابلے میں حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صحیح متبع ولی کہلاتا ہے۔ وہ محیر العقول کام جو اس سے صادر ہوتا ہے کرامت کہلاتا ہے اور اس کا ظہور بھی دین کے اثبات کے لیے ہوتا ہے۔

جہلاء تو ولی کی کرامت یہی سمجھتے ہیں کہ فلاں بزرگ کے پاس گئے تو اولاد ہوگئی، فلاں کے پاس گئے تو بیماری ٹھیک ہوگئی۔ حالانکہ یہ تو محض اللہ کا کرم ہے۔ اس کا اپنا نظام ہے صحت اور بیماری اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ بیماری بھی خود ہی بھیجتا ہے، صحت بھی خود دیتا ہے۔

نبی علیہ السلام دین جیسی نعمت لاتے ہیں انؐ سے دین سیکھنا ہے۔ اللہ کے ولی سے حقائق جاننے چاہیں۔ اپنے یقین میں پختگی لانی چاہیے۔ انسانی زندگی بہت قیمتی ہے۔ جب جانے لگتی ہے تو ساری دنیا بھی دے دیں تو ایک لمحہ نہیں خرید سکتے۔ اور یہ ایک ہی بار ملتی ہے۔ دوبارہ کسی کو نہیں ملتی اس میں یہ جاننا چاہیے کہ اس زندگی کی حقیقت کیا ہے، یہ ختم ہوگی تو کیا ہوگا، موت کیا ہے، موت کے بعد کیا ہونے والا ہے، آخرت کیا ہے، اللہ جل شانہٗ کی صفات کیسی ہیں، وہ اپنے بندوں کے ساتھ کیسا معاملہ فرمائے گا۔ یہ سب کچھ پردۂ غیب میں ہے اور یہ حقائق صرف نبیؐ بیان کرتے ہیں نبیؐ کی نبوت پر دلیل انؐ کا وہ پیغام ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ جس میں ان حقائق کا علم ہوتا ہے۔ صرف نبیؐ ہی بتا سکتے ہیں کہ آخرت میں انسانوں کے اعمال پر کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ آخرت تو پردۂ غیب میں ہے لیکن اس کا مدار اس دنیا کی زندگی کے اعمال پر ہے۔ یہاں ایک ایک جملہ محفوظ ہو رہا ہے۔ دل پر گزرنے والی ایک، ایک کیفیت درج ہو رہی ہے۔ ہم کسی کے لیے دل سے خوش ہوتے ہیں یا اس کا نفع چاہتے ہیں یا کسی کے لیے دل میں میل رکھتے ہیں اور اس کا نقصان چاہتے ہیں تو وہ بھی لکھا جا رہا ہے۔ اس سب کا حساب ہوگا اور اس کے مطابق اجر ملے گا۔ ان حقائق سے دنیا میں آگاہ کر دینا صرف نبیؐ کا کام ہے کہ نبیؐ پر وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان یا فلسفی یہ نہیں بتا سکتا۔ یہ علوم الٰہیات ہیں یہ اللہ اپنے نبیؐ کو عطا فرماتا ہے۔

ولی اللہ وہ ہے جو نبیؐ کے خزانہ کا وارث ہے۔ جو نبی علیہ السلام کی بات کو، برکات کو دیانتداری کے ساتھ، پورے خلوص کے ساتھ لوگوں تک پہنچائے۔ ولی کی کرامت بھی احقاقِ حق کے لیے ہوتی ہے لیکن لوگوں کی عادت ہے کہ اللہ کے کام کو دوسروں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ کوئی فرشتوں کو معبود بنا لیتا ہے، کوئی سورج، چاند ستاروں کی، حتیٰ کہ جنوں کی پوجا شروع کر دیتا ہے۔ اور انسان یہ غلطی اس وقت کرتا ہے جب وہ آخرت کے بجائے دنیا کو مقدم سمجھنے لگتا ہے۔ اخروی نجات کو چھوڑ کر دنیوی مفادات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے ارشادِ پاک مفہوم ہے کہ دانا وہ ہے جسے ہمہ وقت موت کا خیال رہتا ہے موت یاد رہے تو بندہ موت کے لیے تیاری بھی کرتا رہتا ہے۔

ہودؑ کی قوم نے آپؑ کے واضح دلائل کو دلائل ماننے سے ہی انکار کردیا اور کہنے لگے ہم نے تو آپ میں کوئی عجیب وغریب باتیں نہیں دیکھیں کہ ہم آپ (علیہ السلام) کی بات مان لیں۔ آپ (علیہ السلام) کہتے ہیں اللہ واحد ہے، لاشریک ہے۔ اللہ کی عبادت کرو۔ ہر چیز اللہ سے مانگو لیکن ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ ہم نسلوں سے بتوں کی پوجا کرتے آرہے ہیں اور یہی ہماری ضرورتیں پوری کرتے آرہے ہیں اور ہمارے پاس مال اور اولاد ہے۔ ہم اتنے طاقتور ہیں کہ بڑے بڑے پہاڑوں کو کاٹ کر گھر بنالیتے ہیں تو آپ کی دلیل تو کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ہم تو چڑھاوے چڑھاتے ہیں تو ہمارے معبودان ہماری مشکلیں حل کردیتے ہیں۔ آپ نے تو ایسی کوئی بات ہی نہیں کہی۔ تو یہ کوئی دلیل نہ ہوئی۔ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴿۵۳﴾ آپ (علیہ السلام) کے کہنے پر ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ آپ (علیہ السلام) کے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور جب ان کو نہیں چھوڑنا تو آپؑ پر ایمان لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بنیادی غلطی:

ان کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ ان کے سامنے امور دنیا تھے جن کو وہ مختلف معبودوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اللہ نبی علیہ السلام کے سامنے آخرت تھی اور آپؑ انہیں حقیقی زندگی کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دے رہے تھے۔ اللہ ہی سے مانگنے کی دعوت دے رہے تھے کہ رب العالمین صرف اللہ ہے۔ وہی تمہارے سب کام کرتا ہے اور تم انہیں بتوں کی طرف منسوب کردیتے ہو۔ لیکن انہیں اپنے معبودان باطلہ عزیز تھے وہ کہتے تھے کہ ہمارے باپ دادا سے یہی پوجا پاٹ چل رہی ہے۔ ہمارے معبودان کی وجہ سے ہمارے سارے کام ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے پاس کاروبار ہے، حکومت واقتدار ہے، مال ودولت اور اولاد ہے تو ہمارے سارے کام یہ بت ہی کررہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی توحید ایسی صفت ہے کہ جس کو مانے بغیر اللہ کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ یعنی وہ واحد ہے، لاشریک ہے، کوئی دوسرا اس جیسا نہیں۔ وہ خالق ہے باقی سب مخلوق۔ لیکن یہ کہنا آسان ہے ماننا اتنا آسان نہیں۔ آج کے کلمہ گو جو باپ دادا سے کلمہ پڑھتے چلے آرہے ہیں کہتے ہیں اللہ واحد لاشریک ہے لیکن میرا یہ کام فلاں حضرت کی وجہ سے ہوا۔ کیسی عجیب سوچ ہے۔ پیر اور حضرت اس لیے نہیں ہوتے۔ اگر کوئی واقعی پیر ہے تو ہمارے سینوں میں وہ انوارات وکیفیات منتقل کرے جو نبی کریم ﷺ نے عطا فرمائے اور اگر یہ نہیں تو دنیوی کام تو اللہ کے نظام کے تحت سب کے ہوتے رہتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کے بھی بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ روزانہ کی روزی

جانوروں، پرندوں، اور کائنات بھر کی ساری مخلوق کو ملتی رہتی ہے۔ جو کائنات کا مالک ہے وہ سب کو رزق پہنچا رہا ہے۔ پھر کلمہ گو کیسے اسے پیر سے منسوب کرتے ہیں!

قوم عاد تو تھے ہی کافر وہ توحید کو کیسے سمجھتے۔ انہوں نے کہا آپ تو بے بنیاد باتیں کرتے ہیں لہٰذا ہم اپنے معبودوں کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور آپ (علیہ السلام) پر ایمان بھی نہیں لائیں گے۔ اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىكَ بَعۡضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوۡٓءٍ ؕ چونکہ آپ (علیہ السلام) ہمارے معبودان (باطلہ) کے خلاف باتیں کرتے ہیں لہٰذا انہوں نے آپ کو پاگل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے آپ ایسی باتیں کرتے ہیں جن کی سمجھ نہیں آتی۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بعض معبودوں نے آپ (علیہ السلام) کو کوئی جن وغیرہ چمٹا دیا ہے اور آپ کو بیمار کر دیا ہے۔ ہودؑ نے فرمایا، قَالَ اِنِّىۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ۝ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں جو ہر وقت ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے تم آج نہیں مانتے ہو لیکن فرداء قیامت تمہیں بھی اسی کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ اور تم ابھی اسی کو گواہ کر لو۔ یہ اعلان تو تم نے کر دیا کہ مجھ پر ایمان نہیں لاؤ گے تو میرا اعلان بھی سن لو کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں اور تم سے الگ ہوں۔

تم بڑے جوان، مضبوط اور طاقتور ہو اور کہتے ہو کہ تمہارے بتوں میں بھی بڑی طاقت ہے وہ تمہارا ہر کام کر دیتے ہیں تو پھر ایسا کرو مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِيۡدُوۡنِىۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ۝ کہ تم اور تمہارے سارے بُت اکٹھے ہو جاؤ اور میرا جو بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو۔ جو کر سکتے ہو کر گزرو، کوئی کسر نہ چھوڑو، کوئی رعایت نہ کرو۔ اگر تم اور تمہارے معبود سچے ہو تو تم سے جو ہو سکتا ہے وہ کر لو میرا کچھ بگاڑ کر دکھاؤ میں اکیلا نہیں ہوں اِنِّىۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىۡ وَرَبِّكُمۡ ؕ میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا پروردگار ہے۔ میرا پالنہار ہے۔ مجھے پیدا کرنے والا میرا خالق اور میرا رب ہے اور رب تو تمہارا بھی وہی ہے لیکن تم مان کر نہیں دے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں اسی نے پیدا کیا، وہی روزی دے رہا ہے، صحت و طاقت اسی نے دے رکھی ہے۔ جو کمالات تمہارے پاس ہیں سب اسی کے دیے ہوئے ہیں اور یہ بھی یاد رکھو مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ زمین پر حرکت کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی چوٹی اس کی مٹھی میں نہ ہو۔ یعنی جس پر اس کا کُلّی اختیار نہ ہو۔ ہر چیز پر، ہر جاندار پر اس کا کُلّی طور پر اختیار ہے۔ ہر چیز اس کے قبضہء قدرت میں ہے اِنَّ رَبِّىۡ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝ یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔ یعنی تم اللہ کے سیدھے راستے پر چلو گے۔ انبیاءؑ کی اطاعت اور اتباع کرو گے تو ربّ کو پا سکو گے۔ باطل عقائد اور باطل اعمال کی وجہ سے تم اللہ پر ایمان نہیں لا سکتے۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖۤ اِلَيۡكُمۡ ؕ اور اگر تم میری بات سے روگردانی کرتے ہو

اور میری بات قبول نہیں کرتے تو جو پیغام دے کر میرے پروردگار نے مجھے تمہاری طرف بھیجا تھا وہ پیغام میں نے من وعن تم تک پہنچا دیا۔ میری ذمہ داری اتنی ہی تھی۔ اب اگر تم نہیں مانو گے وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ تو اللہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ تمہاری جگہ کوئی اور قوم پیدا کر دے گا جو زمین پر آباد ہوگی۔ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا اور تم اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ تمہاری کیا حیثیت ہے۔ تم اللہ کی بارگاہ میں کیا دم مارو گے وہ تمہیں تباہ کر دے گا اور تمہارا نشان باقی نہ رہے گا۔ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ اور میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے، حفاظت کرنے والا ہے۔ یہ جو تم اب تک زندہ سلامت پھر رہے ہو، تمہارے اعضاء میں جو قوت ہے، حکومت واقتدار بنائے بیٹھے ہو، مال ودولت جو تمہیں ملی ہوئی ہے۔ یہ سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اسی نے تمہیں یہ سب کچھ دے رکھا ہے۔ اس کی نگرانی سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اگر تم اس کے نبیؑ کے ساتھ مقابلہ کرو گے تو اللہ کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور کہیں بھاگ نہ سکو گے۔ لیکن۔ انہوں نے یہ سب کچھ نہ مانا۔

جب کوئی قوم یا کوئی فرد کُھلی طور پر کُھل کر نبیؑ کے مقابلے پر آ جائے تو پھر وہ نہیں بچتا اور تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا پھر ان پر اللہ کا حکم عذاب آن پہنچا۔ ارشاد باری ہے۔ ہم نے ان پر عذاب بھیج دیا اور ایسا عذاب بھیجا کہ ہفتہ بھر تیز ہوائیں چلتی رہیں۔ اور اس قدر تیز تھیں کہ نوے نوے فٹ قد کے لوگوں کو زمین سے اٹھاتیں اور پٹخ دیتیں۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ فضائے آسمانی انسانی چیخوں سے بھر گئی تھی۔ ہوا انہیں اڑا کر اوپر لے جاتی فضا میں چیختے چلاتے پھر، انہیں اس زور سے پٹختی کہ وجود ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ پوری بستی پر آٹھ رات دن اسی تیزی سے ہوا چلتی رہی اس نے ایک ایک چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ سوائے ایمان والوں کے کوئی جاندار نہ بچا۔ یہ اللہ کریم کی قدرت ہے کہ جو ہوا ساری آبادی کو تباہ کر رہی تھی اُن کے لیے باد بہاری بنی ہوئی تھی۔ جو باقی ساری قوم کے لیے موت اور تباہی کا سبب بنی ہوئی تھی وہی ہوا ان کے لیے زندگی کا سبب تھی۔ فرمایا، نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ ہم نے ہودؑ کو نجات دی اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے ان کو بھی نجات دی۔

اس آیہء مبارکہ میں بہت غور طلب نکتہ ہے اور ایمان والوں کے لیے رحمت کی بشارت ہے۔ یہ فرمانا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کافی نہیں تھا کہ جو ان پر ایمان لائے انہیں بھی نجات دی لیکن اللہ کریم نے آگے مَعَهٗ فرما کر تصریح فرما دی کہ جو آپؑ کے ساتھ رہے، ایک ایک کام میں آپ کا اتباع کیا۔ اٰمَنُوْا کے ساتھ مَعَهٗ فرما کر معیت کی قید لگائی کہ ہر خیال ہر فکر، ہر عمل میں ان لوگوں نے نبیؑ کا ساتھ دیا۔ ایمان لانے کا تو مفہوم ہی یہی ہے کہ تہہ دل سے ہر قدم پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع کیا جائے۔ عقیدہ ونظریہ سے لے کر کردار وگفتار اور حُلیے تک نبیؑ کے ساتھ

ہوجائے، دین کے سانچے میں ڈھل جائے۔

فرمایا، ہم نے ہودؑ کو اپنی رحمت سے محفوظ رکھا اور ان پر بھی رحمت کی جو انؑ کے ساتھ تھے وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾ اور ہم نے ان کو بڑے سخت عذاب سے نجات دی، محفوظ رکھا۔

تِلْكَ عَادٌ ۟ اور یہ تھی قوم عاد۔ بڑے قد آور، بڑے طاقتور۔ بڑی بڑی چٹانوں کو تراش کر عظیم الشان عمارتیں بنانے والے، بڑے مالدار، بڑے بااثر اور صاحبِ اقتدار۔ جنہوں نے جان بوجھ کر اللہ کی آیتوں کا انکار کیا۔ فرمایا جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ جانتے بوجھتے انکار کیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ سچائی اللہ کے نبیؑ کے پاس ہے لیکن یہ آخرت کے بجائے دنیا کی محبت میں گرفتار تھے۔ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ اور انہوں نے انبیاءؑ کا انکار کیا، نافرمانی کی۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ اور ہر جابر، ظالم اور ضدی کی پیروی کرتے رہے۔ یہ حق جاننے کے باوجود بے دینوں، بدکاروں، دولت مندوں اور مقتدر لوگوں کے پیچھے چلتے تھے تاکہ ان کو دنیوی مفادات حاصل ہوتے رہیں کہ فلاں کے پاس حکومت ہے اس سے فائدہ ہوجائے گا، فلاں کے پاس عہدہ ہے، فلاں بااثر ہے اس کی پیروی کروں تو یہ فائدہ ہوگا۔ اس کی مہربانی سے وقت اچھا گزر جائے گا، اس کے ساتھ رہوں گا تو دنیا میں بڑی عزت ہوگی۔ ان معمولی معمولی دنیوی مفادات کے حصول کے لیے انہوں نے انبیاءؑ کا انکار کیا۔

انسان تو سارے ایک جیسے ہیں۔ اس زمانے کے لوگ بھی انسانی صفات کے مالک تھے، ویسی ہی انسانی ضروریات رکھتے تھے جیسے آج ہیں۔ انسانی نفسیات بھی وہی ہے جو پہلے انسانوں کی تھی اسباب و ذرائع تبدیل ہو گئے ہیں حقائق نہیں بدلے۔ انسانی ضروریات وہی ہیں البتہ ان کی تکمیل کے طریقے بدل گئے ہیں لہٰذا مزاج انسانی آج بھی وہی ہے۔ آج بھی اللہ کے ایسے بندے موجود ہیں کہ نفع ہو یا نقصان وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع کرتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو طاقتوروں، مقتدروں، حکمرانوں، ظالموں جابروں کی اطاعت کرتے ہیں تاکہ دنیوی مفادات حاصل کرتے رہیں۔ فرمایا، جو قومیں ہلاک ہوئیں ان کا حال بھی یہی تھا کہ اپنے نبیؑ کی نافرمانی انہیں گوارا تھی لیکن امراء اور صاحب اقتدار لوگوں کے ساتھ چمٹے رہے خواہ وہ ظالم و جابر تھے۔ ظالم و جابر تو اپنے اقتدار کی خاطر نبیؑ کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ اپنی انا کی خاطر نہیں کرتے تھے کہ اگر نبیؑ کی اطاعت کی تو تو عام لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔ یہ انہیں گوارا نہیں تھا لہٰذا وہ اپنی ضد پہ اڑے رہے اور ان میں دوسرے وہ تھے جن کا مطمع نظر اور مقصود محض دنیا تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دنیا میں بھی ان پر اللہ کی لعنت پڑی۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ عذاب آئے۔ عذابوں میں گرفتار ہو کر تباہ ہو گئے اور قیامت کے دن بھی ان پر اللہ کی لعنت ہوگی۔ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا

رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾ اور خوب اچھی طرح سن لو! بے شک عاد نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا اور دور ہوگئی عاد اللہ کی رحمت سے۔ اللہ کے نبی ہودؑ ان میں مبعوث ہوئے۔ اگر یہ انؑ کا دامن تھام لیتے، آپؑ کی اطاعت کرتے تو آخرت بھی مل جاتی اور دنیا کی کیا حیثیت؟ دنیا تو کافر کو بھی ملی ہوئی ہے۔ مومن کو کیوں نہیں ملے گی۔

نبی کریم ﷺ کے ایک ارشادِ پاک کا مفہوم ہے کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیوی چیزوں کی قیمت مچھر کے ایک پَر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو ہرگز نہ دیتا۔ یہ ایسی بے قیمت چیز ہے کہ اللہ نے کافروں کے گھر بھی پھینک دی ہے۔ کافر کو بھی دے دی ہے۔ اصل بات آخرت کی ہے۔ اطاعت الٰہی، قرب الٰہی، اطاعت پیغمبرؑ کی ہے۔ اصل نعمت اطاعت الٰہی ہے۔ دنیا ایسی قیمتی نہیں یہ تو اس نے فرعون کو بھی دے رکھی تھی جو خود کو خدا کہتا تھا۔

اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ عاد نے اپنے پروردگار کی عظمت کا انکار کیا۔ اپنے ربّ کے ساتھ کفر کیا۔ خوب اچھی طرح سمجھ لو قوم عاد تباہ ہوگئی۔ ہودؑ کی قوم تھی لیکن نبیؑ کا اتباع نہ کر کے، دنیا کی خاطر نبیؑ کا دامن چھوڑ کر دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں تباہ ہوگئی۔

قوم عاد کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ اپنے نبیؑ کی تعلیمات کو چھوڑ کر ظالم اور ضدی لوگوں کو اتباع کرتے رہے۔ دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے قوم کے بڑے امراء، اعلیٰ عہدوں پر فائز کے پیچھے چل پڑے حالانکہ وہ امراء قوم سے دغا کرنے والے ان کا مال لوٹنے والے ظالم بدکار لوگ تھے۔ ساری گمراہی کی ابتداء اس بات سے ہوتی ہے کہ جب بندہ اپنی امیدیں اللہ کے علاوہ کسی اور سے وابستہ کر لیتا ہے کہ یہ میرے کام کر دے گا تو پھر اس کی منشا کے مطابق زندگی گزارتا ہے اللہ کے حکم کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا۔ یہ گمراہی عذاب الٰہی تک لے جاتی ہے۔

سورۃ ھود رکوع 6 آیات 61 تا 68

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو (بھیجا) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے کوئی تمہارا معبود نہیں اس نے تم کو زمین سے پیدا فرمایا اور اس میں تم کو آباد فرمایا پس اس سے بخشش طلب کرو (ایمان لاؤ) پھر اس کی طرف متوجہ رہو، بے شک میرا پروردگار قریب ہے قبول کرنے والا

ہے ﴿۶۱﴾ انہوں نے کہا اے صالح (علیہ السلام)! یقیناً اس سے پہلے ہم تم سے کئی امیدیں رکھتے تھے کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے منع کرتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں اور تم ہمیں جس بات کی طرف بلا رہے ہو یقیناً اس میں ہمیں شبہ ہے اس کی طرف دل نہیں مانتا ﴿۶۲﴾ انہوں نے فرمایا اے میری قوم! بھلا دیکھو تو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت (نبوت) عطا فرمائی ہو تو اگر میں اُس کی نافرمانی کروں پھر مجھے اللہ سے کون بچائے گا سو تم تو (کفر کی باتوں سے) میرا نقصان ہی بڑھاتے ہو ﴿۶۳﴾ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے معجزہ ہے پس اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور اس کو تم بری نیت کے ساتھ چھونا بھی مت پھر تم کو فوری عذاب آ پکڑے گا ﴿۶۴﴾ سو انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے تو (صالح علیہ السلام) نے فرمایا تم اپنے گھروں میں تین دن اور بسو یہ ایسا وعدہ ہے جس میں ذرا جھوٹ نہیں ﴿۶۵﴾ پس جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے صالح (علیہ السلام) اور جو اہلِ ایمان ان کے ساتھ تھے (سب کو) اپنی عنایت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے (محفوظ رکھا) بے شک آپ کا پروردگار بڑی قوت والا، غلبے والا ہے ﴿۶۶﴾ اور ظلم کرنے والوں کو چنگھاڑ نے آ پکڑا پس وہ صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ جیسے ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ خوب سن لو! یقیناً ثمود نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا۔ سن لو! ثمود کو پھٹکار (رحمت سے دوری) ہوئی ﴿۶۸﴾

تفسیر و معارف

عاد اور ثمود ایک قوم کی دو شاخیں تھیں۔ عاد پر ہوا کا عذاب آیا۔ کئی دن تک تیز ہوا چلتی رہتی، اٹھا، اٹھا کر پٹخ پٹخ کر مارے گئے اور تباہ ہو گئے۔ دوسری شاخ، ثمود کی طرف انہی کے قومی بھائی حضرت صالحؑ کو مبعوث فرمایا گیا۔

ارشاد باری ہے وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ صالح کا پیغام بھی وہی تھا کہ اے قوم! صرف اللہ کی عبادت کرو۔ کوئی دوسرا عبادت کا مستحق نہیں ہے۔

عبادت کیا ہے؟

نفع کی امید اور نقصان کے ڈر سے کسی کی اطاعت کرنا، یہی عبادت ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ صلوٰۃ ادا کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا، تلاوت کرنا یا ذکراذکار کرنا ہی عبادت ہے جبکہ یہ سب عبادت کی اقسام ہیں۔ عبادت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ نفع کی امید یا نقصان کے ڈر سے کسی کی اطاعت کی جائے۔ اگر وہ اللہ کی اطاعت ہو تو اللہ کی عبادت ہے۔ اللہ کریم کو چھوڑ کر کسی اور کی اطاعت کی جائے تو وہ اس کی عبادت ہے۔ اور صلوٰۃ وصوم، نماز روزہ یہ عبادت کی اقسام ہیں۔ اللہ نے صلوٰۃ مقرر کردی ہے۔ روزہ مقرر کردیا ہے۔ ان کے اپنے ثواب اور درجات ہیں تو ان کی کیفیات اور ان کے نتائج بھی ہیں۔ ان سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔ صلوٰۃ کردار کی اصلاح کرتی ہے۔ روزہ اوصاف ملکوتی پیدا کرتا ہے۔ فرشتوں جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ جتنے اوصاف ملکوتی آتے ہیں اتنی برائیاں، اتنی شیطنت انسان کے وجود سے دور ہوتی ہے۔ ہر عبادت پر انوار وتجلیات برستی ہیں تو ہر عبادت کا اپنا ایک حاصل بھی ہے۔ اللہ کا قرب تو مرکزی نقطہ ہے لیکن اس کا اثر دنیوی معاملات تک جاتا ہے۔ ہر عبادت کے صلے میں اصلاح نصیب ہوتی ہے لیکن اصل عبادت اللہ سے امیدیں رکھ کر اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پاک کا مفہوم ہے کہ مومن جو رزق کما کر لاتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو کھلاتا ہے تو وہ بھی اس کی طرف سے صدقہ شمار ہوتا ہے۔ گویا عبادت شمار ہوتی ہے۔ عرض کی گئی کہ اہل وعیال کی ذمہ داری پوری کرنا تو اس پر واجب ہے۔ فرمایا، جو اللہ کی طرف سے واجب ہوا سے پورا کرنا ہی عبادت ہے۔ اللہ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری پورا کرنے کا نام ہی عبادت ہے۔

صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو یہی پیغام دیا کہ اے میری قوم! اللہ پر یقین رکھو۔ اللہ پر اعتماد رکھو اور اپنی تمام امیدیں اللہ کریم سے وابستہ کرلو۔ ہر کام میں اللہ کریم کی اطاعت کرو اور غیر اللہ کی اطاعت چھوڑ دو۔ غیر اللہ کی اطاعت کیا ہے؟ بظاہر اللہ کا نام لینا اور عملاً ظالموں کی اطاعت کرنا غیر اللہ کی اطاعت ہے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ اللہ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔ فرمایا، هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ تم خاک کے منتشر ذرات تھے۔ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہارے ایک وجود کے لیے غذا کو کہاں، کہاں سے اکٹھا کیا۔ کسی ملک سے دوا، کسی علاقے سے غذا، دودھ، پھل، اناج، گوشت، سبزی، مصالحے سب کچھ ذرات کی

صورت میں تمہارے وجود تک پہنچایا۔ یہ اللہ کریم کا ترتیب دیا ہوا نظام ہے۔ سب مٹی کے مختلف رنگ ہیں۔ مٹی سے گھاس نکالی، گھاس کو جانور کا چارہ بنایا۔ اس سے انسان کے لیے دودھ اور گوشت فراہم کیا۔ نطفے سے قد آور جوان بننے تک تمہارے بدن کی تعمیر بھی کی اور وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا جس زمین سے تمہاری نشوونما کا سامان مہیا کیا اسی زمین پر تمہیں حقِ حکومت دے دیا۔ تم اس کا سینہ پھاڑ کر فصلیں اگاؤ، درخت لگاؤ، اس کے پتھر توڑ کر اپنے لیے مکان اور محلات بناؤ۔ جیسے چاہے اسے استعمال کرو فَاسْتَغْفِرُوهُ پس تم اس سے بخشش طلب کرو۔ زبانی استغفار پڑھو اور عملاً بھی برائی چھوڑ دو۔ جو کر چکے ہو اس پر اللہ سے معافی چاہو۔ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ گزشتہ پر نادم ہو کر اصلاح اعمال کرو اور آئندہ کے گناہوں سے بھی پناہ مانگو۔ گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی اسی سے مانگو کہ توفیق دینے والی ذات وہی ہے إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾ یقینا میرا پروردگار سب سے زیادہ قریب تر بھی ہے اور سب سے زیادہ گزارشات قبول کرنے والا ہے۔

نکتہءلطیف:

اسی آیہء مبارکہ کے ابتداء میں فرمایا، وہی ذات ہے جس نے تمہارے وجود کی تعمیر زمین سے کی اور پھر تمہیں زمین پر ہی آباد فرمایا تو اس سے بخشش چاہو، اس کے سامنے توبہ کرو۔ بات ربِ کریم کی ہو رہی ہے اور اللہ کریم تو سب کے ربّ ہیں لیکن یہاں فرمایا گیا إِنَّ رَبِّي یقینا میرا پروردگار۔ یہاں ربکم نہیں فرمایا بلکہ فرمایا إِنَّ رَبِّي یقینا میرا پروردگار۔ ربّ تو وہ سب کا ہے لیکن لوگوں نے مانا نہیں۔ اسے ربّ قبول نہیں کیا تو اللہ کے نبیؑ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ یقینا وہ سب کا ربّ ہے وہ واحد لاشریک ہے لیکن تم اسے مان نہیں رہے، اپنا نہیں رہے اور میں اسے اپنا ربّ مانتا ہوں، اس پر اعتماد کرتا ہوں، توکل کرتا ہوں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ میرا پروردگار ہمارے ہر حال سے واقف بھی ہے اور ہماری ہر دعا کو قبول فرمانے والا بھی ہے۔ دعا مانگنے کا سلیقہ ہو، اللہ پر اعتماد ہو تو وہ سب سے زیادہ قبول فرمانے والا ہے۔

صالح کی دعوت فکر سن کر ان کی قوم کے لوگ کہنے لگے قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا اے صالح (علیہ السلام) ہمیں تو تم سے بڑی امیدیں تھیں۔ چونکہ تمام انبیاء کا بچپن، لڑکپن، جوانی مثالی ہوتی ہے کہ انبیاء کے منتخب اور برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔ ازل سے چن لیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل بعثت کی زندگی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل کے طور پر قرآن حکیم میں پیش کیا گیا ہے۔ جب فرمایا لعمرک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کی قسم! یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلان نبوت سے پہلے کی زندگی اس بات پر

دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں۔اتنی پاکیزہ زندگی غیر نبی کی نہیں ہوسکتی۔

صالحؑ کی قوم کے بیان میں بھی یہی بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے کہا کہ آپ سے تو ہماری بہت امیدیں وابستہ تھیں۔آپ کا بچپن مثالی،لڑکپن خوبصورت، جوانی بے داغ، کردار صالح، انصاف پسند، حق گو، خوش شکل، خوش اطوار اور خوش گفتار۔ہمیں تو اتنی امیدیں تھیں کہ ہم آپ کو اپنا حکمران بنالیتے، بادشاہ وسردار بنالیتے لیکن آپ نے تو ہمیں مایوس کردیا۔ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا آپ (علیہ السلام) ہمیں ان کی پرستش سے روک رہے ہیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں۔ ہمارے آباؤاجداد تو بڑے نامور لوگ تھے۔ بڑے جرنیل، بڑے دانش ور، نہایت قابل تھے تو کیا وہ سارے اتنے جاہل تھے کہ انہیں پتہ نہیں تھا اور آپ کو زیادہ پتہ ہے کہ ان کی پوجا نہیں کرنی چاہیے۔ یہاں دل ودماغ کا معاملہ آجاتا ہے۔

دل ودماغ کی استعداد:

دل ودماغ کی استعداد فرق ہے۔ دماغ انسانی بہت عجیب وغریب کمپیوٹر ہے۔ایسا کمپیوٹر انسان ایجاد نہیں کر سکتا۔دماغ کی اگرچہ وسعتیں ہیں۔تمام مادی ایجادات، تمام جدید سہولتیں اسی کی صلاحیتوں کے باعث ہیں لیکن دماغ کے کام کرنے کا دائرہ بہرحال محدود ہے۔دماغ خود مادّی ہے اور مادّی اشیاء کو کام میں لانے کی تدبیریں کرسکتا ہے لیکن جب بات آتی ہے معرفتِ باری کی، انسان کے باطن کی، اس کی روح کی تو دماغ میں استعداد نہیں کہ وہ سمجھ سکے۔

اگر دماغ میں یہ استعداد ہوتی تو عہد فترت میں یعنی حضرت عیسیٰؑ کے رفع کے بعد سے بعثت محمد رسول اللہ ﷺ تک زمین پر کوئی نبیؑ نہیں تھا تو پانچ سو سال میں دنیا پہ دانش ور تو کم نہیں تھے۔ بڑے بڑے فلاسفر، افلاطون وغیرہ اسی دور میں ہوئے، کوئی اللہ کا پتا نہ بتا سکا۔

جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوا اور فلسفیوں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

ذاتِ باری کا پتا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔کوئی فلاسفر، سائنسدان یا دانشور نہ دے سکا۔جن لوگوں نے نبیؑ پر اعتماد نہیں کیا۔وہی اپنے آباؤاجداد کی پیروی کرتے رہے۔وہ عقل مادی کے پیچھے لگے رہے۔ کہتے رہے کہ ہمارے باپ دادا بڑے دانش ور، عقل مند تھے۔ بڑے بڑے کاروباری، دولت مند اور معاشرے کے نامور لوگ تھے۔ایک زمانہ ان کی برتری کا قائل تھا تو کیا وہ سارے بے وقوف تھے کہ بتوں کی پوجا کرتے تھے اور آج آپ (علیہ السلام) میں اتنی عقل آگئی ہے کہ آپ کہتے ہیں ہم بتوں کی پوجا چھوڑ دیں۔

بات یہ تھی کہ ان کے صرف دماغ تھے۔ یہ باتیں تو صرف دل جانتا ہے اور جسے اللہ کریم نبیؐ بناتے ہیں اسے قلب، دل بھی مثالی دیتے ہیں۔ ان کے قلب پر وحی نازل ہوتی ہے۔ وحی دماغ پر نہیں آئی قلب پر آئی۔ قلب اللہ کو پہچانتا ہے، اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ نہ ماننے والوں کے باپ دادا دماغ کے تو بڑے قوی ہوں گے لیکن ان کے دل مردہ تھے۔ دل کی زندگی ایمان سے ہے۔ دل کی باتیں تو اللہ کا نبیؐ ہی بتائے گا۔ ذاتِ باری کی خبر دے گا، فرشتوں کی، آخرت کی خبر دے گا اور سب سے بڑی بات یہ بتائے گا کہ اللہ کریم کس بات سے راضی ہیں اور کس بات سے خفا۔ یہ معاملہ دل و دماغ کا تھا اور یہ اس عہد کی بات نہیں۔ آج بھی ہمارا برائے نام پڑھا لکھا طبقہ جس نے مادی علوم میں تو اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں اور دین کے بارے میں کورے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔

یہ باتیں سمجھنے کے لیے دل چاہیے۔ آؤ تم بھی دل زندہ کرو دماغ تو مادی ہے۔ اس کی رسائی مادّیات تک ہی ہے وہ الٰہیات تک نہیں پہنچتا۔ الٰہیات تک دل پہنچتا ہے۔ جس طرح ایک بہت پڑھا لکھا شخص ہو لیکن کار چلانا نہ جانتا ہو تو وہ کسی ڈرائیور کو ملازم رکھے گا لیکن وہ یہ کہے کہ میں نے تو اتنی کتابیں پڑھ رکھی ہیں مجھ سے کار کیوں نہیں چلتی تو یہی کہا جائے گا کہ کار چلانا سیکھو گے تو کار چلے گی کتابیں پڑھنے سے تو نہیں چلے گی۔ اسی طرح دل کی باتیں جاننا ہیں تو دل کو زندہ کرو، دل کو روشن کرو، دل کو آباد کرو۔ دماغ لڑا کر دل کی باتیں سمجھنا چاہو تو سمجھ نہیں آئیں گی۔

حق کو نہ ماننے والے اپنی دانشوری کی بنیاد لوگوں پہ رکھتے ہیں۔ تاریخ کے حوالے دیتے ہیں تاریخ کی کیا حیثیت ہے، علماء تاریخ کے بارے کہتے ہیں یُکْتَبُ التاریخُ بأفواہِ النَّاس تاریخ کی حیثیت یہ ہے کہ یہ لوگوں کی باتوں سے بنتی جاتی ہے۔ جو اس زمانے کے لوگ کہتے ہیں وہ تاریخ بنتی جاتی ہے خواہ وہ صحیح کہتے ہیں یا غلط۔ جو کہتے ہیں وہی مؤرخ لکھ لیتا ہے۔ تاریخ کی حقیقت اتنی سی ہے کہ وہ لوگوں کی باتوں سے بنتی ہے لیکن انبیاءؑ جو ارشاد فرماتے ہیں وہ حق ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی بات بتاتے ہیں۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں صالحؑ کی قوم کے لوگوں نے یہی کہا کہ ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد بڑے قابل تھے، حکمران تھے، فاتحین تھے اور آپ (علیہ السلام) ہمیں ان کی پیروی سے روک رہے ہیں اس میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ان کے پاس دماغ تو تھا دل نہیں۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ جو صرف دماغ کی استعداد پر اکتفا کر جاتا ہے اس کے پاس دل نہیں رہتا لیکن جو دل کو صفا کرتا ہے اس کا دماغ بھی روشن ہو جاتا ہے۔ وہ حق کی تائید کرتا ہے۔ اسی لیے ہر صاحب دل، صاحب دماغ ہوتا ہے لیکن ہر صاحب دماغ، صاحبِ دل نہیں ہوتا۔

دل کی استعداد فرق ہے۔ اس کی زندگی نورِ ایمان ہے۔ جب تک یہ اللہ اور اللہ کے نبیؐ پر ایمان نہیں لاتا یہ مردہ ہے۔ ایمان لاتا ہے تو زندہ ہوتا ہے۔ اطاعت کرتا ہے تو اس کی تربیت ہوتی ہے اور اگر فیوضات قلب اطہر علیہ الصلوٰۃ والسلام نصیب ہو جائیں تو یہ دانا و بینا ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر دنیا پر بھی ہوتی ہے اور آخرت پر بھی۔

اہل دماغ کی نظر محض دنیوی منافع پر ہوتی ہے اور ان کی نظروں سے آخرت اوجھل ہوتی ہے۔ پھر وہ اسی مخمصے میں پھنسے رہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا بڑے دانش ور تھے یہی بات صالحؑ کی قوم نے کہی حالانکہ ان میں اللہ کے نبی صالحؑ موجود تھے۔ صاحب دل، دوسروں کے دلوں کو روشن کرنے والے سب کو واصل باللہ کرنے کی استعداد سے مالا مال لیکن ان کی قوم نے کہا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ۝ جس بات کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں ہمیں اس میں بہت شکوک وشبہات گزرتے ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے بڑے بڑے سردار بت پرستی میں گزر گئے اور آپ کل کے بچے نبی ہو گئے۔ آپ تو ہمارے ہاتھوں میں کھیلے ہو، ہم تو نبی نہیں ہوئے اور آپ نبی (علیہ السلام) ہو گئے۔ آپ کی یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہمارا دل نہیں مانتا۔

حضرت صالحؑ نے فرمایا، قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ اے میری قوم! میرے پاس میرے اللہ کی روشن دلیلیں ہیں۔ میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح اور روشن دلائل پر قائم ہوں۔

بات یہ نہیں ہے کہ کون عمر میں چھوٹا ہے اور کون عمر میں بڑا ہے۔ نہ آج کے انسان اور باپ دادا کی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ دلیل کس کے پاس ہے۔ بات تو دلیل سے مانی جائے گی افراد سے نہیں کہ اس شخص کی عمر زیادہ ہے اس کی بات مان لو اور اس کی عمر کم ہے اس کی نہ مانو۔ حق یہ ہے کہ اگر کم عمر والا دلیل سے صحیح بات کہہ رہا ہے تو دلیل والے کی بات مانی جائے گی۔

فرمایا، میرے پاس میرے اللہ کی روشن دلیلیں ہیں اٰتٰىنِیْ مِنْهُ رَحْمَةً پھر اس نے مجھے اپنی طرف سے اتنی رحمت دی ہے کہ میں تم سب پر لٹا کر تم سب کو واصل باللہ کر سکتا ہوں۔ فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَیْتُهٗ اب جب اس نے مجھ پر اتنے انعام کیے ہیں۔ مجھے نبوت سے سرفراز فرمایا ہے، معجزات عطا فرمائے ہیں، واضح دلیلیں عطا فرمائی ہیں، مجھ پر وحی نازل فرمائی ہے تو اگر میں ہی خدانخواستہ اس کی نافرمانی کروں تو پھر مجھے اللہ سے کون بچائے گا۔ تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری باتیں مان لوں اور اللہ کی بات چھوڑ دوں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے حساب اللہ کو دینا ہے یا تمہیں دینا ہے۔ میرا خالق وہ ہے نہ کہ تم۔ میرا ربّ وہ ہے، اس نے مجھے نبیؐ بنایا، وحی اس کی طرف سے آتی ہے۔ اور تم یہ چاہتے ہو کہ اس کی بات چھوڑ کر میں تمہاری بات مان لوں۔ فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ۝ اور تم تو ایسی باتیں کرتے ہو کہ تمہاری باتیں سن کر دل پر نحوست آتی ہے۔ تمہاری باتیں سننے سے نقصان ہی ہوتا ہے۔

نقصان دہ مجالس:

ایسی مجالس جہاں جھوٹ بولا جاتا ہے۔ دوسروں کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ برائی کی جاتی ہے یا برائی پر مشورے کیے جاتے ہیں ایسی مجالس نقصان دہ ہیں۔ان میں جانا ممنوع ہے۔ان سے احتراز کرنا چاہیے۔ایسی جگہ جانے سے توہر قیمت بچنا چاہیے جہاں دین کا مذاق اڑایا جارہا ہو،عظمتِ الٰہی کے خلاف یا دین کے خلاف گفتگو ہو رہی ہو۔جیسے آج بھی لوگ نمازیوں کونشانہ ءتنقید بناتے ہیں۔ان کا تمسخر اڑاتے ہیں کہ دیکھو ویسے تو بڑا نمازی ہے لیکن اس میں یہ برائی ہے۔اس گفتگو کا مقصد نماز کا مذاق اڑانا ہوتا ہے۔ورنہ تو غیر نمازی بھی انسان ہے اور نمازی بھی انسان ہے۔اگر غیر نمازی سے قصور ہوسکتا ہے تو نمازی سے بھی ہوسکتا ہے۔فرق یہ ہے کہ اس نے نماز بھی نہیں پڑھی اور کوئی دوسرا گناہ بھی کرلیا۔نمازی نے کم از کم نماز پڑھ لی۔نماز چھوڑنے کا گناہ تو نہیں کیا۔پھر بھی اس کے نمازی ہونے کا تمسخر اڑاتے ہیں کہ یہ تو بڑا پارسا ہے اور اس میں یہ خرابی بھی ہے۔ایسی باتوں کے سننے سے بھی نقصان ہوتا ہے۔دل پر نحوست آتی ہے۔

ذاکر اور صوفی کو مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔غیر ذاکر سے ضرورت کی بات کرے اور الگ رہے غیر ضروری گفتگو کی نحوست بھی دل کو سیاہ کر دیتی ہے۔بندہ دل کو روشن کرنے کے لیے اتنی محنت نہیں کرتا جتنی بے دین آدمی کی باتیں اسے سیاہ کر دیتی ہیں۔بے دین آدمی سے بچنا تو ویسے ہی ضروری ہے ذاکر کو تو عام لوگوں سے بھی غیر ضروری میل ملاقات سے پرہیز کرنا چاہیے۔جب ہم لطائف کیا کرتے تھے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہمیں تلقین کرتے تھے کہ صلوٰۃ باجماعت ادا کرو لیکن سنتیں گھر سے پڑھ کر جاؤ۔فرض باجماعت پڑھ کر سلام پھیر کر نمازیوں میں بھی مت بیٹھو باقی کی سنتیں گھر جا کر پڑھو یا مسجد کے ایک گوشے میں الگ ہوکر پڑھو۔اسی طرح بازاری تیار اشیاء لے کر مت کھایا کرو۔پاکیزہ غذا کا اہتمام کرو۔بازار میں سجائی گئی اشیاء پر لوگوں کی حسرت بھری نظریں پڑتی ہیں۔انہیں کھانے سے بھی نحوست آتی ہے۔اب ایسی احتیاطیں کہاں، ایسے لوگ کہاں !اب محض مادی، دماغی ترقی نے دل مردہ کر دیے ہیں۔دل کی زندگی کا اقرار کرنے والے کم لوگ ہیں۔اسے حاصل کرنا تو بعد کی بات ہے پہلے بندہ اسے مانے، اس پر ایمان لائے۔کسی چیز پر یقین ہو کہ یہ مفید ہے تو پھر اسے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اب تو یہ یقین ہی نہیں ملتا۔

انبیاء اللہ کی رحمت کا مظہر ہوتے ہیں۔قوم کے تمسخر کے باوجود روشن دلائل سے وضاحت فرماتے ہیں تاکہ

راہ راست پر آ جائیں اور ابدی کامیابی کو پالیں۔ لیکن ان کی قوم نے بہت سوچ بچار کر کے آپس میں مشورہ کر کے ایک بات بنائی کہ آپ (علیہ السلام) کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اور آپ کا اللہ ہر چیز پر قادر ہے، جو چاہے کر سکتا ہے تو پھر ہماری یہ ایک بات پوری کر دیں تو ہم مان جائیں گے۔ انہوں نے بہت دماغ لڑا کے ایک مشکل ترین بات نکالی کہ ہمارے سامنے جو بڑی چٹان ہے وہ شق ہو جائے اس میں سے ایک اونٹنی نکلے، وہ گابھن، یعنی بچہ دینے والی ہو۔ جیسے ہی وہ چٹان سے باہر نکلے تو وہ ہمارے سامنے بچہ جنے۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا۔ اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تم نے تو اپنی طرف سے اسے مشکل ترین کام سمجھا ہے۔ اللہ کے لیے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ وہ ذات تو پہلے سے ہی مخلوق کو خاک سے بنا رہی ہے ایک پتھر سے اونٹنی کو پیدا کر دے تو اس کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھو! جب معجزہ طلب کیا جائے اور وہ ظاہر ہو جائے پھر بھی اس کا انکار کیا جائے اور ایمان نہ لایا جائے تو تباہی آ جاتی ہے۔ جب یہ اونٹنی نکل آئے گی، معجزہ ظاہر ہو جائے گا اور پھر تم نے انکار کیا تو تباہ ہو جاؤ گے۔ وہ کہنے لگے دیکھا! پہلے تو یہ کہتے تھے میرا اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اب بہانے بنا رہے ہیں۔ چونکہ چٹان سے اونٹنی کا نکلنا ناممکن ہے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ جو اونٹنی چٹان میں ہو وہ گابھن بھی ہو لہٰذا اب بہانے کر رہے ہیں کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ ہم تباہ نہیں ہوتے۔ آپ اور آپ کے ربّ سے تو یہ کام ہونے والا نہیں لہٰذا بہانے نہ بنائیں کر کے دکھائیں۔ صالح علیہ السلام نے دعا کی۔ آپؑ کے دعا فرماتے ہی قوم کے سامنے وہ چٹان شق ہو گئی۔ اس میں سے ایک عظیم قدو قامت کی اونٹنی نکلی۔ جیسے ہی باہر آئی اس نے بچہ جنا۔ بچہ بھی ٹھیک ٹھاک زندہ کھڑا ہو گیا۔ آپؑ نے فرمایا، وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً دیکھ لو! یہ اونٹنی بھی ہے اور اس نے تمہارے سامنے بچہ بھی دیا ہے۔ یہ تمہارے لیے عظمتِ الٰہی کی دلیل بھی ہے۔ یہ اللہ کا فعل ہے، اللہ کے نبیؑ کا معجزہ ہے، تمہارے مطالبے پر اللہ نے یہ معجزہ دکھایا ہے۔ اب ایمان لے آؤ۔ کہنے لگے اونٹنی تو پیدا ہو گئی ہے پر ہم اپنے باپ دادا کی پیروی نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نہیں مانیں گے۔ صالحؑ نے فرمایا، جو قوم معجزہ طلب کرے، معجزہ ظاہر ہو جائے اور پھر اس کا انکار کرے تو وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ لیکن تمہارے پاس ایک حیلہ ہے۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ یہ اونٹنی اللہ کی خاص نشانی ہے۔ اس پر اللہ کا خاص کرم اور توجہ ہے لہٰذا اسے چھوڑ دو، تمہارے سے تو کچھ نہیں لے گی اللہ کی زمین پر چرتی رہے گی۔ اسے نہ چھیڑنا نہ نقصان پہنچانا تو یہ تمہارے اور عذاب کے درمیان ڈھال بنی رہے گی۔ تم عذاب سے بچے رہو گے۔

اللہ کے نیک بندوں کا ساتھ:

دیکھو! اگر ایک جانور کو اللہ کریم سے خصوصی نسبت نصیب ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ کریم نے اس اونٹنی کو خاص طور پر بطور معجزہ تخلیق فرمایا۔ اسے ایک خاص نسبت ہوگئی۔ اگر وہ درمیان میں رہے تو عذاب نہیں آتا تو اگر اللہ کے خاص بندوں کے ساتھ رہا جائے تو یہ کتنی بڑی ڈھال بنتی ہے اللہ کے عذاب سے۔ جانور تو جانور ہے۔ انسان کو شرفِ انسانیت نصیب ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ رہا جائے یا کسی قوم میں اللہ کے نیک بندے ہوں تو عذاب سے ڈھال کا سبب بنتے ہیں۔

حضرت صالحؑ نے فرمایا، یہ اونٹنی تمہارے لیے اللہ کی نشانی ہے۔ اسے بری نیت سے چھونا بھی نہیں۔ اس اونٹنی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ قد آور تھی بہت زیادہ چرتی اور بہت سا پانی پیتی تھی۔ وہاں چشمے سے پانی آتا اور بڑے سے تالاب میں جمع ہوتا رہتا جس سے وہ لوگ اپنے جانوروں کے ریوڑ سیراب کرتے تھے۔ جب اونٹنی تالاب پر آتی تو پورا تالاب پی جاتی۔ صالحؑ نے باری مقرر کر دی کہ ایک دن اونٹنی پانی پیے گی اور دوسرے دن سارے جانوروں کے گلّے پانی پیں گے۔ ان کی قوم کے لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے مشورے کرنے شروع کر دیئے۔ صالحؑ نے متنبہ کر دیا تھا کہ اسے مت چھیڑنا فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ﴿۶۴﴾ اگر اسے چھیڑو گے تو فوراً تمہیں عذاب پکڑ لے گا۔ فَعَقَرُوهَا انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے بالآخر اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، اسے مار ڈالا۔ صالحؑ کو پتہ چلا کہ ان لوگوں نے اونٹنی کو مار دیا تو آپؑ نے فرمایا بچے کو پکڑو اسے اپنے درمیان میں رکھو۔ بتایا گیا کہ وہ چیختا چلاتا جنگل کو نکل گیا۔ فرمایا، اب تمہیں اس تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم نے اپنی تباہی خود مول لے لی۔ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ؕ صالحؑ نے بحکم الٰہی انہیں خبر دے دی کہ اب تم اپنے گھروں میں تین دن رہ سکتے ہو۔ تمہارے پاس تین دن ہیں۔ اب تمہارے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ تم سے توبہ کی توفیق بھی سلب ہوگئی ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ﴿۶۵﴾ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ یہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوتا۔ وہ تین دن اپنے گھروں میں رہے۔ پہلے دن چہرے سرخ ہو کر پھول گئے۔ دوسرے دن پیلے پڑ گئے جیسے زخم میں پیپ پڑ جاتی ہے۔ چوتھے دن سیاہ ہو گئے جیسے پرانے زخم سیاہ ہو جاتے ہیں۔ چوتھے دن صبح ایک چنگھاڑ سی شروع ہوئی۔ معمولی چیخ سے شروع ہو کر اتنی بلند ہوئی کہ جانوروں اور انسانوں کے دل

پھٹ گئے۔ پوری قوم میں سے کوئی ذی روح باقی نہ بچا سوائے ان لوگوں کے جو صالحؑ پر ایمان لے آئے۔ وہی چنگھاڑ کا کوئی اثر نہ پہنچ رہا تھا۔ انہیں اللہ کی رحمت نے گھیر رکھا تھا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا پھر جب ہمارا حکمِ عذاب آ پہنچا نَجَّیْنَا صٰلِحًا ہم نے صالحؑ کو اس سے محفوظ رکھا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ اور جو ایمان لا کر انؑ کے ساتھ تھے بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ان کو بھی اپنی رحمت سے محفوظ رکھا۔

یاد رہے نبیؑ کی معیت کے لیے صحیح عقیدہ شرط ہے۔ یہاں صرف مَعَهٗ نہیں فرمایا اس لیے کہ ساری قوم بھی انؑ کے ساتھ ہی ایک شہر، ایک ہی جگہ پر تھے، بلکہ فرمایا، وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جو لوگ دل سے ایمان لائے وہ صالحؑ کے ساتھ تھے۔ باقی ساتھ رہتے ہوئے بھی ساتھ نہیں تھے۔ نبیؑ کا ساتھ (معیت) ایمان وعقیدے پر منحصر ہے۔ اگر عقیدہ درست ہے تو عقیدہ تقاضا کرتا ہے اتباعِ رسالت کا۔ عقیدہ اور اتباع رسالت مل کر معیتِ نبوت عطا کرتے ہیں پھر اللہ کی رحمت عذاب سے محفوظ رکھتی ہے۔ اللہ کریم نے صالحؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے محفوظ رکھا وَمِنْ خِزْیِ یَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ﴿۶۶﴾ اس دن کی ذلت سے بھی محفوظ رکھا آخرت میں بھی محفوظ رکھیں۔ بلاشبہ آپ کے پروردگار بڑی طاقت والا اور ہر شئے پر غالب ہے۔

سورۃ ھود رکوع 7 آیات 69 تا 83

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِىْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِىْ ضَيْفِىْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِىْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوْ اَنَّ لِىْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِىْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا

رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

اور یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس خوش خبری لے آئے تو سلام کہا انہوں نے بھی سلام کہا پھر دیر نہیں کی کہ ایک تلا ہوا بچھڑا لے کر آئے۔ پس جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس (کھانے) کی طرف نہیں بڑھتے تو ان سے کھٹکے اور (ان کو اجنبی جان کر) دل میں ان سے ڈر محسوس کیا انہوں (فرشتوں) نے کہا خوف مت کیجیے بے شک ہم لوط (علیہ السلام) کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ﴿۷۰﴾ اور ان کی اہلیہ (پاس) کھڑی تھیں تب ہنس پڑیں تو ہم نے ان کو اسحٰق (علیہ السلام) اور اسحٰق (علیہ السلام) کے بعد یعقوب (علیہ السلام) کی خوش خبری دی ﴿۷۱﴾ انہوں نے کہا اے ہے! کیا میرے بچہ ہوگا؟ اور میں تو بڑھیا ہوں اور یہ میرے خاوند بھی بوڑھے ہیں، بے شک یہ بڑی عجیب بات ہے ﴿۷۲﴾ انہوں (فرشتوں) نے کہا کیا آپ اللہ کے کاموں میں تعجب کرتی ہیں اے اہل بیت (گھر والو)! آپ پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں بے شک وہ تعریف کیا گیا بڑی شان والا ہے ﴿۷۳﴾ پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا اور ان کو خوشی کی خبر بھی ملی تو ہم سے قومِ لوط (علیہ السلام) کے بارے بحث کرنے لگے ﴿۷۴﴾ بے شک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے تحمل والے، نرم دل (اور) رجوع کرنے والے تھے ﴿۷۵﴾ اے ابراہیم (علیہ السلام)! اس بات کو جانے دیں، بے شک آپ کے پروردگار کا حکم آپہنچا ہے اور یقیناً ان لوگوں پر عذاب آنے والا ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں ﴿۷۶﴾ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے)

لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے تو وہ ان کی وجہ سے مغموم ہوئے اور ان کے آنے کی وجہ سے تنگ دل ہوئے اور کہنے لگے آج کا دن بہت مشکل (کا دن) ہے ﴿۷۷﴾ اور ان کی قوم ان کے پاس دوڑتی ہوئی آئی اور یہ لوگ پہلے ہی بُرے کام کرتے تھے انہوں نے فرمایا اے میری قوم! یہ میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں یہ تمہارے لیے (جائز اور) پاک ہیں تو اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ ﴿۷۸﴾ وہ کہنے لگے کہ یقیناً تم جانتے ہو تمہاری (قوم کی بہو) بیٹیوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں اور جو ہم چاہتے ہیں یقیناً تم اس سے خوب واقف ہو ﴿۷۹﴾ انہوں نے فرمایا اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعے میں پناہ پکڑ سکتا ﴿۸۰﴾ وہ (فرشتے) کہنے لگے اے لوط (علیہ السلام)! یقیناً ہم تو آپ کے پروردگار کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں یہ لوگ آپ تک ہرگز نہ پہنچ سکیں گے پس آپ کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دیں اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے مگر آپ کی بیوی۔ یقیناً اس پر وہی مصیبت پڑنے والی ہے جو ان پر پڑے گی۔ بے شک ان کے (عذاب کے) وعدہ کا وقت صبح ہے کیا صبح قریب نہیں ہے؟ ﴿۸۱﴾ پس جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس (بستی) کو (الٹ کر) اوپر کا نیچے (اور نیچے کا اوپر) کر دیا اور ان پر کھنگر کے پتھر برسائے (جو) لگاتار (گر رہے تھے) ﴿۸۲﴾ جن پر آپ کے پروردگار کا خاص نشان بھی تھا اور یہ (بستی) ان ظالموں سے کچھ دور بھی نہیں ﴿۸۳﴾

تفسیر ومعارف

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ابراہیمؑ کے پاس آئے اور انہیں خوشی کی نوید سنائی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ چونکہ فرشتے انسانی شکل میں آئے اور سلام پیش کیا تو ابراہیمؑ نے بھی سلام کہا قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ اور فوراً ہی ایک بچھڑا تل کر لے آئے تاکہ مہمانوں کی مہمانداری کا سامان ہو جائے۔

سلامتی کی دعا:

ہر قوم میں میل ملاقات کے وقت کچھ کلمات کہنے کا رواج ہوتا ہے لیکن دنیا میں خوب صورت ترین طریقہ وہ ہے جو اللہ کریم نے عطا فرمایا یعنی باہمی ملاقات کے وقت کہا جائے السلام علیکم آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ دوسرا جواباً کہے وعلیکم السلام اور آپ پر بھی سلامتی ہو۔ اسلام کے عطا کردہ ان خوب صورت کلمات میں ایک دعا ہے اور دوسرا ایک پیغام۔ دعا یہ ہے کہ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ اللہ کریم آپ کو ہر قسم کے دکھ درد سے محفوظ رکھے۔ آپ کو گناہ سے بچائے۔ آپ کو دنیوی اور اخروی دکھوں سے بچائے اور جو سلامتی کی دعا دے رہا ہے اس کا مدعا یہ ہے، پیغام یہ ہے کہ میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میری طرف سے تم محفوظ ہو۔ جواباً جو وعلیکم السلام کہے اس کی مراد بھی یہی ہے کہ آپ پر بھی اللہ کی سلامتی ہو اور آپ کو میں اپنی ضمانت دیتا ہوں کہ آپ میری طرف سے محفوظ ہیں۔ اور اس میں مزید دعائیں شامل ہو جاتی ہیں جب یوں کہا جاتا ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو، اس کی رحمت ہو اور برکات ہوں۔

اللہ کریم نے تو بہترین کلمات عطا فرمائے یہ الگ بات ہے کہ آج کے نام نہاد دانش ور فرماتے ہیں کہ جو مزہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کہنے میں ہے وہ السلام علیکم میں کہاں۔ ایسے ہی لوگوں کی تحقیق نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نہ ہم پوری طرح سے غیر بن سکے نہ پوری طرح سے مسلمان۔ یہ ثمرات ہیں اس نظامِ تعلیم کے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کر لیتے ہیں، دینی شعائر، دینی غیرت وحمیت سے کورے رہتے ہیں۔ نتیجتاً پڑھ لکھ کر بھی جاہل ہی رہتے ہیں۔ ارشاد باری ہے

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيۡدِيَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَيۡهِ نَكِرَهُمۡ وَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ حضرت ابراہیمؑ نے جب مہمانوں کے سامنے کھانا رکھا تو انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے۔ فلسطین وعرب کے علاقوں میں یہ رواج تھا کہ دشمن کا کھانا نہیں کھاتے تھے تو اللہ کے نبیؑ کو یہ بات کھٹکی کہ میری ان کی کیا رنجش ہے میں تو انہیں جانتا پہچانتا بھی نہیں۔

غیب کا جاننا اللہ کریم کا خاصہ ہے:

انبیاء کرامؑ کی نگاہ بہت وسیع ہوتی ہے۔ اللہ کریم انبیاءؑ کو بے پناہ علوم عطا فرماتے ہیں لیکن وہ علوم ان کی نبوت سے متعلق ہوتے ہیں۔ جتنی ضرورت ہوتی ہے اس سے زیادہ ہی اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرما دیتے ہیں لیکن یہ علم غیب نہیں ہوتا، یہ اطلاع عن الغیب ہوتی ہے یعنی غیب پر مطلع کر دینا۔ غیب صرف خاصہ ءالٰہی ہے۔ اسی لیے جب تک

اللہ کریم نے اپنے نبیؑ کو ان مہمانوں کی حقیقت نہ بتائی تب تک آپؑ کو پتہ نہ چلا۔

جب ابراہیمؑ کو مہمانوں کے کھانا نہ کھانے پر تشویش ہوئی تو اللہ کے حکم سے فرشتے بول اٹھے قَالُوْا لَا تَخَفْ (سورۃ ص: 22) اے اللہ کے نبیؑ! آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ہم تو اللہ کے فرشتے ہیں۔ ہمیں اللہ نے حضرت لوطؑ کی قوم کی طرف بھیجا ہے۔ چونکہ آپؑ کے لیے اللہ کریم نے خوشخبری کا پیغام بھیجا ہے اس لیے ہم خوشخبری سنانے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

سنت الٰہی:

حضرت لوطؑ کی قوم کی برائی جب بڑھتی گئی اور انہوں نے اپنے نبیؑ کے ساتھ دشمنی، عناد کا راستہ اختیار کرلیا، آپؑ کو پریشان کرنے اور ایذاء دینے پر تُل گئے تو اللہ کریم نے انہیں عذاب میں گرفتار کردیا۔ اللہ نے جب ان پر عذاب بھیجا تو فرشتے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس بشارت دینے کے لیے حاضر ہوئے۔ گزشتہ کئی اقوام کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ جہاں نافرمانوں پر تباہی آئی وہیں اسی ماحول میں اللہ کے نبیؑ موجود تھے۔ ان کے ماننے والے بھی موجود تھے۔ وہی عذاب جو نافرمانوں کو تباہ کررہا تھا۔ نبیؑ کے پیروکاروں کے لیے آرام اور کرم کا سبب بن گیا۔ جیسے یہی فرشتے لوطؑ کی قوم کی طرف جارہے تھے کہ سارے نافرمانوں کو تباہ کردیں وہی فرشتے پہلے ابراہیمؑ کے پاس پہنچ کر خوشی کی نوید سنا رہے تھے۔ یہیں سے یہ سمجھ آتی ہے کہ انسانوں کے اپنے فیصلے ان کو دو مختلف انجام تک پہنچاتے ہیں۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ اللہ کریم اپنے بندوں کو اپنی رحمت کے سائے میں لانے کے لیے انبیاءؑ مبعوث فرماتے ہیں جو حق کو واضح فرماتے، دلائل حقہ پیش کرتے، اللہ کی نشانیاں دکھاتے اور اس کی بے کراں رحمت کی طرف بلاتے ہیں۔ بندہ اپنے ذاتی فیصلے سے جب راستے کا انتخاب کرلے تو اس پر زبردستی نہیں کی جاتی۔ ہر شخص اپنے انتخاب کا انجام پالیتا ہے۔

زندگی کی مہلت قیمتی ہے:

اللہ کا کرم اتنا وسیع ہے کہ اس نے توبہ کا، واپسی کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ جب تک دم میں دم ہے درِ رحمت کھلا ہے۔ یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ استعداد کو استعمال کرلے۔ اللہ کریم نے ہر انسان میں معرفتِ الٰہی کی استعداد رکھی ہے جسے اس نے امانت کہا ہے۔ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن انسان اس سے خود بھی آشنا ہو۔ کسی کے گھر میں جواہرات رکھے ہوں اور اسے ان کا احساس نہ ہو تو ان کے رکھے رہنے سے کیا ہوگا؟ جسے ان کے قیمتی ہونے کا اندازہ ہوگا اس کے لیے یہ بڑی بات ہوگی۔ معرفتِ الٰہی کی استعداد جواہرات سے قیمتی اور حقیقی نعمت ہے۔

یہ ہر پیدا ہونے والے انسان کو عطا ہوتی ہے۔ اگر وہ دنیوی لالچ، فانی لذتوں اور نفسانی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ جائے تو اسے تباہ کر دیتا ہے۔ یہ اس کی اپنی زیادتی ہے۔ اور اگر اسے کسی لمحے اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے، وہ رجوع الی اللہ کرلے تو اللہ کریم اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں، گناہ معاف ہو جاتے ہیں، استعداد بحال ہو جاتی ہے۔ انسان طبعاً جلد باز ہے۔ مادی لذتوں، دنیوی راحتوں، عہدوں پر فدا ہو کر آخرت کو بھول جاتا ہے۔ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ کیا حاصل کر رہا ہے اور کیا کھو رہا ہے۔ جب اس دار دنیا، دار عمل سے گزر جاتا ہے تو احساس ہو جاتا ہے لیکن تب عمل کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

یہی حال ان اقوام کا تھا۔ جیسا کردار تھا اسی طرح کے نتائج سامنے آ گئے۔ اللہ کے فرشتے ایک جگہ بشارت دینے آئے اور دوسری جگہ عذاب کی وعید سنانے آئے، فرشتوں نے عرض کی کہ ہم آپؑ کو خوش خبری سنانے آئے ہیں اور سنا کر چلے جائیں گے۔ آپؑ کی اہلیہ محترمہ پاس کھڑی سن رہی تھیں۔ ارشاد باری ہے وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ ابراہیمؑ کی اہلیہ ہنس پڑیں۔ فرشتوں نے انہیں خبر دی کہ آپ کے ہاں بیٹا ہوگا اس کا نام اسحاق ہوگا۔ ان کے ہاں بیٹا ہوگا اس کا نام یعقوب ہوگا۔ آپؑ کی نسل نبوت سے سرفراز ہوگی۔ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ تو وہ فرمانے لگیں، عجیب بات ہے کہ اب میرے اولاد ہوگی حالانکہ میں بہت بوڑھی ہو چکی اور میرے خاوند بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ اس عمر میں تو اولاد نہیں ہوتی وہ عمر تو گزر چکی۔ بڑھاپے میں اولاد کیسے ہوگی؟

بعض مفسرین کے نزدیک مائی صاحبہ کی عمر تقریباً نوے برس تھی اور ابراہیمؑ ایک سو بیس برس کے تھے فرشتوں نے عرض کیا قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ اے صاحبِ خانہ! آپ اللہ کی رحمت اور اس کے کرم پر حیرت زدہ کیوں رہ گئیں۔ آپ کی تو ساری عمر اللہ کے خلیلؑ کے ساتھ گزری ہے۔ ساری عمر معجزات و عجائبات دیکھتے گزری ہے۔ آپ نے تو ہمیشہ دیکھا کہ اسباب کچھ اور تھے نتائج کچھ اور تھے۔ بادشاہ نے آگ میں پھینکوا دیا تو وہ گلزار ہو گئی۔ اسی طرح سفر و حضر میں آپ نے سارے واقعات اپنے سامنے دیکھے تو یہ کون سی عجیب بات ہے کہ آپ حیران ہو رہی ہیں۔ اللہ قادر مطلق ہے جو چاہے کرے۔ اللہ کریم بے حد تعریف کیا گیا اور بڑی شان والا ہے۔ اسباب پیدا کرنے والا وہی ہے اور ان پر نتائج پیدا کرنے میں بھی وہ یکتا ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں، اسباب اور ان کے نتائج اس کے دستِ قدرت کے محتاج ہیں۔

فرمایا، فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ جب

ابراہیمؑ سے وہ کھٹکا دور ہو گیا اور اولاد کی بشارت سنی تو بہت خوش ہوئے۔ جب دل مسرور ہوا تو اپنی فطری رافت و رحمت کے سبب اللہ کریم سے لوطؑ کی قوم کے بارے بحث کرنے لگے کہ بارالہٰ! انہیں تباہ کرنے کے بجائے توبہ کی توفیق دے دے۔ تیری بارگاہ میں کیا کمی ہے مالک! توبہ کر کے برائی چھوڑ دیں تو بلاشبہ تو بہترین معاف کرنے والا ہے۔ اگر عذاب سے دو چار ہوئے تو صرف اس دنیا میں ہی ہلاک نہیں ہوں گے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں عذاب کا شکار رہیں گے۔ اے مالک! ان پر رحم فرما۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ۝ بے شک ابراہیمؑ بڑے نرم دل، متحمل اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

سبحان اللہ! اللہ کے کلام کا انداز دیکھیں تو سمجھ آتی ہے کہ انبیاءؑ کا مقام کیا ہوتا ہے۔ اللہ کریم نے لفظ يُجَادِلُنَا استعمال فرمایا ہے۔ ابراہیمؑ کے جھگڑنے کی تعریف فرمائی ہے کہ کتنے نرم دل، حلیم مزاج، برداشت والے، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے۔ اس حد تک شفیق کر چاہتے تھے کہ کافر سے بھی کفر دھل جائے اسے توبہ کی توفیق مل جائے اللہ کی رحمت کو پالے۔

انبیاءؑ کے تعلق باللہ کی تو اپنی شان ہے اور ابراہیمؑ تو اولوالعزم رسول تھے، اللہ کے خلیل تھے آپؑ نے وہ منزل پالی تھی جہاں حقائق کی قدر و قیمت کی سمجھ آتی ہے۔ لیکن ہر بندۂ مومن اپنی حیثیت کے مطابق تعلق باللہ اور رجوع الی اللہ کا حامل ہوتا ہے۔ جس قدر اپنے نبیؐ سے پیوستہ ہوتا چلا جاتا ہے اسی قدر تعلق باللہ میں خلوص اور مضبوطی آتی چلی جاتی ہے۔

تعلق باللہ اور تعلق سے محرومی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ سے تعلق رکھنے والا اللہ کی ساری مخلوق کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ سب کے لیے اللہ کی رحمت چاہتا ہے اور جو محروم تعلق ہے اس کا دل دنیوی مشاغل میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ وہ محض عہدے حاصل کر لینے، دولت جمع کر لینے، بڑے عالی شان گھر بنانے، بڑی عمدہ گاڑیاں رکھنے کو ہی منتہائے مقصود بنا لیتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا حاصل یہی ہے کہ وہ دنیا کی ہر آسائش حاصل کر لے اور لوگ محتاج و بے نوا رہیں۔

اللہ کریم نے اپنے خلیل سے فرمایا، يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ۝ اے ابراہیمؑ! آپ اس بات کو جانے دیں۔ آپؑ کے پروردگار کا حکم آچکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب ان پر وہ عذاب آئے گا جسے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ اس معاملے میں آپ کے پروردگار کا فیصلہ صادر ہو چکا۔ اب آپ اس پر بات نہ کیجیے۔ چنانچہ وہی فرشتے جو ابراہیمؑ کو خوش خبری دے کر نکلے وہی لوطؑ کی قوم

پر اللہ کا حکم پورا کرنے چلے۔

حضرت لوطؑ کی قوم:

لوطؑ نے اپنی قوم کو اللہ کی طرف دعوت دی۔ شب و روز اطاعت الٰہی کی تبلیغ فرماتے رہے لیکن معدودے چند کے سوا ساری قوم نے بے حیائی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ﴿۷۷﴾ وہ فرشتے نوجوان لڑکوں کی شکل میں لوطؑ کے گھر پہنچ گئے۔ آپؑ نے انہیں دیکھا تو بہت دکھی ہوئے کیونکہ ان کی قوم بے حیائی میں اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کوئی پردیسی بھی آجاتا تو وہ اس سے بد فعلی کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ آپؑ غمگین تھے کہ یہ نوجوان لڑکے میرے گھر آگئے ہیں۔ میری قوم ان کے درپے ہوگی۔ انہیں ایذا پہنچائے گی۔ تو فرمانے لگے آج کا دن بڑی مصیبت لایا۔ آج بہت مشکل دن ہے۔ یہ میرے لیے بڑی آزمائش کا دن ہے۔ میں ان مہمانوں کو قوم کی چیرہ دستی سے کیسے بچاؤں گا! قوم بے حیائی میں اتنی بیباک ہو چکی تھی کہ جب انہیں خبر ہوگئی کہ لوطؑ کے گھر میں لڑکے ہیں تو وہ سارے ان لڑکوں کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے۔ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ آپؑ کی قوم پہلے سے ہی ان برائیوں میں ملوث تھے۔ لڑکوں کا سن کر دوڑتے، شور مچاتے آدھمکے۔ یہ قوم اتنی بے حیا ہو چکی تھی کہ انہیں بے حیائی، برائی کے لیے کسی پردے یا آڑ کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ عورتیں بھی تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہوگئیں۔ یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی اسی طرح برائی کرتے اور مردوں، عورتوں کے سامنے کرتے تھے۔ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ لوطؑ نے فرمایا، میری قوم کی یہ بچیاں جو یہاں جمع ہوگئی ہیں۔ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ نبیؑ چونکہ امت کا باپ ہوتا ہے اس لیے فرمایا یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہاری منکوحہ بیویاں ہیں، یہ تمہارے لیے حلال ہیں۔ تم اپنی بیویوں کے ساتھ رہو۔ انہیں لو اور اپنے گھر کی راہ لو۔ میرے مہمانوں کو پریشان کر کے مجھے دکھ نہ دو۔

نبیؑ کے متعلقین کو ایذا دینا ایذائے نبیؑ ہے:

پتہ چلتا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلقین کو ایذا دینا نبیؑ کو ایذا دینا ہے۔ یہاں وہ لوگ لوطؑ کے مہمانوں کو پکڑنا چاہتے تھے تو لوطؑ نے فرمایا مجھے دکھ نہ دو۔ جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقین کو، آپ ﷺ کے گھر کے لوگوں، ازواج، اولاد، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی گستاخی یا توہین کرتے ہیں ان کی وہی سزا ہوگی جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں گستاخی کرنے کی ہے۔ وہاں وہ قوم تھی جو اللہ کے نبیؑ سے انؑ کے مہمان چھین کر

ظلم وزیادتی کرنا چاہتی تھی۔ یہاں ایسے لوگ بھی پائے گئے جنہوں نے خاندانِ نبوت کو تہ تیغ کر دیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جس ہستی کو نبیؐ مانا اسی کی اولاد کاٹ دی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ نبیؐ اور نبوت تو بہت بڑا منصب ہے۔ جس آدمی کو لوگ ولی اللہ سمجھتے ہیں اس کا اتنا پاس رکھتے ہیں، اس کے خاندان کا لحاظ کرتے ہیں حالانکہ ولی تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جوتیوں کی خاک ہوتا ہے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ محض زبانی کہنا ایمان نہیں۔ تصدیق قلبی ضروری ہے۔ اگر خاندان نبوت کے قاتلوں کا دل مانتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پر تلوار نہ اٹھاتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا تعلق بڑھتا جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک انداز عزیز ہوتا جائے گا۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کی پروا نہ کرنا بھی اسی قبیل کا گناہ ہے۔ قرآن حکیم اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہمیں نصیب ہوا ہے۔ اس کو پڑھنا، سمجھنا، اس پر عمل کرنا ہم پر قرآن کا حق ہے اور ساری عمر کھول کر نہ دیکھا جائے تو یہ بے رخی ہے۔ اپنے آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔ اللہ کریم معاف فرمائے۔ دین کا تو سارا معاملہ ہی دل پر منحصر ہے۔ ساری حقیقت دل سے چلتی ہے۔ زبان تو صرف دل کا حال بیان کر سکتی ہے۔ اگر دل ساتھ نہ دے تو محض زبانی دعویٰ کرتی ہے۔

لوطؑ نے اپنی قوم سے فرمایا، فَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ کا خوف کرو، اللہ کے غضب سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے مجھے پریشان نہ کرو۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ﴿۷۸﴾ تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں جو تمہیں ان عادتوں سے روکے، اس ظلم وزیادتی سے روکے۔ تو وہ کہنے لگے قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ یہ بات تو آپ پہلے سے جانتے ہیں کہ ہمیں عورتوں سے کوئی رغبت ہی نہیں۔ آپ کی بیٹیوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ﴿۷۹﴾ آپ (علیہ السلام) کو اچھی طرح پتہ ہے کہ ہمارا مطالبہ کیا ہے۔ آپؑ بہت رنجیدہ ہوئے۔ فرمانے لگے قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴿۸۰﴾ کاش! میرے ساتھ کوئی جمعیت، طاقت، قوت ہوتی۔ کوئی مضبوط جتھا، قبیلہ ہوتا تو میں تمہارا مقابلہ کرتا۔ اللہ کے فرشتے انسانی شکل میں اللہ کے نبیؐ کی خدمت میں موجود تھے بحکم الٰہی عرض کرنے لگے قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ ان جوان لڑکوں کی شکل میں آئے ہوئے فرشتوں نے کہا۔ لوط علیہ السلام! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم انسان نہیں اللہ کے فرشتے ہیں۔ ہمارا جوان لڑکوں کی شکل میں آنا ان لوگوں کے لیے اتمام حجت تھا۔ یہ آپ علیہ السلام کی بات آج بھی سن لیتے تو بچ جاتے لیکن ان بدنصیبوں نے آج بھی آپؑ کی مخالفت کی۔ یہ آپؑ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ ہم ان کا قلع قمع کرنے آئے ہیں۔ یہ اللہ کا پھر بھی کرم ہے کہ اس نے ہمیں انسانی شکل میں بھیجا ہے۔

آج بھی یہ آپؑ کا حکم مان کر رک جاتے تو انہیں توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی۔ یہ عذاب سے بچ جاتے۔ یہ تو ان کے لیے آزمائش تھی۔ آپؑ بے فکر ہو جایئے، ان کا ہاتھ آپؑ تک نہیں پہنچ سکتا۔ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ آپ آخرِ شب میں اپنے گھر والوں کو لے کر اس بستی سے نکل جایئے۔ اور وَلَا يَلۡتَفِتۡ اور آپ میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔

مومن و کافر میں قلبی تعلق ممنوع:

مومن سے اللہ کریم تقاضا فرما رہے ہیں کہ کفر اور کافرانہ معاشرے سے اتنا تعلق بھی نہ ہونا چاہیے کہ جب وہ اللہ کے عذاب کو پالیں تو پھر مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ ان کے لیے اتنی معمولی تکلیف بھی نہ ہو کہ مڑ کر دیکھے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اتنا تعلق بھی نہیں ہونا چاہیے، کفر اللہ کی بارگاہ میں گستاخی ہے۔ انبیاءؑ کی شان میں گستاخی ہے۔ بہت بڑی محرومی ہے۔ مومن اور کافر کے دنیوی معاملات ہو سکتے ہیں قلبی رشتہ نہیں ہو سکتا۔

اہل بیت ایک اصطلاح:

نبیؑ کو ارشاد ہوا فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ رات کے کچھ پہر رہے آپؑ اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر اس بستی سے نکل جایئے۔ جتنے لوگ آپؑ پر ایمان لائے تھے، تھوڑے تھے یا بہت، مرد تھے یا خواتین سب آپؑ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان سب کو تو لوطؑ کے اہل بیت کہا گیا۔

اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اِلَّا امۡرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيۡبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمۡ ؕ لیکن آپؑ کی بیوی کہ وہ مڑ کر دیکھے گی۔

خاتونِ خانہ، اہلیہ کا شوہر سے تعلق باقی گھر والوں سے زیادہ قریبی ہوتا ہے۔ پھر وہ نبیؑ کی اہلیہ محترمہ تھیں لیکن آپؑ کی نبوت پر ایمان نہیں لائیں۔ ان کا میلانِ طبعی کافروں کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ہی کفار کو اطلاع پہنچائی کہ ان کے گھر نوجوان لڑکے آئے ہیں۔ پہلے بھی وہ اسی طرح کیا کرتی تھیں۔ ان کا قلبی تعلق چونکہ منکرین کے ساتھ تھا لہٰذا انجام بھی انہیں کے ساتھ ہوا۔

ایک اہم نکتہ:

یاد رہے تمام انبیاء علیہم السلام کی بیویاں کردار کے اعتبار سے ہمیشہ پاکیزہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيۡنَ وَالطَّيِّبُوۡنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور:26) پاکیزہ عورتیں، پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد، پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ عقیدے کے اعتبار سے ممکن ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں جیسے نوحؑ اور لوطؑ کی بیویاں ایمان نہ لائیں تو وہ بھی عذاب پانے والوں کے ساتھ تباہ ہو گئیں۔ اور فرعون جیسے شخص کی بیوی

ایمان لے آئی تو اس کا حشر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ اسے اللہ کریم نے ان عذابوں سے محفوظ رکھا۔ اپنا قرب اور اپنی رحمت سے نوازا۔

واضح ہو کہ نجاست دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک کفر کی نجاست۔ یہ وجود پر طاری ہوتی ہے۔ یہ خون یا گوشت میں نہیں مل جاتی۔ جب کلمہ پڑھ لے تو صاف ہو جاتی ہے۔ بداعمالی کی نجاست وجود میں ساری ہو جاتی ہے۔ لوگ جب چوری کرتے ہیں، رشوت لیتے ہیں، کسی کا حق مارتے ہیں تو ایسی برائی جو عملاً کی جاتی ہے وہ طاری نہیں ساری ہوتی ہے۔ وہ خون بن کر، گوشت اور ہڈیوں تک میں شامل ہو کر وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ عملی کردار کی نجاست، انبیاءؑ کی بیویوں میں نہیں ہوتی۔ یہ پاکیزہ ہوتی ہیں۔

ایمان ہر فرد کا ذاتی اختیار ہے۔ اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کفر کی نجاست طاری ہوتی ہے۔ سو سال تک بھی کوئی کافر رہے، ایک مرتبہ کلمہ پر ایمان لے آئے، کلمہ پڑھ لے تو طاری نجاست ڈھل جاتی ہے۔ لیکن ایک دن بھی حرام کھالیں، ساری عمر بھی کلمہ پڑھتے رہیں تو وہ دھلتا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ (حلیۃ الاولیاء)

فرمایا، جو گوشت حرام سے پرورش پاتا ہے یعنی ناجائز ذرائع رزق سے جسم کا جو حصہ بنا۔ خون، گوشت بنا وہ آگ ہی کا حق دار ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر نجات بھی دی گئی تو جسم کا وہ گوشت جہنم میں جلایا جائے گا۔ اس کی جگہ اللہ کریم نیا گوشت وجود کو عطا کریں گے جو نجات پا کر جنت میں جائے گا۔ اور جنت میں بھی یہ بات ان کے ساتھ ہمیشہ رہے گی کہ یہ جہنم سے پاک ہو کر نکلے ہیں۔

لہٰذا انبیاءؑ کی بیویوں میں ساری نجاست نہیں ہو سکتی۔ وہ نہیں ہو سکتی کہ ان کے وجود کے اندر دوڑ رہی ہو۔ ایسا وجود نبیؑ کے وجود کے ساتھ مس نہیں کر سکتا۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ط فرشتوں نے عرض کی ان کے عذاب کے وعدہ کا وقت صبح ہے۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی ان پر عذاب وارد ہوگا۔ جب ہر چیز نیند سے بیدار ہوگی، روشنی دیکھنے کی تمنا میں صبح طلوع ہو رہی ہوگی تو ان پر عذاب آ جائے گا۔ لَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ اب صبح قریب نہیں آ گئی۔ صبح دور تو نہیں۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ چنانچہ جب ہمارا حکم آ پہنچا تو اللہ کریم کی طرف سے پتھر برسائے گئے۔ ایسے پتھر تھے کہ ہر ایک کے نام کا ایک پتھر تھا۔ جب آسمان سے گرتا تو سیدھا اپنے نشانے پر جاتا۔ اس طرح وہ پتھروں سے کچلے گئے۔ جب پتھروں سے تباہ ہو گئے تو جبرئیل امین نے ساتویں تہہ تک زمین اکھیڑ لی۔ بخاری شریف میں حدیث ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جبرئیل امین زمین کو اکھیڑ کر

آسمانوں کے اتنا قریب لے گئے کہ جہاں تک مرغ کی بانگ سنائی دیتی ہے۔ وہاں سے انہوں نے زمین کو اُلٹا کر گرا دیا۔ جس جگہ سے زمین اکھیڑی اسی گڑھے میں پھینک دیئے گئے۔

آج بھی وہ جگہ موجود ہے۔ اسے بحیرہ مردار ہی کہتے ہیں۔ اس میں آج بھی کسی زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ کسی دریا سے بہہ کر اگر مچھلیاں آجائیں تو وہ مر کر پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہیں۔ اس میں نمکیات اتنے زیادہ ہیں کہ اگر آدمی پانی میں اتر جائے تو وہ پانی کی سطح سے نیچے نہیں جاتا، تیرتا رہتا ہے۔ اہل مغرب اور یہودیوں نے اس کو متبرک بنا رکھا ہے لوگوں کو باور کراتے رہتے ہیں کہ یہاں نہانے سے فلاں بیماری ٹھیک ہوجاتی ہے اور فلاں ٹھیک ہو جاتی ہے یہ کیسے عجیب لوگ ہیں کہ جہاں عذابِ الٰہی آیا وہاں سے انہیں برکات ملنے کی امید ہے۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۖ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾ جو لوگ غلط کار ہوتے ہیں، انبیاءؑ کی دعوت ٹھکرا دیتے ہیں، انؑ کی مخالفت کرتے ہیں، ان سے عذاب کبھی دور نہیں ہوتا۔ درمیان میں بس پردہ ہوتا ہے۔ اللہ جب پردہ ہٹا دے عذاب وارد ہوجاتا ہے۔ ان میں اور عذاب میں کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ جہنم میں ان میں کوئی دوری نہیں ہوتی۔ دنیا میں بھی اسی عذاب کے پرتو کے نیچے جی رہے ہوتے ہیں۔ اندر سے جلتے رہتے ہیں باہر سے بے شک اچھا لباس پہنے رکھیں، محلوں میں رہیں، عظیم الشان گاڑیوں میں بیٹھیں۔ جب پردہ ہٹتا ہے تو سیدھے عذاب میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ظالموں سے، بدکاروں سے اور ناخلف لوگوں سے عذاب کبھی دور نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ثمود کا تذکرہ گزرا ہے کہ برائی کرنے والوں نے اپنا انجام دیکھ لیا ظلم کرنے والوں کو ایک چنگھاڑ نے آپکڑا۔ ایک غیبی آواز اتنی سخت آئی کہ لوگوں کے دل پھٹ گئے اور مکان تک گر گئے۔ شہر اجڑ گئے اور یہ لوگ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ ایسی بربادی پھری جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔ اچھی طرح سن لیجیے کہ ثمود نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا۔ اس کی نعمتوں کا انکار کیا، اس کی عظمت کا انکار کیا، اس کے ساتھ شرک کیا، اپنے نبیؑ کی بات نہ مانی تو ان پر ایسا عذاب آیا کہ اس دنیا میں بھی تباہ ہوگئے اور عاقبت بھی تباہ ہوگئی اور ہمیشہ کے لیے انہیں پھٹکار پڑ گئی۔ اللہ کی رحمت سے محرومی ان کا مقدر بن گئی۔

اگر صالحؑ کا دامن تھام لیتے تو صحابیت سے سرفراز ہوجاتے۔ اللہ کے نبیؑ آنِ واحد میں کفر کی ظلمتوں سے نکال کر انہیں عظمتوں سے آشنا کردیتے۔ لیکن یہ ان کا اپنا انتخاب تھا۔ اللہ کریم نے انہیں چننے کا موقع دیا تھا کہ چاہیں تو نیکی کی طرف آجائیں لیکن انہوں نے کفر کا انتخاب کیا جس کے نتیجے میں ان کی دنیا بھی برباد ہوگئی اور آخرت بھی تباہ ہوگئی۔

سورۃ ھود رکوع 8 آیات 84 تا 95

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ
بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ
بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ
اَنْ نَّفْعَلَ فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ
يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ
وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا
اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾
وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ
قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا
رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ
كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ
لَرَجَمْنٰكَ ؗ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ

اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (بھیجا) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو بے شک میں تم کو آسودہ حال دیکھتا ہوں اور یقیناً مجھے تم پر ایسے دن کے عذاب کا ڈر ہے جو (تم کو) گھیر کر رہے گا ﴿۸۴﴾ اور اے میری قوم! ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے حد سے نہ نکلو ﴿۸۵﴾ اگر تم (میرے کہنے کا) یقین کرو تو اللہ کا دیا ہوا نفع ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں ﴿۸۶﴾ انہوں نے کہا اے شعیب (علیہ السلام)! کیا تمہاری نماز تم کو یہ سکھاتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جن کو پوجتے آئے ہیں ہم ان کو چھوڑ دیں یا اپنے مال میں جو چاہیں تصرف نہ کریں یقیناً تم تو بڑے نرم دل (اور) راست باز ہو ﴿۸۷﴾ انہوں نے فرمایا اے میری قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنے ہاں سے مجھے عمدہ دولت (نبوت) بخشی ہو (تو کیسے تبلیغ نہ کروں) اور میں نہیں چاہتا کہ جس کام سے میں تم کو منع کروں تمہارے برخلاف وہ خود کرنے لگوں میں تو جس قدر مجھ سے ہو سکے اصلاح چاہتا ہوں اور مجھ کو جو توفیق

ہوجاتی ہے صرف اللہ ہی (کی طرف) سے ہے۔ میں اُسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ﴿۸۸﴾ اور اے میری قوم! میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرادے کہ جو مصیبت نوح (علیہ السلام) کی قوم پر یا ھود (علیہ السلام) کی قوم پر یا صالح (علیہ السلام) کی قوم پر واقع ہوئی تھی وہی تم پر واقع ہو اور لوط (علیہ السلام) کی قوم (کا زمانہ) تم سے کچھ دور نہیں ﴿۸۹﴾ اور اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو اور پھر اس کے آگے توبہ کرو بے شک میرا پروردگار (اللہ) بڑا مہربان محبت والا ہے ﴿۹۰﴾ انہوں نے کہا اے شعیب! (علیہ السلام) تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور بے شک ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہم میں کمزور بھی ہو اور اگر تمہارے بھائی بند نہ ہوتے تو ہم ضرور تم کو سنگسار کر دیتے اور ہماری نظروں میں تمہاری کوئی توقیر نہیں ﴿۹۱﴾ انہوں نے فرمایا اے میری قوم! کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک اللہ سے زیادہ باتوقیر ہے اور اس کو تم نے پس پشت ڈال دیا بے شک میرا پروردگار تمہارے سب اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے ﴿۹۲﴾ اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ یقیناً میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں تم کو جلد ہی معلوم ہوا جاتا ہے کہ کس پر ایسا عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر دے اور کون جھوٹا ہے۔ اور تم بھی منتظر رہو بے شک میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں ﴿۹۳﴾ اور جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے شعیب (علیہ السلام) کو اور جو اہل ایمان ان کے ہمراہی تھے اپنی رحمت سے بچالیا اور ان ظالموں کو سخت چنگھاڑ نے آ پکڑا پھر وہ صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے گویا کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے ﴿۹۴﴾ جان لو! کہ مدین کو ایسی ہی پھٹکار (رحمت سے دوری) ہوئی جیسی ثمود کو پھٹکار (رحمت سے دوری) ہوئی تھی۔ ﴿۹۵﴾

تفسیر و معارف

اللہ کریم نے اکثر اقوام کا ذکر کرتے ہوئے ان میں جو انبیاءؑ مبعوث فرمائے انہیں اَخَاھُمْ ان کے بھائی کے لقب سے یاد کیا۔ حالانکہ قوم کافر تھی، تباہ ہوگئی تو پھر نبیؐ ان میں کون سا بھائی چارہ رہا۔ اَخَاھُمْ کہنے سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی قوم میں کوئی غیر بشر مبعوث نہیں کیا گیا۔ بااعتبار انسان ہونے کے، انسانیت کے ناطے سے نبیؐ بھی ویسے ہی انسان ہوتے ہیں جیسے دوسرے ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ دوسرے اللہ سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور انبیاء اللہ کے بہت قریب چلے جاتے ہیں۔ لیکن انسانی خصوصیات تمام کی تمام انبیاءؑ میں ہوتی ہیں۔ اور یہ کہنا کہ نبیؐ بشر نہیں ہوتا اس کی نبوت کا انکار ہے کیونکہ سوائے عالم بشریت کے کسی دوسری مخلوق کو نعمتِ نبوت عطا نہیں ہوئی۔ ہم بشریتِ انبیاء کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ ہم خود کو بشر سمجھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں نبیؐ ہمارے جیسا تو نہیں ہونا چاہیے۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہم بشر ہیں بھی کہ نہیں۔ بشریت کا معیار انبیاءؑ ہیں۔ جتنا ہم ان کے تابع ہیں اتنی ہم میں بشریت ہے۔ جتنا ہم ان کی اطاعت سے باہر ہیں اتنی ہمارے میں انسانیت کی کمی ہے۔ جیسا کہ نہ ماننے والوں کے لیے ارشاد باری ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط (الاعراف:179) یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ جانوروں میں تو یہ شعور اور استعداد ہی نہیں یہ انسانی شعور اور استعداد رکھتے ہوئے اس نعمت سے محروم ہیں۔

فرمایا! ثمود کے بعد ہم نے مدین میں ان کے بھائی شعیبؑ کو مبعوث فرمایا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط کم و بیش سوا لاکھ کے قریب انبیاءؑ اور رسل مبعوث ہوئے۔ تمام نبیوںؑ، تمام رسولوں کا پہلا جملہ یہی ہے کہ اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ جو لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم ان کو تو اس لیے راضی کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب پہنچا دیں لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ (الزمر:3) ہم بالذات ان کی پوجا نہیں کرتے۔ یہ تو نیک لوگوں کے بت ہیں انہیں چونکہ قرب الٰہی حاصل ہے تو ہم انہیں راضی رکھتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب پہنچا دیں۔ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے انسان ہر برائی کا جواز گھڑ لیتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ عبادت کیا ہے۔

عبادت کا مفہوم:

علماء نے لکھا ہے کہ نفع کی امید یا نقصان کے اندیشے سے کسی کی اطاعت کرنا عبادت ہے۔ صرف صلوٰۃ عبادت نہیں ہے۔ ہاں صلوٰۃ بھی عبادت ہے۔ صرف روزہ عبادت نہیں ہے۔ روزہ بھی عبادت ہے۔ صرف حج عبادت نہیں۔ حج بھی عبادت ہے۔ کوئی کام عبادت سے خالی نہیں ہے ہر کام عبادت ہے۔ اب وہ عبادت کس کے

لیے ہے؟ کس کی ہے؟ یہ الگ بات ہے۔ وہ کام ہم کس کی رضا کے لیے کر رہے ہیں؟ کس سے ہماری امید وابستہ ہیں؟ یہ رویہ تو روزمرہ کے مشاہدے میں نظر آتا ہے کہ لوگ کس کس طرح بڑے بڑے لوگوں کی خوشامدیں کرتے ہیں اور کس طرح بچھ بچھ جاتے ہیں یہ بھی عبادت ہے۔ اب وہ اس فرد کی عبادت کر رہے ہیں کہ اس سے مجھے کچھ ملے گا۔ یہ ناراض ہو جائے گا تو میرا کچھ چھن جائے گا۔ تو انسانوں سے معاملات انسانی سطح پر رکھنا تو درست ہے لیکن کسی سے امیدیں وابستہ کر لینا یہ درست نہیں ہے یہ مقام اللہ کا ہے اور یہ اتنی باریک بات ہے اس سے بچنا آسان نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کسی کو توفیق دے ہم تو معمولی سی بات پہ کسی سے ڈر جاتے ہیں۔ کسی سے امید لگا لیتے ہیں۔ جب یہ ساری امیدیں اللہ کے سوا سب سے ختم ہو جائیں۔ جب سارے خوف اللہ کے سوا سب سے ختم ہو جائیں تب پتہ چلتا ہے کہ توحید باری ہے کیا! تو گزشتہ اقوام میں جتنے نبی مبعوث ہوئے سب نے یہ دعوت دی اعبدو اللہ عبادت صرف اللہ کی کرو۔ دوسروں سے معاملات کرو تم بھی مخلوق ہو وہ بھی مخلوق ہیں۔ ان سے معاملات کرو خوبصورتی سے کرو، اچھے طریقے سے کرو۔ نہایت متین سنجیدہ طریقے سے، شرافت سے کرو۔ لیکن امیدیں اللہ کی بارگاہ سے رکھو۔

مریدوں کو امیدیں پیر صاحبان سے ہو جاتی ہے۔ پیر صاحب کو امیدیں مریدوں سے ہو جاتی ہیں کہ میری حاجت روائی یہ کریں۔ عجیب سا انسانی معاشرہ ہے۔ عجیب ماحول ہے۔ کوئی چاہتا ہے کہ میں بڑا بدنام ہو جاؤں تو میری دہشت پھیل جائے گی۔ کوئی چاہتا ہے کہ میں بڑا پارسا مشہور ہو جاؤں تو لوگ میری خدمت کریں گے۔ یہ ساری راہ حق کی رکاوٹیں ہیں۔ جب یہ سمجھ آ جائے کہ میں محض ایک بندہ ہوں۔ مالک اللہ ہے۔ ساری خوبیاں اس کے لیے ہیں۔ میں محض ایک محتاج بندہ ہوں جس کی ساری امیدیں اللہ سے وابستہ ہیں۔ وہ مالک ہے جس حال میں وہ رکھے گا اس حال میں مجھے رہنا ہے۔ مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کیوں کرنا ہے؟ اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ مخلوق سے دین کے اندر، شریعت کے اندر تعلقات اس طرح رکھنے ہیں، اس لیے رکھنے ہیں کہ اللہ راضی ہو جائے۔ کسی پر احسان نہیں۔ مخلوق سے بگڑنا کس بات کے لیے ہے جس بات کا حکم اللہ دے۔ جتنا حکم دے اتنا بگڑنا ہے۔ اپنی خواہش کو دخل نہ دے۔ اب یہ بندہ خود بیٹھ کر تنہائی میں سوچے کہ کرنا کتنا مشکل ہے یا آسان ہے۔ تو سمجھ آتی ہے کہ یہ تو بہت مشکل ہے۔ چنانچہ شعیبؑ نے بھی قوم کو دعوت دی کہ صرف اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ اس کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں جو لائق عبادت ہے جس سے تم امیدیں وابستہ کرو۔ جس سے ڈرو۔

اہل مدین کا مسئلہ یہ تھا کہ یہ درختوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ آج کل ہندوؤں میں وہ رسم ابھی تک جاری

ہے۔ یا ان لوگوں نے وہاں سے لی یا ان میں سے کوئی لوگ ادھر آ گئے تو وہ درختوں کی پوجا کرتے تھے۔ ان میں دوسری خرابی یہ تھی کہ لین دین میں بددیانتی کرتے تھے۔ یہ دونوں باتیں ہندوؤں میں مستقلاً پائی جاتی ہیں جوان کے مزاج کا حصہ ہے۔ کسی زمانے میں سونے کا سکہ چلتا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا سونا کھرچ لیتے۔ تو تھوڑا تھوڑا جمع کرتے رہتے اور سکے کو پوری قیمت پر چلا لیتے۔ جب مال دیتے تو تھوڑا سا کم ہوتا اور تول پورا دکھا کر دے دیتے۔ جب لیتے تو تھوڑا سا فالتو لے لیتے۔ یعنی اگر ایک سیر دینا ہو تو پندرہ چھٹانک دیتے اور اگر لینا ہے تو سترہ چھٹانک لیتے۔ تو دونوں باتوں پر اللہ کے نبیؑ نے توجہ دلائی کہ ایک بات تو یہ ہے کہ اپنی امیدیں اللہ سے وابستہ کرو اور اللہ کی اطاعت کرو۔ اور سب سے پہلے اللہ کے سوا دوسروں سے امیدیں چھوڑ دو۔ کوئی ہے ہی نہیں تم نے محض فرض کر رکھا ہے۔ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اور لین دین میں بددیانتی نہ کرو۔ ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ میں دیکھتا ہوں تم بڑے آسودہ حال ہو۔ تم پر اللہ کی رحمت ہے۔ تمہارے پاس مال و دولت ہے، اولاد ہے، آباد شہر ہیں، اچھے بھلے دولت مند ہو تو پھر یہ کیوں کرتے ہو۔ کہ کسی کا حق مار لیا، حق سے زیادہ لے لیا وَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ مجھے تم پر ایسے عذاب کا ڈر ہے جو تمہیں گھیر لے گا، بے بس کر دے گا، تباہ کر دے گا۔ علماء فرماتے ہیں کہ جس قوم میں ناپ تول میں کمی آ جائے اس پر تنگ دستی مسلط کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ:124) تنگ دستی کہا گیا ہے۔ اس کی انتہائی صورت یہ ہوتی ہے کہ چیزیں ملتی ہی نہیں ملنا کم ہو جاتی ہیں لیکن اس کی آخری صورت میری رائے کے مطابق یہ ہوتی ہے کہ آپ کے پاس وسائل ہیں چیز نہیں ملتی۔ وہ بھی تنگی ہے کہ بندے کے پاس وسائل کم ہو جاتے ہیں۔ اس کے پاس پیسہ ہی نہیں ہے تو خریدے گا کیا؟ بازار بھرا پڑا ہے لیکن پیسہ پاس نہیں ہے تو نہیں خرید سکتا۔ یہ تنگی کی ایک صورت ہے لیکن عذاب الٰہی کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ پیسہ پاس ہے چیز نہیں مل رہی۔ جیسے آج کل پیسے جیب میں ہیں پٹرول نہیں مل رہا، گیس نہیں مل رہی۔ پیسے دیتے ہیں بجلی نہیں مل رہی۔ بل دیتے ہیں پانی نہیں آ رہا۔ دوا نہیں مل رہی۔ پیسے دیتے ہیں دوا اصلی نہیں ملتی نقلی ملتی ہے۔ پیسے اصل سے بھی دوگنا دیتے ہیں دوا نقلی ملتی ہے۔ یہ ہے مَعِيْشَةً ضَنْكًا اس کا مطلب یہ ہے کہ شائد قومی طور پر ہم میں بھی یہ بددیانتی آ چکی ہے۔ لین دین کے معاملے میں ہم بددیانت ہو چکے ہیں۔ یہ عذاب الٰہی کی صورت ہے کہ قوت خرید ہے لیکن اشیائے ضرورت میسر نہیں ہیں۔

علاج:

ہر مرض کا علاج اس مرض کے سبب کو دور کرنے میں ہے۔ درست طریقہ یہ ہے کہ پہلے بیماری کا سبب

دریافت کیا جائے بیماری کے اثرات نہیں۔ آپ اثرات دور کرتے رہیں گے تو مرض ختم نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو بخار ہو جائے اور اس کے اوپر برف رکھ دی جائے تو جسم ٹھنڈا ہو جائے گا لیکن جب برف پگھل جائے گی تو بخار باقی رہے گا اس لیے کہ یہ بخار تو کسی اور وجہ سے ہے یہ باہر کی گرمی کی وجہ سے تو نہیں ہے۔ جلد پر آپ نے برف رکھ دی۔ جلد ٹھنڈی ہو گئی لیکن جب تک بخار کے سبب کو دور نہیں کیا جائے گا بخار تو رہے گا۔ کسی زخم کی وجہ سے بخار ہے تو زخم کا علاج کرو۔ وہ ٹھیک ہو گا بخار بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ جسم کے اندر کو خرابی ہے معدے میں کوئی گرمی سردی ہے خون میں کوئی خرابی ہو گئی ہے تو اس کا علاج کرو بخار ٹھیک ہو جائے لیکن لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اس ساری تنگی کا سبب کیا ہے؟ باقی علامات کا علاج، عارضی علاج ہے۔ صحیح علاج یہ ہے کہ اس بیماری کا اصل سبب تلاش کیا جائے اسے دور کیا جائے تو بیماری از خود دور ہو جائے گی۔

آج کے دور کو اپنی مادی ترقی پر بڑا ناز ہے۔ لیکن ہم سے بہت پہلے جو قومیں گزری ہیں مادی ترقی میں وہ ہم سے بھی بہت آگے تھیں۔ پچھلے دنوں ایک مادہ دریافت ہوا صدیوں کی دفن شدہ ایک بوتل سائنسدانوں کو مل گئی ایک سیال مادہ تھا۔ ایسا تھا کہ اسے ایک خاص قسم کے پتھر پر ڈالیں تو وہ پتھر نرم ہو جاتا اسے آٹے کی طرح گوندھ سکتے۔ اسے گوندھ کے مختلف شکلیں بنا سکتے۔ اور پھر اسے رکھیں تو وہ سوکھ جاتا ہے۔ اب یہ کمال نوحؑ کی قوم کے پاس تھا۔ ان کے پاس بجلی تو نہیں تھی لیکن وہ سیال مادہ ان کی دریافت تھا اور انہوں نے ان پتھروں سے بڑے بڑے ستون (PILLAR) اور مختلف قسم کی صورتیں بنالی تھیں۔ جو دن میں سورج کی روشنی سے چارج ہو جاتی تھیں اور ساری رات روشنی دیتی تھیں۔ گلیاں، بازار روشن رہتے تھے۔ سڑکیں روشن رہتی تھیں۔ سائنس سے تو وہ سیال مادہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔ بلکہ وہ جو ایک بوتل انہیں ملی تھی اس کا تجزیہ کر رہے تھے کہ وہ بھی گر کر ضائع ہو گئی۔ لیکن سائنسدانوں کو یہ سمجھ آ گئی کہ وہ لوگ ان معاملات میں ہم سے بہت آگے تھے۔ اللہ کریم نے تمام انسانوں کو اذہان دیئے ہیں وہ مادی چیزیں سوچتے ہیں لیکن جب اللہ کریم سے دور ہو جائیں تو مادی ترقی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی بھی گمراہی کا سبب یہی تھا کہ وہ مادی ترقی بہت کر چکے تھے لیکن نبیؑ کی نبوت پر ایمان نہ لا کر محروم تھے۔ اور جب نوحؑ اپنا بحری جہاز بنا رہے تھے تو وہ دیکھ کر مذاق اڑایا کرتے تھے کہ انہیں دیکھو یہ صحرا میں جہاز چلائیں گے۔ کشتی بنا رہے ہیں تو ریگستان میں بنا رہے ہیں۔ ریت پر جہاز چلائیں گے لہٰذا ان کی بات پر یقین نہ کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مادی ترقی ذہنی ایجاد ہے۔ اور یہ اللہ کی عطا ہے۔ تمام چیزوں کا خالق صرف وہ ایک ذات ہے۔ یہاں تو کوئی ایک جملہ لکھ لے تو کہتا ہے میں اس جملے کا خالق ہوں۔ اس کتاب کا خالق ہوں، اس غزل کا خالق ہوں حالانکہ خالق وہ ہے جس نے چیزوں کو عدم سے وجود دیا۔ ان ان وجودوں کو جمع کر کے ایک نئی چیز بنانے والا اگر خالق ہے تو پھر ساری عورتیں

خالق ہیں جو چند مختلف چیزوں کو ملا کر مزیدار سالن بنا لیتی ہیں۔ ایسے ہی سائنسدان مختلف چیزوں کو ملا کر کوئی نئی چیز بنا لیتے ہیں۔ خالق بہت وسیع المعانی لفظ ہے۔ اور یہ صرف اللہ کریم کی ذات پر صادق آتا ہے۔ یہ اس کی صفت ہے۔ تو حضرت شعیبؑ نے انہیں فرمایا کہ تم لینے دینے میں بددیانتی کرتے ہو حالانکہ تم محتاج فقیر نہیں ہو۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ کسی محتاج کے لیے بددیانتی جائز ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ محتاج لالچ کرے تو سمجھ میں آتا ہے۔ تم تو اچھے خاصے کھاتے پیتے ہو۔ ہر نعمت تمہارے پاس موجود ہے پھر تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ اور فرمایا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم پر ایسا عذاب آجائے گا جو جدھر جاؤ گے آگے کھڑا ہوگا۔

آیہ مبارکہ ایک آئینہ:

جیسے آج کل ہم، اللہ ہمیں معاف کردے اور اس مصیبت سے نجات دے دے اور توفیق دے دے کہ ہم اپنی اصلاح کریں۔ ہم جدھر جائیں آگے سے مصیبت کھڑی ہے۔ کوئی چیز لینے جائیں کوئی چیز بیچنے جائیں کسی سمت منہ کریں علاج کے لیے جائیں تو مصیبت ہے کوئی کام کرنے جاؤ تو مصیبت ہے پنشن لینے جاؤ، تنخواہ لینے جاؤ تو اگلے رشوت مانگتے ہیں۔ کیا مصیبت ہے؟ کیا یہ عذاب الٰہی نہیں ہے کہ ایک شخص نے بیس سال تیس سال ملازمت کی پنشن اس کا حق ہے لیکن لینے جاؤ تو پھر رشوت دو گے تو ملے گی نہیں تو دھکے کھاتے آؤ گے۔ صاحب اقتدار ہی نہیں عام آدمی بھی اسی بددیانتی میں ملوث ہے۔ بازار سے کوئی چیز خریدیں اس میں ملاوٹ ہے۔ اچھی گندم میں خراب گندم ملا کر اعلیٰ قیمت پر بیچتے ہیں۔ قصاب مردار گوشت کو تازہ کہہ کر بیچ دیں گے کیسی قوم ہے؟ کس بات پر کن نتائج کی ہم توقع رکھتے ہیں۔ بیجتے کیا ہیں کاشت کیا کرتے ہیں! اور برداشت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ عذاب الٰہی ہے۔ جس کا علاج ہے کہ ہم توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان شاء اللہ یہ سارے معاملات درست ہوجائیں گے۔ ہر کوئی دیانت اور امانت سے کام کرنا شروع کرے گا تو رشوت ختم ہوجائے گی۔

تو یہ بات حضرت شعیبؑ نے قوم کو سمجھائی کہ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم آسودہ حال ہو اور مجھے ڈر ہے کہ باوجود آسودہ حالی کے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پیسے اٹھائے پھرتے ہو اور تمہیں کوئی چیز نہ ملے۔ یہ اللہ کا عذاب ہے تمہیں گھیر لے اور تم پریشان ہوجاؤ یٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ اے میری قوم ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو لینے میں بھی دینے میں بھی قیمت بھی پوری لو، مال بھی پورا لو، خریدتے ہو تو قیمت بھی پوری دو۔ اور مال بھی پورا لو اور انصاف کے ساتھ کرو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اشیاء تم لوگوں کو کم چیزیں دینے کا رجحان چھوڑ دو۔ ناپ تول میں کمی کا رجحان چھوڑ دو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ کیونکہ یہ جو ناپ تول

کی کمی ہے یہ زمین پر فساد بپا کر دیتی ہے اور تم ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ گے۔ تم ایک دوسرے کو قتل کرنے لگ جاؤ گے تباہی آجائے گی۔ اس سے توبہ کرو اور اپنی اصلاح کرو۔

فرمایا وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ روئے زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔ یہ ناپ تول میں کمی بددیانتی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ بھی ناپ تول میں کمی ہے کہ ایک آدمی تنخواہ پوری لے لیتا ہے اور کام پورا نہیں کرتا۔ کسی چیز کی اجرت پوری لے لینا اور اس کو بھرپور طریقے اور انصاف سے ادا نہ کرنا یہ ساری ناپ تول میں کمی ہے۔ خواہ وہ دفتر میں ہو یا ملازمت۔ ایک طبیب فیس لے لیتا ہے اور مریض کی پروا نہیں کرتا تو یہ بھی ناپ تول میں کمی ہے۔ وکیل فیس لے لیتا ہے اور مدعی دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ وہ کہیں ہڑتال پر ہوتا ہے کبھی کہیں ہوتا ہے۔ مدعی کے وہ قابو نہیں آتا۔ مجسٹریٹ تنخواہ لے لیتا ہے اور مقدموں کا فیصلہ نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے تو دفتر آتا ہے، اسی طرح کام پورا لینا اور اس کے معاوضے یا اجرت میں ڈنڈی مار جانا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ فرمایا! اس سے زمین پر فساد پھیلے گا۔ تم پر ایسی مصیبت آئے گی کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے پھرو گے۔

دہشت گردی کا علاج:

ہم اپنا حال آج دیکھیں تو ہم اسی آیت کا مصداق ہیں۔ مارنے والے کو پتہ نہیں کہ میں نے کس کو مار دیا۔ مرنے والے کو پتہ نہیں کہ مجھے کس نے مار دیا۔ کیوں مار دیا؟ اب دہشت گردی روکنے کے نعرے لگ رہے ہیں۔ دعوے ہو رہے ہیں لیکن رکنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کا اصل سبب کوئی تلاش نہیں کرتا۔ اس کا سبب حکمران طبقے کی بددیانتیاں ہیں، عیاشیاں ہیں۔ بددیانتی ہے کہ عہدے مراعات پوری لیتے ہیں کام پورا نہیں کرتے۔ عام آدمی سے بھی جس قدر ہو سکتا ہے وہ بھی اپنا پورا حصہ ڈالتا ہے۔ لوگ قتل ہو رہے ہیں اور حکمران فتوے دے رہے ہیں کہ مارنے والے مسلمان نہیں اور ہم ان کی مذمت کرتے ہیں۔ حکمرانوں کا کام مذمت کرنا نہیں مجرموں کو سزا دینا ہے۔ مظلوموں کو انصاف بہم پہنچانا ہے۔ دہشت گردی کا علاج صرف عدل کرنے میں ہے۔ ظالم سے بھی عدل اور مظلوم سے بھی عدل یہ عین اسلام ہے۔ اب اس پر ایک وقت آتا ہے کہ فصل پک جاتی ہے۔ اور یہ فصل پک گئی ہے۔ اس کا پھل بھی سمیٹ رہے ہیں۔

بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ فرمایا، اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ کا دیا تمہارے لیے کافی ہے۔ جو حلال وسائل سے جائز وسائل سے آتا ہے اس پر قناعت کرو۔ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾ اور یہ یاد رکھو میں نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ میں تم پر داروغہ نہیں لگا ہوا کہ میں ہاتھ، کان سے پکڑ کر تمہاری اصلاح کروں

تمہیں اپنی اصلاح خود کرنی ہے۔ میں نے کوئی ڈنڈا چلا کر تمہاری اصلاح نہیں کرنی۔ ہاں میرا کام ہے کہ اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دوں۔ آگے معاملہ تمہارے اور تمہارے اللہ کے درمیان ہے۔ اگر تم توبہ کرو گے وہ غفور رحیم ہے۔ اپنی اصلاح کرو گے تو وہ عذاب اٹھالے گا، نعمتیں عام کردے گا۔ اگر باز نہیں آؤ گے تو عذاب بڑھتا جائے گا اور بالآخر تباہ ہو جاؤ گے۔

قلوب کی مشابہت:

شعیبؑ نے قوم کو غیر اللہ کی پرستش سے روکا، عظمت الٰہی کی دعوت دی اور فرمایا، اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اس بات کا ان سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگے۔ اے شعیب (علیہ السلام) یہ آپ کی نماز آپ کو یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کا نظریہ، عقیدہ اور طریقہء عبادت چھوڑ دیں اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ﴿۸۷﴾ یقینا آپ تو بڑے نرم دل اور راست باز ہیں۔ آپ تو بڑے کھرے، صحیح کام کرنے والے اور باکردار انسان ہیں۔

اللہ کی شان ہے اللہ کریم شروع سے انبیاءؑ کی ایسی نگہداشت فرماتے ہیں کہ یہ معصوم عن الخطاء ہوتے ہیں۔ نبیؑ سے کسی گناہ کا کوئی تصور نہیں ہوتا لہٰذا دشمن بھی، کفار بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اب تک جو آپ کی عمر گزری، آپ بڑے نرم دل، بڑے نیک، بڑے راست باز، سچی بات کرنے والے، اچھا کام کرنے والے ہیں۔ پھر آپ (علیہ السلام) اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں تو ٹھیک ہے پڑھتے رہیں۔ آپ کی نمازیں آپ کے لیے ہیں ہم جو کرتے ہیں وہ ہمارے لیے ہیں اور آپ (علیہ السلام) کی نمازیں کیا یہ سکھاتی ہیں کہ جو ہم کرتے ہیں وہ بھی چھوڑ دیں؟ دلوں کے احوال میں یہ بڑی عجیب بات ہے کہ دلوں کو کسی نہ کسی سے مشابہت ہو جاتی ہے۔ یا انبیاءؑ سے یا کفار سے اور پھر شیطان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ الفاظ جو بڑے بڑے کفار کے منہ سے نکلے ہیں وہی الفاظ لوگوں کے منہ سے ادا کرائے تاکہ یہ بھی جا کر ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ جو اعتراضات مشرکین مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے آج بھی جو لوگ زبان درازی کرتے ہیں وہی باتیں دہراتے ہیں اور جو پہلے انبیاءؑ پر اعتراض ہوتے تھے وہ آج بھی ہوتے ہیں۔ آج بھی لوگ یہ کہتے ہیں کہ تمہاری نمازیں اور تمہاری عبادات ہم پر تنقید کرنے کے لیے ہیں۔ بھئی تم پڑھتے ہو تو اپنے لیے پڑھتے رہو۔ ہمیں کیا کہتے ہو؟ ہم جو کرتے ہیں کرنے دو۔ جب ان کی قوم لاجواب ہوئی تو شعیبؑ سے یہی بات کہنے لگی قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (آپ علیہ السلام) کی نماز آپ کو یہ سکھاتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جو کرتے ہیں ان کی پوجا ہم چھوڑ

دیں اوران کی عبادت کرنا چھوڑ دیں حالانکہ آپ تو بڑے نرم دل اور نیک خو ہیں۔

تبلیغ کا طریقہ:

انہوں نے فرمایا۔ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ اس بات کو نہ دیکھو کہ میں زیادہ عبادت کرتا ہوں یا میں زیادہ اللہ اللہ کرتا ہوں یا زیادہ نمازیں پڑھتا ہوں اور تم نہیں پڑھتے۔ بات یہ ہے کہ جو بات میں کر رہا ہوں اس پر میرے پاس دلائل ہیں یا نہیں۔ بات دلیل کی کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس پر میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس دلائل ہیں۔ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ط اور اللہ کریم نے پروردگارِ عالم نے، میرے ربّ نے مجھے نبوت بخشی ہے۔ بہت بڑی نعمت عطا فرمائی ہے رِزْقًا حَسَنًا ط رزق کا معنی ہوتا ہے جو چیز اللہ کی طرف سے عطا ہو۔ ہم نے تو رزق کو کھانے پینے تک محدود کر دیا ہے۔ جو بھی نعمتیں اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہیں انہیں رزق کہا جاتا ہے۔ تو فرمایا! کہ مجھے تو اللہ کریم نے بہترین نعمت یعنی نورِ نبوت عطا فرمایا ہے۔ جب اللہ نے مجھے نبیؑ مبعوث فرمایا ہے تو میں کیسے تبلیغ نہ کروں۔ نبوت کا مقصد ہی تبلیغ کرنا ہے اور نبیؑ کی تبلیغ بغیر دلائل کے نہیں ہوتی۔ نبی بلا دلیل ارشاد نہیں فرماتا۔ لہٰذا تم یہ دیکھو کہ جو بات میں تمہیں کہہ رہا ہوں وہ کتنی سچی اور مبنی برحق ہے اور میں اس پر تمہیں دلائل دے رہا ہوں کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کوئی دلیل ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے۔ میں تو دلیل سے بات کر رہا ہوں کہ تمہارا خالق اللہ ہے۔ وہی تمہارا رازق ہے، پروردگار ہے، ربّ ہے، ہر نعمت تمہیں دے رہا ہے لہٰذا عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔ میں اللہ کا بھیجا ہوا نبیؑ ہوں اور نبوت کا مقصد ہی اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ وہ پیغام میں دلیل سے پہنچا رہا ہوں اور یہ بھی دیکھ لو کہ جن کاموں سے تمہیں روکتا ہوں وہ کام میں نہیں کرتا۔

تبلیغ کا یہی سلیقہ ہے جن باتوں کی دوسروں کی تبلیغ کی جائے ان پر خود عمل پیرا بھی ہوا جائے چونکہ تبلیغ اور کردار ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لہٰذا مبلغ کی عملی زندگی، اس کا کردار اس کے قول کے مطابق ہونا چاہیے۔ انبیاءؑ تو فطری طور پر معصوم عن الخطا ہوتے ہیں اور عام آدمی تو غلطی سے پاک نہیں ہوتا لہٰذا عام آدمی کے لیے یہ عجیب نسخہ ہے کہ جب وہ کسی نیک بات کی اشاعت کرتا ہے، دوسروں کو کسی برائی سے روکتا ہے تو اگر اس کی طبیعت صالح ہو، دل بگڑ نہ چکا ہو، نورِ ایمان باقی ہو تو تبلیغ کی برکت سے اس کی اپنی اصلاح ہو جاتی ہے۔ وہ برائیوں سے تائب ہو جاتا ہے اور ان نیکیوں کو اپناتا ہے جن کی وہ تبلیغ کر رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ پہلے اپنی اصلاح کر کے بات کرے تو پھر اس کی بات میں

بہت قوت ہوتی ہے اور دوسروں کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔

فرمایا اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ میرا مقصد تمہاری مخالفت نہیں ہے بلکہ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میں جو برائیاں ہیں تم ان سے بچ جاؤ، نیکی کی طرف آ جاؤ اور تمہاری اصلاح ہو جائے لیکن میں وہی کر سکتا ہوں جو میرے بس میں ہے۔ آگے تو ہر فرد کا معاملہ اللہ کریم کے ساتھ ہے۔ جیسی جس کی نیت ہے، ارادہ ہے ویسی ہی اس کو جزا ملے گی۔ میری کوشش ہے کہ میں اپنی پوری قوت سے اپنا فریضہ ادا کروں کہ تمہاری اصلاح ہو جائے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ لیکن میری دلسوزی سے کی گئی کوشش ہی میرے بس میں ہے اس کا نتیجہ میرے بس میں نہیں۔ یہ صرف اللہ کے بس میں ہے، میں تمہارا دل پھیر نہیں سکتا، میں تمہارے ارادے کو بدل نہیں سکتا اور نہ تمہارا کردار زبردستی تبدیل کر سکتا ہوں۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ کس کو کتنی ہدایت دیتا ہے اور وہ ہر فرد کو اتنا عطا فرماتا ہے جتنی اس کی طلب ہوتی ہے۔ جتنا اس کے دل میں خلوص ہوتا ہے۔ جس خلوص دل سے بندہ چاہتا ہے اس سے زیادہ اللہ کریم اسے عطا فرماتا ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری دوستی، دشمنی سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم میری بات مانو گے تو میں بڑا ہو جاؤں گا۔ اور میں اللہ کی طرف ہی رجوع کرتا ہوں۔ وہی میرا مددگار ہے۔ اگر تم میری مخالفت کرو گے تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ میرے ساتھ میرا اللہ ہے۔ تمہاری اصلاح ہو جائے تو یہی میرا مقصد ہے۔

نبیؑ کی دشمنی تباہی ہے:

پھر نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ تم مجھے اپنی رسومات کا دشمن سمجھتے ہوئے میرے ساتھ دشمنی مت پالو۔ نبیؑ کی دشمنی تباہ کر دیتی ہے۔ تم میرے ساتھ دشمنی مول نہ لو میری مخالفت تمہیں اسی انجام کی طرف نہ لے جائے جیسی مصیبت سے نوحؑ کی قوم، ہودؑ کی قوم کی قوم دوچار ہوئی۔ اور لوطؑ کی قوم کا زمانہ تو تم سے کچھ بھی دور نہیں۔

یاد رہے نبیؑ کی نبوت کا انکار کفر ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر اپنی بات پر اصرار کرنا اور اللہ کے نبیؑ کو اس بات پر مجبور کرنے کے لیے کوشاں ہو جانا کہ وہ اپنی دعوت حق سے باز آ جائیں اور اس پر اللہ کے نبیؑ کا مقابلہ کرنا،

عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے۔ ایسا کرنے والے ہمیشہ تباہ ہوئے ہیں۔ فرمایا، ایسا نہ کرو۔ دیکھو جنہوں نے پہلے انبیاء کے ساتھ دشمنی مول لی ان کا کیا حشر ہوا۔ میرے ساتھ دشمنی تمہیں اس حد پر نہ لے جائے کہ تمہارا بھی وہی حشر ہو جو نوحؑ کی قوم کا ہوا یا ہودؑ کی قوم کا یا صالحؑ کی قوم کا۔ اور لوطؑ کی قوم کو تو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان سب قوموں کی تباہی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے اپنے نبیؑ سے دشمنی مول لی تھی۔

کسی نبیؑ کا لوگوں سے مال و دولت یا جائیداد کا یا کسی دنیوی مفاد کا جھگڑا نہیں تھا بات صرف یہ تھی کہ اللہ کے نبیؑ اللہ کی واحدنیت کی دعوت دیتے تھے۔ جو رسومات و رواجات حق کے خلاف تھیں۔ کفریہ و شرکیہ اور باطل تھیں ان سے منع فرماتے تھے لیکن وہ لوگ ان کو جاری رکھنے پر اصرار کرتے تھے اور نبیؑ کی مخالفت میں دشمنی کی حد تک چلے جاتے تھے۔

اہل اللہ کی دشمنی دو عالم کا نقصان ہے:

علمائے حق لکھتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندوں سے اگر کوئی فائدہ نہ اٹھائے تو ان کی مخالفت ہرگز نہ کرے۔ فائدہ نہ اٹھانے سے بندہ ان برکات سے محروم رہتا ہے لیکن دشمنی کرنے سے تباہ ہو جاتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ نیکوں کی دشمنی کفر تو نہیں لیکن ایسے لوگ مرتے کفر پر ہی ہیں۔ یہ مفضی الی الکفر ہے۔ کفر کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔ دو عالم کا نقصان ہوتا ہے۔

گناہ کا علاج، توبہ:

انبیاء اللہ کی بے پایاں رحمت کی تقسیم کا سبب بنائے گئے۔ آپؑ نے فرمایا، وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ تم برائی کی جس حد تک بھی پہنچ چکے ہو واپس آ جاؤ۔ اس کا علاج توبہ ہے۔ اللہ سے استغفار کرنا ہے۔ تم سے جتنے بھی گناہ سرزد ہو چکے ہیں، جتنے قصور کر چکے ہو، تمہارا عقیدہ اور عمل تباہ ہو چکا ہے پھر بھی دار دنیا میں مہلت ہے۔ واپس آ جاؤ۔ واپسی کا راستہ کھلا ہے اور وہ ایک ہی ہے کہ توبہ کر لو۔ اللہ کے سامنے استغفار کر لو۔ اللہ کی بارگاہ میں عرض کرو کہ جو ہو چکا اسے معاف فرما۔ میں عہد کرتا ہوں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ اللہ سے توفیق طلب کرو کہ مجھے اس پر استقامت عطا فرما۔ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ میرا پروردگار بڑا مہربان اور محبت والا ہے۔ اسے اپنی مخلوق سے محبت ہے۔ اسے یہ پسند نہیں کہ اس کی مخلوق گمراہ ہو کر جہنم میں جائے۔ لوگ جاتے ہیں تو اپنے اختیار سے جاتے ہیں۔

راستے دو ہی ہیں اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:3) ایک راستہ اللہ کی شکر گزاری اور اطاعت کا ہے۔ دوسرا راستہ انکار اور کفر کا ہے۔ درمیان میں کچھ بھی نہیں۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ اللہ نے ہر فرد کو اپنی پسند سے راستہ اختیار کرنے کا اختیار بخشا ہے۔ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم زبانی تو کہتے رہتے ہیں کہ یہ راستہ اچھا ہے لیکن ہم چلتے کس راستے پر ہیں۔ اگر کوئی مسافر جنگل کو جانے والی پگڈنڈی پر چلتا رہے لیکن زبانی شہر جانے والی سڑک کی تعریف کرتا رہے تو وہ جنگل ہی جا پہنچے گا، شہر نہیں پہنچ سکے گا۔ نتیجہ تو عمل پر نکلے گا زبانی کہنے پر نہیں۔ اسی طرح زبانی توبہ، توبہ کہنا اور گناہ پر جمے رہنا تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔

شعیبؑ نے قوم کو بہت دلسوزی سے اللہ کی رحمت کی طرف متوجہ کیا کہ زبانی بھی استغفار کرو، عملی زندگی کی اصلاح کرو۔ گناہ چھوڑ دو آئندہ کے لیے نیکی کا راستہ اپنالو۔ پروردگار عالم تو بہت مہربان اور محبت کرنے والے ہیں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وہ کہنے لگے اے شعیب (علیہ السلام) آپ کی باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ ہم نے سینکڑوں معبود بنا رکھے ہیں وہ سب مل کر بھی ہماری ساری حاجات پوری نہیں کر سکتے اور آپ کہتے ہیں کہ آپ کا ایک ہی معبود سب کام کرتا ہے۔ بھلا سب کے سارے کام یہ ایک معبود کیسے کر سکتا ہے؟ آپ کا یہ فلسفہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ یہ بھی دیکھ لیں کہ دنیوی اعتبار سے آپ ہم میں بہت کمزور آدمی ہیں۔ نہ آپ کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر ہے نہ بے پناہ دولت ہے نہ دنیوی قوت ہے۔ ہاں ایک بات ہے آپ جس قبیلے کے فرد ہیں وہ بہت طاقتور ہے۔ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾ اگر آپ کے پیچھے یہ قبیلہ نہ ہوتا، آپ اس قبیلے کے فرد نہ ہوتے تو ہم آپ کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ ہمارے نزدیک آپ کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہمیں آپ سے کوئی خوف ہے۔ ہم تو آپ کے قبیلے سے گھبراتے ہیں کہ اس کے ساتھ جنگ گلے پڑ جائے گی۔ آپؑ نے فرمایا، قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ تمہیں اللہ کی نسبت میرا قبیلہ زیادہ بھاری لگتا ہے۔ تم عظمتِ الٰہی سے اتنے ناآشنا ہو کہ مادی اسباب سے ڈرتے ہو اور اللہ سے دشمنی لینے کو تیار ہو۔ ایسے بدبخت ہو کہ اللہ کی قدرت سے نہیں ڈرتے اور میرے قبیلے سے ڈرتے ہو، حالانکہ وہ قبیلہ بھی تمہارے کردار میں تمہارے ساتھ ہے۔ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ تم نے اللہ کریم کی عظمت کو فراموش کر دیا اور قبیلے کی طاقت سے ڈرتے ہو۔ کسی کے پاس مادی طاقت ہونا حق کی دلیل نہیں۔ کسی کا دولت مند یا با اقتدار ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ حق پر ہے یا کسی کی عزت اس لیے کی جائے کہ وہ امیر ہے یا صاحب اقتدار ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ

اللہ کی اطاعت کس کو نصیب ہے۔ اللہ کس کے ساتھ ہے۔ عظمت الٰہی سے ڈرنا چاہیے اور اللہ کے حوالے سے اللہ کے بندوں کا احترام کرنا چاہیے۔

فرمایا، اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۹۲﴾ جو کچھ تم کرتے ہو، میرا ربّ اس سب کو محیط ہے، سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ فرمایا، یہ ضروری نہیں کہ تم اپنی طاقت کے بل بوتے پر یا اپنی افرادی اور مال و دولت کے بل بوتے پر جو چاہو کر گزرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا، اس کی طاقت تو یہ ہے کہ تم کچھ کرنا چاہو وہ کچھ کر دے۔ تمہارا ہر عمل اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تم اسباب پر بھروسہ کرتے ہو وہ مسبب الاسباب ہے۔ اسباب کو وہ خود پیدا کرتا ہے اور ان کے نتائج بھی وہ خود پیدا کرتا ہے۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ شعیبؑ نے فرمایا اِنَّ رَبِّیْ میرا پروردگار، ہمارا پروردگار، نہیں فرمایا۔ حالانکہ سب لوگوں کا ربّ بھی تو اللہ ہی ہے۔ سب کا خالق، مالک، رازق، وہی تو ہے چونکہ منکرین اللہ کی عظمت پر ایمان نہیں لائے تو آپؑ نے ''ہمارا ربّ'' نہیں فرمایا۔ فرماتے تھے، میرا ربّ۔

فرمایا، وَیٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ؕ اگر تم میری بات نہیں مانتے ہو تو اپنی جگہ کرتے جو کرتے ہو کرتے رہو۔ تمہیں اللہ نے اختیار دیا ہے جو راستہ منتخب کرنا چاہتے ہو کر لو لیکن میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ جو راستہ تم نے چنا ہے یہ تباہی کا راستہ ہے۔ تم اپنا کام کرتے رہو، میں اپنا کام کرتا ہوں۔ تم اپنے عقیدے اور کردار کے ساتھ رہو، میں اپنے عقیدے اور کردار پر قائم رہوں گا۔ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ کَاذِبٌ ؕ کوئی دیر نہیں۔ بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ کون ایسا شخص ہے جس پر عذاب مسلط ہو کر اسے ذلیل کر دیتا ہے اور یہی اس بات کی دلیل بن جائے گی کہ وہ شخص جھوٹا تھا باطل پر تھا، حق پر نہیں تھا۔ اگر تم انتہا ہی دیکھنا چاہتے ہو تو پھر اپنا کام جاری رکھو میں اطاعت الٰہی جاری رکھوں گا۔ بہت جلد اللہ کی طرف سے نتیجہ سامنے آجائے گا کہ کون جھوٹا ہے۔ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ رَقِیْبٌ ﴿۹۳﴾ تم بھی اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

انبیاء کے ساتھ کسی کو اس حد تک نہیں جانا چاہیے کہ بالکل الگ کھڑا ہو جائے کہ دیکھتے ہیں آپؑ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ جب بات یہاں پہنچتی ہے تو پھر اللہ کی طرف سے فیصلہ آجاتا ہے۔ اور کفر کے مقدر میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تباہی صرف دنیا کی نہیں یہ تو ابدی زندگی کی تباہی ہے۔ بندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتا ہے۔

اللہ کی رحمت کس پر؟

فرمایا، وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا اور جب ہمارا فیصلہ آگیا

تو ہم نے شعیبؑ کو اور جو ان کے ساتھ تھے انہیں اپنی رحمت سے بچالیا۔ جب اللہ کے دشمنوں پر عذاب آیا تو پھر وہ جو نبیؑ اور آپؑ کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ بااعتبار عقیدہ اور بااعتبار عمل جو اپنے نبیؑ سے وابستہ تھے ان پر اللہ کی رحمت ہوئی۔ مَعَهٗ کا معنی ہے ساتھ ہونا۔ معیت رسول یہ ہے کہ بندے کا عقیدہ اور عمل نبیؑ کے حکم کے مطابق ہو۔ اس کے کردار میں نبیؑ کی جھلک ہو۔ اس کے عمل سے پتہ چلے کہ وہ کام اس لیے کر رہا ہے کہ نبیؑ نے فرمایا ہے، اس طریقے سے کر رہا ہے جیسے نبیؑ نے سکھایا ہے۔ کمانے، خرچ کرنے، حلیہ، انداز، دوستی، دشمنی، غرض معیشت سے معاشرت سب پر نبیؑ کے ارشادات کی چھاپ لگی ہو۔ وہ ہر کام ایسے کرے جیسے نبیؑ نے سکھایا ہے۔ اسے ہی فنافی الرسول کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندے کی اپنی مرضی، اپنا انتخاب، اپنی پسند ختم ہو جائے اور عقیدہ، نظریہ و ایمان سے لے کر عمل تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں فنا ہو جائے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہ رہے۔

قرآن حکیم نے اسے معیت رسالت سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہاں بھی یہی فرمایا وَّالَّذِيْنَ مَعَهٗ جن لوگوں نے شعیبؑ کا ساتھ دیا انہیں اللہ نے اپنی رحمت سے محفوظ رکھا۔ وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ اور ان لوگوں کو جو ظلم کرتے تھے ایک سخت آواز نے پکڑ لیا۔ نبیؑ کی مخالفت ظلم ہے اور انہوں نے دراصل اپنے آپ پر ظلم کیا کہ ہدایت چھوڑ کر گمراہی پسند کی۔ ایسی دردناک آواز تھی کہ جگر شق ہو گئے۔ تڑپ تڑپ کر مر گئے اور اپنے گھروں کو جو انہوں نے بڑی محنت، بڑے شوق سے بنائے تھے ان میں مردہ اوندھے پڑے تھے۔ اس طرح برباد ہوئے جیسے کبھی یہاں کوئی بستا ہی نہیں تھا۔ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ خوب جان لو! اہل مدین کو رحمت الٰہی سے اسی طرح دور کر دیا گیا جس طرح ثمود کو کر دیا گیا تھا۔ رحمت سے محرومی عذاب الٰہی کا سبب بنتی ہے اور عذاب الٰہی دنیا کی زندگی بھی تباہ کر دیتا ہے اور آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

اللہ کریم اس سے محفوظ رکھے۔ اپنی اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نصیب کرے۔

سورۃ ھود رکوع 9 آیات 96 تا 109

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ؕ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے معجزات اور روشن دلیل دے کر بھیجا ﴿۹۶﴾ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، پھر وہ لوگ فرعون کے حکم پر چلتے رہے اور فرعون کا حکم درست نہیں تھا ﴿۹۷﴾ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا پھر ان کو دوزخ میں جا اُتارے گا ﴿۹۸﴾ اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے اترنے کی جس میں یہ اتارے جائیں گے اور اس (دنیا) میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کو بھی (پیچھے لگی رہے گی)۔ بہت بُرا انعام ہے جو ان کو دیا گیا ﴿۹۹﴾ یہ پرانی بستیوں کے حالات ہیں جو ہم آپ سے بیان فرماتے ہیں ان میں سے کچھ (کے آثار) تو باقی ہیں اور بعض کا بالکل خاتمہ ہو گیا ﴿۱۰۰﴾ اور ہم نے ان کے ساتھ زیادتی نہیں کی ولیکن انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا جب آپ کے پروردگار کا حکم (عذاب) آپہنچا تو ان کے وہ معبود جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پوجتے تھے ان کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے اور اُلٹا ان کو نقصان ہی پہنچایا ﴿۱۰۱﴾ اور آپ کے پروردگار کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب بستیوں کو پکڑتا ہے اور جبکہ وہ ظلم کرتے ہوں۔ بے شک اس کی گرفت بڑی دکھ دینے والی بڑی سخت ہے ﴿۱۰۲﴾ یقیناً ان (واقعات) میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو یہ وہ دن ہو گا جس میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور یہی وہ دن ہو گا جب (سب لوگ اللہ کے روبرو) حاضر کیے جائیں گے ﴿۱۰۳﴾ اور ہم اس کو تھوڑی مدت کے لیے ملتوی کیے ہوئے ہیں ﴿۱۰۴﴾ جب وہ دن آئے گا تو کوئی متنفس اس کی اجازت کے بغیر بات تک نہ کر سکے گا پھر ان میں بعضے بد بخت ہوں گے اور بعضے نیک بخت ہوں گے ﴿۱۰۵﴾ سو جو بد بخت ہیں وہ تو دوزخ میں (ایسے حال میں) ہوں گے کہ وہاں ان کی چیخ و پکار پڑی ہو گی ﴿۱۰۶﴾ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اس کے کہ آپ کا پروردگار چاہے (اگر وہی نکالنا چاہے) یقیناً آپ کا پروردگار جو کچھ چاہے اس کو پورا فرما سکتا

ہے ﴿۱۰۷﴾ اور جو نیک بخت ہوں گے سو وہ جنت میں (داخل) ہوں گے اسی میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اس کے کہ جو آپ کا پروردگار چاہے یہ (اس کی) بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی (کاٹی نہ جائے گی) ﴿۱۰۸﴾ تو یہ لوگ جو (غیر اللہ کی) پرستش کرتے ہیں پس آپ اس کی وجہ سے خلجان میں نہ پڑیئے یہ اسی طرح پرستش کرتے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا پرستش کرتے آئے ہیں اور یقیناً ہم ان کو (عذاب سے) ان کا حصہ بلاکم وکاست پورا پورا دینے والے ہیں ﴿۱۰۹﴾

تفسیر ومعارف

رحمت الٰہی ناپیدا کنار:

اللہ کی رحمت اس قدر بے پناہ اور بحر بے کراں ہے کہ اللہ نے اس سے اپنی مخلوق کو کبھی محروم نہیں رکھا جتنے لوگ محروم رہتے ہیں وہ خود رحمت الٰہی کا راستہ چھوڑ کر غضبِ الٰہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ ان کا ذاتی فیصلہ ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کو شعور معرفت دیا اور یہ نعمت صرف انسان کو عطا ہوئی۔ نبوت صرف انسانوں میں ہے۔ فرشتوں میں کوئی نبوت ورسالت نہیں۔ جنوں میں کوئی نبی اور رسول نہیں ہوا۔ صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جسے نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ نبیؐ کی تو اپنی شان ہے کہ وہ ازل سے چن لیے گئے لیکن انسانیت کے ہر فرد کو یہ استعداد دی گئی ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق عظمتِ الٰہی کو پہچان سکے۔ باقی جتنی مخلوق ہے وہ حکمِ الٰہی کی پابند ہے حاکم کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔ فرشتے بھی اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ صرف انسان کو یہ فضیلت ملی ہے کہ وہ اللہ کی ذات کو پہچان سکتا ہے۔ اسے معرفت الٰہی نصیب ہوتی ہے اور وہ عظمتِ الٰہی سے آشنا ہوتا ہے۔

جاننے کے باوجود نہ ماننا:

انسانوں میں سے بھی بعض محروم رہ جاتے ہیں کہ شرف انسانیت پا کر بھی عظمت الٰہی سے آشنا نہیں ہوتے بلکہ گمراہ ہو کر شیطنت اختیار کر لیتے ہیں۔ کہنے کو تو شیطان بھی اللہ کو جانتا ہے لیکن وہ مردود ہوا۔ تب بھی اس نے بارگاہ الٰہی میں مکالمہ کیا کہ مجھے مہلت دے دے میں انسانوں کو گمراہ کروں گا۔ بجائے توبہ کرنے کے مقابلے پر آ

گیا۔قرآن حکیم میں ہے کہ انسانی شکل میں آ کر مشرکین اور کفار مکہ کے ساتھ یوم بدر مسلمانوں کے مقابلے پر آ گیا۔ جب فرشتے نازل ہوتے دیکھے تو بھاگا۔انہوں نے طعنہ دیا کہ بہادر جنگجو ہو کر بھاگ رہے ہو تو کہنے لگا اِنِّیۡۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوۡنَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ ؕ وَاللّٰہُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (الانفال:48)

ترجمہ: یہ کون سا ڈر ہے۔اگر عظمتِ الٰہی کا ڈر ہوتا تو پھر توبہ کرتا۔یہ ڈر محض اللہ کی طاقت وقوت کا ہے کہ وہ زبردست ہے۔جو چاہے کر سکتا ہے۔تباہ کر دے گا۔یہ ڈر مقصود نہیں۔یہ معرفت کسی کام کی نہیں۔یہ تو شیطان کو بھی پتا ہے لیکن یہ معرفت اس کے کسی کام نہ آئی۔اسے صرف یہ پتا ہے کہ اللہ سے مقابلہ ممکن نہیں۔وہ قادر ہے، حیّ وقیوم ہے باقی سب فانی ہیں۔

اللہ کی عظمت کو پہچاننا مقصود ہے۔عظمتِ الٰہی کو دل میں پا کر اس سے وہ تعلق بنے کہ بندہ مان لے کہ اللہ کی عظمت ایسی ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اسے یاد کیا جائے، اسے دل میں بسایا جائے اور اس کے سامنے خود کو فنا کر دیا جائے، اپنی رائے ختم کر دی جائے تو یہ معرفت مقصود ہے۔یہ نبیؐ سے وابستہ ہونے پر ملتی ہے۔اللہ کی رحمت اتنی بے پایاں ہے کہ اس نے ہر سرکش متکبر کو بھی اپنی رحمت کی طرف بلایا ہے۔حتیٰ کہ فرعون جس نے اپنی خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا۔لوگوں کو حکم دے رکھا تھا کہ میری عبادت کرو، مجھے سجدے کرو، میں خدا ہوں۔ایسے سرکش کی طرف بھی اللہ کریم نے اپنے نبی موسیٰؑ کلیم اللہ کو مبعوث فرمایا۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۹۶﴾ اپنی آیات، اپنی نشانیاں، واضح دلائل اور معجزات دے کر موسیٰؑ کو فرعون اور اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِہٖ اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔

موسیٰؑ تو سارے قبطیوں اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو پھر یہاں صرف اُمراء کا ذکر کرنے میں کیا مصلحت ہے؟ اس لیے کہ قوم عموماً اُمراء ہی کی پیروی کرتی ہے۔حکمران بھی طبقہ اُمراء کو ہی ساتھ رکھتے ہیں، انہیں سے مشورہ کرتے ہیں، انہیں کی بات مانتے ہیں۔چونکہ قوم کی امراء و حکمرانوں سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں تو عوام انہی کی پیروی کرتے ہیں۔اس سے ثابت ہوا کہ قوم کے امراء پر زیادہ محنت کرنا چاہیے۔اگر کوئی ایک بڑا آدمی سدھر جائے تو اس کے حلقہ اثر میں بہت سے لوگوں کے سدھرنے کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ کریم نے تو موسیٰؑ کے ذریعے اپنا کلام بھیجا۔اللہ کا کلام میں تجلیات باری ہوتی ہیں۔اللہ کی ذات کا پرتو جمال ہوتا ہے۔اپنی روشن دلیلیں بھیجیں لیکن فرعون اور اس کے امراء نے پروانہ کی۔اللہ قادر کریم ہے اسے کسی کی ضرورت نہیں کہ کوئی اسے مانے تو بات بنے۔ماننا نہ ماننا انسان کے اپنے لیے ہے کہ وہ کتنی اطاعت کرتا ہے اور کتنی

رحمت پاتا ہے کتنی نافرمانی کرتا ہے اور کتنا عذاب پاتا ہے۔ فرعونوں کے چار سو سالہ عہد میں کتنے فرعون مرے کتنے اور پیدا ہوئے تو اسے خدا ماننے والوں کو سمجھ نہ آئی کہ یہ کیسا خدا ہے جو مر جاتا ہے اور جس کے اولاد ہوتی ہے لیکن انسانی عقل جب اللہ کی وحی کی نگرانی قبول نہیں کرتی تو پھر دور تک بھٹکتی چلی جاتی ہے۔ فرمایا، ہم نے فرعون اور اس کے امراء کو بھی محروم نہیں رکھا۔ جو بندہ ہو کر خدائی کا دعویٰ کیے بیٹھا تھا جسے نیند آتی تو مغلوب ہو کر سو جاتا تھا، پیاس لگتی تو پانی کے لیے تڑپتا تھا، بھوک کے لیے غذا کا محتاج تھا، موت آئی تو مر جاتا ہے اس سب کے باوجود اتنا بگڑ چکا تھا کہ خود کو خدا بنائے بیٹھا تھا۔ ہم نے اس کی طرف اپنے نبی موسیٰؑ کو بھیجا۔ انہیں تورات عطا فرمائی معجزات عطا فرمائے اور آپؑ نے حق کی طرف دعوت دی۔ موسیٰؑ اس سے اقتدار نہیں چھیننا چاہتے تھے۔ کوئی عہدہ نہیں مانگ رہے تھے نہ دنیوی مال و حشم کے طلبگار تھے۔ آپؑ تو صرف دعوت الٰہی اللہ دیتے رہے کہ اللہ کی نافرمانی سے باز آجاؤ۔ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ﴿۹۷﴾ اللہ کی اطاعت کر لو لیکن اس قوم نے فرعون کی بات مانی اور فرعون کی بات تو سرے سے غلط تھی۔ جس کی کوئی اصل نہ تھی، کوئی وجود نہ تھا۔ جو حقیقت کے قریب سے بھی نہ گزری تھی۔

قائد:

انہوں نے فرعون کو اپنا رہنما، قائد، حکمران اور حاجت روا سمجھا تو نتیجہ یہ ہوا۔ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کہ میدانِ حشر میں بھی وہ اپنی قوم کی قیادت کرے گا۔ جتنے لوگ اس کے پیچھے چلتے رہے اللہ کے بجائے اس کی بات مانتے رہے وہ اس کے پیچھے ہوں گے فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ﴿۹۸﴾ اور وہ انہیں لے کر سیدھا جہنم میں جا پہنچے گا اور یہ بہت بری جگہ ہے پہنچنے کی۔ جہاں یہ پہنچے گا اور جہاں اس کی قوم کو پہنچایا جائے گا وہ انتہائی تکلیف دہ اور بری جگہ ہے۔

اس میں بڑی واضح بات ہے کہ انسان زندگی میں جس کو چاہے اپنا پیش رو بنا سکتا ہے لیکن اسے سمجھ بوجھ سے کام لے کر بنانا چاہیے کہ جس جیسا میں ہونا چاہتا ہوں، جسے میں اپنا قائد بنا رہا ہوں اس کے پیچھے مجھے قیامت کو بھی چلنا ہوگا۔ مفسرین نے اس ضمن میں بہت سے واقعات نقل فرمائے ہیں اور تفصیل سے لکھا ہے کہ ہر شخص جب دنیا میں آتا ہے تو کچھ نہیں جانتا۔ والدین سے سیکھتا ہے، معاشرے سے سیکھتا ہے۔ پھر بالغ ہو کر جب اپنی رائے والا ہو جاتا ہے تو کسی نہ کسی کی پیروی کرتا ہے۔ اپنا ایک Role Model بنا لیتا ہے اور اس کے پیچھے چلتا ہے۔ اس جیسا بننا چاہتا ہے۔ جس کے انداز و اطوار پسند کرتا ہے اسی کے مطابق اس کا کردار ہو جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ملتا ہے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (سنن ابوداؤد) او کما قال رسول اللہ ﷺ کہ

جس قوم کی مشابہت اختیار کی جائے گی بندے کو حشر میں اسی کے ساتھ کھڑا کیا جائے گا۔ لہٰذا اپنا رہنما اللہ کے نبی ﷺ کو بنالینا، آپ ﷺ کی کامل اطاعت کرنا، خلوص دل سے اتباع کرنا اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ اس بندے کا حشر اپنے نبی ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوگا۔ اور جس کسی نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو اپنا رہنما بنالیا کہ اس جیسا نظر آؤں، اس کی طرح کام کروں، اس کی طرح کماؤں، اس کی طرح خرچ کروں تو اس کا حشر پھر اسی کے ساتھ ہوگا جس کو اپنی زندگی میں اپنا پیش رو بنایا۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم سارے اصول دوسروں پر چسپاں کرتے رہتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے آپ پر لاگو کرکے اپنی تلاش کی جائے کہ میں کہاں ہوں۔ اس لیے کہ ہمیں دوسروں کا جواب نہیں دینا۔ اللہ کریم کے سامنے ہمیں اپنا جواب دینا ہے۔ یہ بھی عجیب رویہ ہے کہ اپنی بخشش اور نجات کی فکر نہیں۔ ہر شخص کو دوسرے کی فکر ہے کہ اس کا کیا ہوگا۔ کسی نے کہا اس فکر سے رات بھر نیند نہیں آتی کہ کافر جہنم میں کیوں جائیں گے۔ کیا اس شخص کو اپنی تسلی ہے کہ وہ جنت جائے گا۔ جب تک اپنا فیصلہ نہیں ہوتا تب تک اپنی فکر ہونی چاہیے۔ انسانی ذہن عجیب ہے اور شیطان اسے الجھا دیتا ہے تاکہ یہ عملی زندگی میں اپنے کردار سے غافل ہوجائے۔ ورنہ سیدھی سی بات ہے بندہ سوچے کیا میں نے کافروں کی طرف سے جواب دینا ہے یا میں کافروں کا وکیل ہوں۔

ان لوگوں نے بھی فرعون کے فیصلے کو ترجیح دی۔ اپنے نبیؑ کا فیصلہ قبول نہیں کیا تو اس دنیا میں بھی رحمتِ الٰہی سے محروم رہے **وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ** یہاں بھی وہ لعنت کا شکار ہوئے اور قیامت کے دن بھی لعنت کا شکار ہوں گے۔ اللہ کی رحمت سے محروم رہیں گے۔

اللہ کریم کی رحمت تو بے پناہ ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے **وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ** (الاعراف:156) میری رحمت تمام چیزوں سے وسیع تر ہے لیکن یہ اس لیے محروم رہے کہ انہوں نے اپنی پسند سے لعنت کا راستہ چنا۔ ان کی محرومی کا سبب ان کا اپنا انتخاب تھا۔ انہوں نے اللہ کے نبیؑ کا عطا کردہ عقیدہ، عمل اور طرز حیات کو چھوڑ کر اپنی مرضی کا طرز حیات پسند کیا۔ **بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ﴿۹۹﴾** اس کا جو بدلہ انہیں ملا وہ بہت ہی برا تھا۔ جس راستے کا انہوں نے انتخاب کیا اس کا بہت برا انجام پایا۔

انسانی مزاج میں جب بھی بگاڑ آتا ہے یہی رویہ نظر آتا ہے کہ فلاں عہدے دار کو خوش رکھنا چاہیے، فلاں دولت مند کو راضی کرنا چاہیے، فلاں صاحب اختیار کے ساتھ رہنا چاہیے خواہ کچھ بھی ہوجائے۔ تو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ یہ روش کس انجام تک لے جائے گی۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِیْدٌ﴿۱۰۰﴾ یہ ان قوموں کے احوال ہیں جو

آپ ﷺ سے پہلے گزر گئیں اور دنیا کے لیے ایک نمونہ چھوڑ گئیں کہ کیا، کیا جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ آپ ﷺ ان قصوں سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی عام لوگ ان کے حقائق سے واقف تھے۔ محض باتیں تھیں جن میں کچھ سچ تھا کچھ زیب داستان کے لیے کہانیاں بنانے کے لیے جھوٹ کی آمیزش تھی۔ اللہ کریم نے صاف صاف حقائق بیان کر دیے۔ فرمایا یہ پرانی بستیوں کے واقعات ہیں جن میں سے کچھ ایسی ہیں جن کے آثار ابھی باقی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن کے آثار مٹ گئے۔ ان پر کیا بیتی، انہوں نے کیا کیا، اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ یہ سب ہم آپ ﷺ پر بیان فرمار ہے ہیں۔ یہ امور غیبیہ ہیں جن پر وحی الٰہی کے ذریعے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی جا رہی ہے اور حضور ﷺ دنیا میں لوگوں کو اس کی اطلاع دے رہے ہیں تاکہ لوگ ان جیسا رویہ اختیار کر کے تباہ نہ ہوں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ فرمایا، ہم نے ان کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ قوموں کی قومیں تباہ ہوگئیں۔ زمین سے بستیوں کو اکھیڑ کر الٹ دیا گیا۔ کسی پر آگ برسی اور کسی پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ کوئی بندر اور خنزیر بن کر تباہ ہو گئے۔ کسی پر چنگھاڑ آئی اور ان کے دل پھٹ گئے۔ کسی پر ہوا مسلط کر دی گئی اور کسی پر پانی کا طوفان بھیج دیا گیا لیکن ہم نے کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بلکہ انہوں نے اپنے ساتھ خود ظلم کیا۔ ایسا عقیدہ اپنایا، ایسے اعمال کیے جس کے نتیجے میں ان پر عذاب نازل ہوئے۔ عذاب کے راستے کو اپنانا ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ ہم نے تو انبیاء مبعوث فرمائے۔ کتابیں عطا فرمائیں۔ ان لوگوں نے نہ کلام الٰہی کو سمجھنے کی کوشش کی نہ نبیؑ کی بات پر غور کیا۔ ذاتی انا، دنیوی لالچ اور بے دینوں کے پیچھے زندگیاں ختم کر دیں۔ کہیں درختوں کی پوجا کی، کہیں پتھروں کے بتوں کی عبادت کرتے رہے۔ اپنے زعم باطل سے، اپنی طرف سے معبود گھڑ لیے ان کو اپنا حاجت روا سمجھ کر ان کے پیچھے بھاگتے رہے تو انہوں نے اپنے آپ پر خود ظلم کیا۔ اپنے آپ کو خود دھکیل کر تباہی کی طرف لے گئے۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نیکی کرنا آسان ہے۔ یہ فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے۔ جنت جانا سب سے آسان ہے۔ صرف ایک کام کرنا ہے۔ اپنی پسند چھوڑ دو اور نبیؑ کی پسند اختیار کر لو۔ جو وہ فرماتے ہیں وہ کر گزرو۔ جس سے روکتے ہیں رک جاؤ۔

جہنم جانا مشکل ہے۔ برائی کے ساتھ تکلیف ہے۔ دوزخ جانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ ہر مشکل کام کرنا پڑتا ہے، جیلیں کاٹنا، بدنامی سہنا، سزائیں کاٹنا جیسے سارے مشکل کام کرنے پڑتے ہیں۔ تو فرمایا کہ انہوں نے اپنے آپ کے ساتھ ظلم کیا کہ ساری عمر مشقت کر کے خود کو کھینچ کر، بربادی کی طرف جہنم کی طرف لے گئے۔

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾ پھر ان کے وہ معبودانِ باطلہ جن پر یہ امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ ان کے کسی

کام آئیں گے وہ ان کو بچا نہ سکے اور انہیں بچاتے بھی کیسے کہ یہی معبودان باطلہ تو ان کی تباہی کا سبب تھے۔

ایک لطیف نکتہ:

اس آیہ مبارکہ میں اللہ کریم اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ (جب آپ کے پروردگار کا فیصلہ آیا) اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ کریم تو ساری کائنات کا ربّ ہے۔ سب کا پروردگار وہی ہے لیکن یہ فرمانے سے مراد ہے:

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دِگر

عبد یعنی بندے تو سارے اللہ کے ہیں لیکن عبدہ اس کا بندہ ہونا دوسری بات ہے۔ بندے تو سب اللہ کے ہی ہیں لیکن جسے اپنا بندہ کہے وہ بات الگ ہے۔

اس میں ایک نکتہءلطیف یہ ہے کہ پروردگار کا کرم اسی کو نصیب ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں رہے گا۔ دنیوی رزق پیدا کرنا، عقل وشعور، حواس، اعضاء و جوارح، کنبہ، خاندان، رشتہ دار یہ سب عطا کرنا یہ سب کے لیے عام ہے لیکن جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہءارادت میں ہوگا اس پر جو لطفِ ربوبیت ہوگا وہ دوسروں میں کہاں۔ اس لیے فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار، یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کر آپ ﷺ کا ربّ کہنے سے مراد یہ ہے کہ اب بارگاہ ربوبیت میں صرف ایک دروازہ کھلتا ہے وہ ہے اطاعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

احتیاط لازم:

نیکوں کی، علماء اور پیر صاحبان کی اطاعت کرنا چاہیے کہ نیک، عالم اور پیر بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہیں۔ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچاتے ہیں تو یہ اطاعت ان کی نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اور کوئی پیر، کوئی عالم، کوئی مولوی اپنی طرف سے بات کہتا ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ اطاعت صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جنہیں ہم رہنما بنا لیتے ہیں وہ ہمیں کیا سکھا رہے ہیں۔ اکثر لوگ جاہلیت کا شکار ہو کر جعلی پیروں کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں لیکن ہوش سے کام نہیں لیتے اس لیے کہ عظمتِ الٰہی قلوب سے اوجھل ہوتی ہے۔ اس کا سبب دنیا کی محبت میں اندھا ہو جانا ہے۔ مال کی ہوس، دولت کی ہوس اندھا کر دیتی ہے۔ دنیوی نعمتیں پسند کرنا، انہیں حاصل کرنا منع نہیں ہیں۔ ضرور حاصل کی جائیں۔ ان سے استفادہ کیا جائے لیکن اس قیمت پر نہیں کہ اللہ کی اطاعت چھوڑ دی جائے اور دنیا کے پیچھے بھاگا جائے۔ دنیوی مال و دولت کا ہونا مذموم نہیں نہ یہ دنیا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بودن
نے تماشا نقرہ فرزند و زن

دنیا سے مراد:

جو چیز بھی اللہ کی راہ سے روکنے والی ہو وہ دنیا ہے۔ جو حلال و جائز وسائل سے آئے اور اللہ کی یاد نصیب رہے وہ دنیا نہیں۔ مال و دولت، اولاد، گھر بار، جائیداد یا جاگیر دنیا نہیں ہے۔ ہر وہ چیز دنیا ہے جو اللہ کی یاد فراموش کر دے۔ اللہ کی یاد بھلا دے۔ اگر دنیا کی ساری نعمتیں ہیں اس کے ساتھ اللہ کی یاد، اللہ کی اطاعت نصیب ہے تو یہ دنیا نہیں اللہ کا انعام ہے۔ بندہ جب محنت کرتا ہے، رزقِ حلال کماتا ہے، بیوی بچوں پر خرچ کرتا ہے، انہیں دین سکھاتا ہے، اللہ کی اطاعت کے دائرے میں زندگی بسر کرتا ہے تو یہ سارا کچھ دین ہے۔ جب کوئی چیز اللہ اور بندے کے درمیان رکاوٹ بن جائے تو وہ دنیا بن جاتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات عبادات بھی دنیا بن جاتی ہیں۔ جب بندہ عبادت کے ذریعے اپنی بڑائی میں مبتلا ہو جائے اور خود کو مقدس سمجھنے لگے، خود کو لوگوں کا حاجت روا سمجھنے لگے تو اس کے لیے ایسی عبادت ہی دنیا ہے۔

اللہ کی پکڑ کا سبب کیا؟

فرمایا، جب ان پر اللہ کی گرفت آئی تو جن معبودانِ باطلہ کو وہ پوجتے رہے وہ ان کے کسی کام نہ آئے بلکہ الٹا عذاب لانے کا سبب بنے۔ ان کی مصیبتیں بڑھانے کا سبب بنے۔ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۔ اللہ کی پکڑ ایسی ہی زبردست ہوتی ہے۔ جب وہ کسی قوم، کسی بستی پر گرفت ڈالتا ہے تو اس کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے لیکن اللہ کی پکڑ آتی کیوں ہے؟ اس لیے کہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اپنی امیدیں دوسروں سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ انبیاء کو چھوڑ کر دنیاداروں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کے ساتھ خود ظلم کرتے ہیں۔ ہدایت کا دامن جھٹک کر گمراہی کو پسند کرتے ہیں۔ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴿۱۰۲﴾ بلاشبہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت اور بہت دکھ دینے والی ہوتی ہے۔ دنیا کے مصائب بھی بڑے شدید ہوتے ہیں لیکن بہر حال وقتی اور لمحاتی ہوتے ہیں۔ عمر بیت جاتی ہے، وقت گزر جاتا ہے اس کے ساتھ مصائب بھی ختم ہو جاتے ہیں لیکن جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو صرف یہی نہیں کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے بلکہ قیامت تک اور ہمیشہ تک عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتا ہے بات ختم نہیں ہوتی، موت کے ساتھ بات شروع ہو جاتی ہے کفر و شرک پر گرفت آئے تو واقعی اللہ کی پکڑ بڑی دردناک، بڑی شدید ہوتی ہے کہ وہاں سے بربادی شروع ہوتی ہے اور ابدالآباد گرفت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ

مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿١٠٣﴾ یہ ایسا دن ہے جب اگلے پچھلے تمام انسان ایک میدان میں جمع کیے جائیں گے اور سب کی شہادتیں موجود ہوں گی۔ سب کے اعمال و احوال معلوم کیے جائیں گے کہ کیا کرتے رہے؟ کیا عقیدہ تھا، کیا طرز فکر تھا اور کس طرز حیات پر زندگی گزار کر آئے ہو؟ یہ بہت مشکل دن ہے کہ ذرا بھر شئے بھی سامنے آجائے گی۔

یہ واقعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے بیان فرمائے گئے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بیان فرمائیں تاکہ ان کے لیے درس عبرت ہو تاکہ حق پر چلیں اور خود کو باطل سے محفوظ رکھیں۔ قرآن کا زموضوع تاریخ نہیں ہے کہ گزشتہ امتوں کے قصے بیان کر کے اقوام عالم کی تاریخ مدون کرنا مقصود ہو۔ اللہ کریم نے قرآن حکیم میں پچھلی قوموں کے حالات اس لیے بیان فرمائے ہیں کہ لوگ نافرمانی کے انجام سے دنیا میں ہی متنبہ ہو جائیں۔ اور جن لوگوں کو ایمان نصیب ہے، یقین آخرت نصیب ہے، جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں، اس سے بچنا چاہتے ہیں ان کے لیے ان قصوں میں بڑی عبرت ہے کہ دنیا کی لذتیں بھی لحاتی ہیں اور دکھ بھی لحاتی ہیں لیکن اخروی لذتیں بھی دائمی ہیں اور تکلیفیں بھی دائمی ہیں تو جسے نور ایمان نصیب ہے اس کے لیے گزشتہ اقوام کی داستانوں میں بڑی عبرت ہے۔ لوگوں نے یہاں مضبوط قلعے بنائے، محلات تعمیر کیے، ملکوں پر حکومت کی حتیٰ کہ اپنی خدائی کے دعوے کیے تو وہ کہاں گئے، وہ لوگ کیا ہوئے؟ آج بڑے بڑے شہنشاہوں کے مقابر لوگوں کی سیر گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ کہاں گیا وہ تزک حشم، وہ شاہی دبدبہ، قوت و طاقت کے مظاہرے۔ نہ کوئی چوبدار ہے نہ پہرے دار، نہ لاؤ لشکر نہ شور و غوغا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے درس عبرت ہے جن میں نورِ ایمان ہے، جن کا آخرت پر یقین ہے۔ آخرت پر یقین کامل ایمان کی ایک بہت اہم کڑی ہے۔

یوم آخرت کی خصوصیات:

فرمایا، آخرت کے دن کی دو خصوصیات ہیں۔ ایک تو اس دن ہر فرد کو حاضر کیا جائے گا۔ انسانیت کا کوئی فرد باقی نہیں بچے گا جو وہاں میدانِ حشر میں حاضر نہ ہو۔ دوسرا کسی فرد کی کوئی بات چھپی نہیں ہوگی۔ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿١٠٣﴾ یہ ظاہر کیے جانے کا دن ہے۔ دنیا میں تو ہم پیر بن جاتے ہیں۔ اپنا ذاتی کردار چھپائے رکھتے ہیں اور لوگوں کے سامنے بڑے پارسا نظر آتے ہیں۔ وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ جو حقائق ہوں گے وہ سامنے ہوں گے۔ فرداً فرداً لوگ جمع کیے جائیں گے اور ہر ایک کا کردار بھی سامنے ہوگا۔ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿١٠٤﴾ اس نتیجے کو ہم نے کچھ مدت کے لیے مؤخر کر رکھا ہے۔ دنیا کی مدت زیادہ نہیں۔ یہ تھوڑی سی مہلت ہے، گنتی کے دن ہیں۔ يَوْمَ يَاْتِ

لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ اس دن جب لوگ میدان حشر میں جمع ہوں گے تو کوئی بولنے کی جرأت نہ کر سکے گا سوائے اس کے کہ اللہ کی طرف سے کسی کو اجازت دی جائے۔ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ پوری مخلوق جب جمع کی جائے گی تو اس کے دو حصے بنیں گے۔ جس طرح دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں نیک یا بدکار، مومن یا کافر اسی طرح میدانِ حشر میں بھی دو طرح کے لوگ ہوں گے۔ شقی و بدبخت یا سعید و نیک بخت۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ جو بدبخت و شقی ہوں گے۔ جنہوں نے دنیا میں ایمان قبول نہیں کیا ہوگا۔ برائی اور نافرمانی کا راستہ چلے ہوں گے ان کے لیے جہنم کی آگ ہوگی جس میں ان کی چیخ و پکار اور آہ و بکا ہوگی۔ اس میں ان کے عذاب میں کمی کا بھی کوئی تصور نہ ہوگا۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ یوں ہی چیختے چلاتے رہیں گے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ جب تک وہ عالم قائم ہے وہ وہیں رہیں گے۔ اور اس عالم کے بارے فرمایا کہ اسے خلود ہے۔ وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ ہاں! آپ کا پروردگار جو چاہے۔ یعنی وہ مجبور نہیں ہے۔ وہ قادر ہے۔ اس عالم کو بھی ختم کر دے تو قادر ہے اور ہمیشہ رکھنا چاہے تو قادر ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وہ قادر مطلق ہے جو چاہے کرے۔ صرف اللہ ہی وہ ذات ہے کہ جو چاہے وہ کرے۔ لیکن اس نے بتا دیا کہ وہ عالم ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کریم اس پر مجبور ہے، اسے ختم نہیں کر سکتا۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ اور جو نیک بخت ہوں گے، سعید ہوں گے انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بدبختی اور نیک بختی کی تمیز ایمان اور عقیدے سے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق سے ہو جاتی ہے۔ جس نے دامانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھام لیا وہ نیک بخت ہے۔ عقیدے کا مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر یقین ہو اور اس یقین کی دلیل یہ ہے کہ ان پر عمل کرے۔ عمل نہ کرنا دراصل یقین میں کمزوری، ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔

جو نیک بخت ہوں گے، جنہوں نے زندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ کے مطابق گزاری ہوگی، جو غلطی ہو جانے پر توبہ کرتے رہے ہوں گے، اصلاح احوال میں لگے رہے ہوں گے انہیں جنت میں داخلہ ملے گا جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ جب تک ارض و سماء قائم ہیں یعنی وہ عالم قائم ہے وہ اسی کی جنت میں رہیں گے۔ ہاں! اللہ مجبور نہیں ہے کہ اسے ہمیشہ رکھے۔ وہ چاہے تو اس عالم کو بھی ختم کر دے لیکن اس نے خود بتا دیا کہ یہ عالم ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ان پر ایسا کرم ہوگا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا

اور ہمیشہ ہمیشہ جاری وساری رہے گا۔ اللہ کی ایسی عطا، ایسی بخشش ہوگی جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعثتِ عالی سے لے کر قیامت تک کی ساری انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجسم رحمت ہیں۔ رحمۃ للعالمین ہیں۔ جہاں کوئی کفر کرتا ہے، غیر اللہ کی پرستش کرتا ہے، اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا دکھ محسوس فرماتے ہیں کہ میرے مبعوث ہونے کے بعد بھی یہ اللہ کی رحمت سے کیوں محروم ہیں۔

یہاں یہ تشفی فرمائی جارہی ہے کہ میرے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ پریشان نہ ہوں اس لیے کہ یہ ان لوگوں کا اپنا انتخاب ہے کسی نے ان کو زبردستی نافرمانی کے راستے پر نہیں ڈالا۔ یہ ان کی اپنی پسند ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے کے بجائے باپ دادا کی رسومات کا اتباع کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح یہ غیر اللہ کی پوجا کرنا پسند کرتے ہیں جس طرح ان کے باپ دادا کرتے تھے۔ یہ بڑی نازک بات ہے اسے سمجھنا چاہیے کہ کہیں یہ بیماری ہم میں بھی تو نہیں۔

بعثت عالی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بہت سی جاہلانہ لیکن بڑے پرانے زمانے سے چلی آئی رسومات جاری تھیں جنہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پامال فرما دیا اور ان کی جگہ پوری زندگی کا ایک نصاب اپنی سنت میں عطا فرما دیا۔ کفار نے تو یہ کہہ کر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قبول نہ کیا کہ اگر ہم اپنے آباء واجداد کی رسومات اور رواجات چھوڑ دیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہمارے باپ دادا جاہل اور بے وقوف تھے جبکہ وہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے حکمران، جنگجو، بڑے معروف لوگ تھے۔ ہم کیسے مان لیں کہ وہ سارے غلط تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

کافر تو خیر ہے ہی محروم اسے جانے دیجیے۔ فکر کیجیے اس مسلمان کی جو کلمہ پڑھتا ہے، اللہ کو مانتا ہے، آخرت پر یقین رکھتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے اس کے باوجود جب موقع آتا ہے تو کام سنت کے مطابق نہیں رسم کے مطابق کرتا ہے۔ ہم کلمہ گو زبان سے تو یہی کہتے ہیں کہ حق وہی ہے جو اللہ نے فرمایا لیکن جب عمل کرتے ہیں تو انہی رسومات پر کرتے ہیں جو ہمارے باپ دادا سے چلی آرہی ہیں خواہ وہ خلافِ اسلام ہی ہوں۔ یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔ یہ ان کا شیوہ ہے جنہیں اسلام نصیب نہیں ہوا۔ مومن کا تو ہر کام شریعت کے دائرے کے اندر ہوتا ہے۔ یاد رہے جہاں بھی کوئی بدعت آتی ہے وہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت گرادی جاتی ہے تب اس جگہ پر بدعت آجاتی ہے جب سنت پر عمل کیا جائے تو بدعت پامال ہوجاتی ہے۔ بدعت اس عمل کو کہتے ہیں

جس کی اصل شریعت میں نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں نہ ہو اپنی طرف سے ایجاد کیا ہو اور اسے باعثِ ثواب سمجھا جائے۔

وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ﴿۱۰۹﴾ فرمایا، ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے انبیاءؑ کی تعلیمات کو پس پشت ڈالا اور اپنے خاندانی رواجات اور رسومات کا اتباع کیا سو ہم ان کو ان کا حصہ بلا کم و کاست ادا کر دیں گے کیونکہ انہوں نے اتباع نبوت چھوڑ کر اپنے باپ دادا کی رسومات کا اتباع کیا اور ان کے پیچھے چلے۔

یاد رہے باپ دادا کی رسومات کی پابندی کرنے کی وجہ ایک طرزِ فکر ہے۔ کام کا ارادہ کرتے وقت کام کرتے وقت نظر جب دنیوی مفادات اور دنیوی شہرت پر رہے، اس بات پر رہے کہ لوگ کیا کہیں گے اور کیا سوچیں گے تو یہ طرز فکر اللہ کی خوشنودی کے بجائے لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگائے رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ بھی یہی ہوگا کہ ان کو اس کا بدلہ بلا کم و کاست دے دیا جائے گا۔

بات کرتے وقت یا کام کرتے وقت اگر نظر آخرت پر رہے، قبر پر رہے تو اللہ کریم معاملہ درست کر دیتے ہیں۔ درست طرز فکر یہی ہے کہ یہاں میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا نتیجہ مجھے میدان حشر میں دیکھنا ہے لہٰذا میں اپنا معاملہ رب العالمین سے سیدھا اور کھرا رکھوں۔ اور لوگوں کا کیا ہے۔ لوگوں نے تو اپنا جواب دینا ہے۔ لوگ دنیا میں چند روز اچھا کہیں گے یا بُرا کہیں گے۔ کہہ لینے دیں۔ کوئی اثر نہ لیں۔ یہ دیکھیں کہ عنداللہ جو غلط ہے وہ غلط ہے۔ اور جو صحیح ہے وہ صحیح ہے جس کام کے کرنے کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے وہ درست ہے اور جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا ہے وہ غلط ہے۔

چونکہ ان لوگوں نے اپنے نبیؑ کا اتباع چھوڑ کر اپنے باپ دادا کی فرسودہ اور بے اصل رسومات کا اتباع کیا تھا، ان کے پیچھے چلے تھے تو وہ اس بدعملی کے نتیجے میں برے انجام کو ہی پائیں گے۔

سورۂ ھود رکوع 10 آیات 110 تا 123

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا
لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَآ
اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا
تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ
اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ
اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ
اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ
وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ
لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ
اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ
خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ
وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا

يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر یہ بات نہ ہوتی جو آپ کے پروردگار کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا اور یقیناً وہ تو اس سے بڑے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۱۱۰﴾ اور بے شک سب ایسے ہی ہیں کہ آپ کا پروردگار ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ ضرور دے گا اور یقیناً وہ سب کے اعمال کی پوری پوری خبر رکھتا ہے ﴿۱۱۱﴾ سو آپ اور جو لوگ توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہیں قائم رہیے، جیسے آپ کو ارشاد ہوا ہے اور حد سے نہ نکلیں۔ بے شک وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہا ہے ﴿۱۱۲﴾ اور ان ظالموں کی طرف مت جھکو پھر (ایسا نہ ہو کہ) تمہیں دوزخ کی آگ آ لگے اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی دوست نہیں پھر تم کو کہیں سے مدد نہ مل سکے گی ﴿۱۱۳﴾ اور نماز کی پابندی رکھیں دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں۔ بے شک نیک کام برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں یہ بات نصیحت ماننے والوں کے لیے ایک نصیحت ہے ﴿۱۱۴﴾ اور صبر کیا کیجیے پس بے شک اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں فرماتے ﴿۱۱۵﴾ تو جو امتیں تم لوگوں سے پہلے گزر چکی ہیں ان میں ایسے باشعور لوگ کیوں نہ ہوئے جو (دوسروں کو) ملک میں فساد (کفر و شرک) پھیلانے سے روکتے؟ ہاں (ایسے) تھوڑے (تھے) جن کو ان میں سے ہم نے (عذاب سے) بچا یا تھا اور جو لوگ نافرمان تھے وہ ناز و نعمت میں تھے اور وہ انہی باتوں کے پیچھے پڑے رہے اور وہ گناہوں کے عادی تھے ﴿۱۱۶﴾ اور آپ کا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو جبکہ وہاں کے لوگ نیکوکار ہوں تو زیادتی کے سبب تباہ کر دے ﴿۱۱۷﴾ اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا اور وہ ہمیشہ

اختلاف کرتے رہیں گے ﴿۱۱۸﴾ مگر جن پر آپ کے پروردگار کی رحمت ہو۔ اور اسی لیے ان کو پیدا فرمایا ہے اور آپ کے پروردگار کا ارشاد پورا ہوا کہ میں ضرور دوزخ کو اکٹھے جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا ﴿۱۱۹﴾ اور پیغمبروں کے قصوں میں سے یہ سارے قصے ہم آپ سے بیان فرماتے ہیں کہ ہم اس سے آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں اور ان (قصوں) میں آپ تک حق پہنچ گیا اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت اور عبرت ہے ﴿۱۲۰﴾ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان سے فرما دیجیے کہ تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو بے شک ہم بھی عمل کر رہے ہیں ﴿۱۲۱﴾ اور تم منتظر رہو یقیناً ہم بھی منتظر ہیں ﴿۱۲۲﴾ اور آسمانوں اور زمین کی غیب کی باتوں کا علم اللہ ہی کو ہے اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے سو اسی کی عبادت کیجیے اور اسی پر بھروسہ کیجیے اور جو کچھ آپ کر رہے ہیں آپ کا پروردگار اس سے بے خبر نہیں ﴿۱۲۳﴾

تفسیر و معارف

کلام الٰہی، اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ پرتو جمال الٰہی کا امین ہے۔ بندہ ایک بڑی عاجز سی چھوٹی سی مخلوق ہے، خاک کے چند ذرات کا مجموعہ ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں لیکن جب یہ انکار پر اتر آتا ہے۔ اللہ کے احکام سے ٹکراتا ہے تو کلام الٰہی کا کچھ نہیں بگڑتا یہ خود تباہ ہو جاتا ہے۔ موسیٰؑ کی قوم کے بارے فرمایا، وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۗ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا فرمائی لیکن لوگوں نے اختلاف کیا۔ دو گروہ بن گئے۔ کچھ نے اسے قبول کیا، کچھ نے انکار کر دیا۔ اللہ کے کلام کو نہ ماننا، اس پر یقین نہ کرنا جبکہ اللہ کا نبیؐ وہ کلام پہنچا رہا ہو۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ بندے کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے۔ فرمایا، اگر قدرتِ باری کی طرف سے یہ فیصلہ نہ کر دیا گیا ہوتا کہ لوگوں کو دنیوی زندگی کی مہلت دی جائے گی تو جب یہ کلام الٰہی کا انکار کرتے تو اسی وقت ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ وہ اسی لمحے گرفتارِ عذاب ہو جاتے۔ انہیں سمجھ آ جاتی کہ انہوں نے کیا کیا۔ ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ اللہ کریم نے ہر انسان کو مہلت دے دی ہے۔ ہر ایک کو استعداد دی ہے، تمیز اور پرکھ دی ہے اور اختیار دیا ہے کہ دو میں سے ایک راستہ چن لو۔ اگر کوئی تباہی کا راستہ

چنتا ہے تو اس کے پاس فرصت ہے۔ جب موت آئے گی تو وہ مہلت ختم ہوجائے گی۔ اس پر نتائج مرتب ہونا شروع ہوجائیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ انہیں کلام الٰہی پر یقین حاصل نہیں۔ ان کے دل میں شک ہے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے، بہت مشکل ہے، یہ نہیں ہوسکتا۔ انہیں یہ اس لیے مشکل نظر آتا ہے کہ انہیں اللہ کی معرفت نصیب نہیں۔ یہ اللہ کو قادر نہیں سمجھتے۔ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ آج دار دنیا میں تو ان کے پاس اللہ کی عطا کردہ مہلت ہے جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ جو چاہیں سوچیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ ایک وقت آرہا ہے کہ ہر عقیدے اور ہر عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ خیال بھی کوئی نہ کرے کہ اللہ سے چھپ کے کچھ کیا جاسکتا ہے یا یہ کہ شاید کوئی بات اللہ کی بارگاہ میں پیش نہیں بھی ہوگی۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ ذاتی طور پر ہر خیال سے اور ہر عمل سے واقف ہے۔ وہ عمل کے پیچھے جو ارادہ ہے اس سے بھی واقف ہے۔ وہ ان کے دلی ارادوں اور سوچ وخیال کو بھی جانتا ہے۔ لہٰذا جس کی جیسی سوچ وفکر، جیسا ارادہ ہوگا ویسا ہی اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ فرمایا، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے اس پر بالکل سیدھے قائم رہیے۔ نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے اور توبہ کی ہے۔

سورۃ ہود کی یہی آیت مبارکہ ہے جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں حق پر ایسی استقامت کا حکم ہے جس میں کسی طرف حد سے باہر نہ نکلا جائے۔ اس خطاب میں اپنی حیثیت کے مطابق امت کا ہر فرد شامل ہے۔ یہ حکم ہر اس شخص کو دیا جارہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کرتا ہے، ایمان لاتا ہے کہ بالکل سیدھے رہیے۔ جس طرح اللہ کا حکم ہے اسی طرح زندگی بسر کیجیے۔ اس سے دائیں بائیں مت ہوں اور کبھی حد سے تجاوز نہ کریں۔ اس حکم الٰہی کی تعمیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شان ہے کہ جن کی مثل مخلوق میں کوئی اور نہیں۔ صحابیؓ کی اپنی استعداد ہے۔ ایک ولی اللہ کی اپنی ہے، عالم کی اپنی استعداد ہے۔ کسی صالح کی اپنی اور ایک عام گنہگار کی اپنی استعداد ہے۔ ہر انسان کی استعداد مختلف ہے اسی حساب سے اسے قوت دی گئی ہے۔ وہ اسی کے مطابق کام کرسکتا ہے۔

اسلام اعتدال کا نام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر ایک لکیر کھینچی پھر اس کے ساتھ دائیں بائیں بہت سی لکیریں بنائیں اور فرمایا یہ سیدھی لکیر اللہ کا راستہ ہے اور جو دائیں بائیں نکلیں گے وہ اللہ کی راہ سے بھٹک جائیں گے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم انتہا پسند ہیں۔ یا ایک طرف نکل جاتے ہیں یا دوسری انتہا پر جبکہ راستہ درمیان میں ہے جو توازن اور اعتدال کا راستہ ہے کہ اللہ کی شان اللہ کو سزاوار ہے۔ عظمتِ نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ عظمتِ صحابہؓ صحبت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے باعث صرف انہیںؓ کا مقام ارفع ہے۔ اولیاء اللہ کا اپنا مقام ہے، علماء کرام کا اپنا، مومن کا اپنا ہے، کافر کی اپنی جگہ ہے۔ انہیں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ آج لوگ نعتوں میں بے شمار ایسے اشعار پڑھتے ہیں جن میں اوصاف باری تعالیٰ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہ صریح شرک ہے۔ ایسے لوگ نعت کو سمجھتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بڑھا رہے ہیں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا کہ اللہ واحد لاشریک ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت رسالت و نبوت پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسلام عین حق ہے اس راہ حق پر پوری احتیاط سے قدم رکھنا چاہیے۔ اللہ، اللہ ہے۔ وہ اپنی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہیں رکھتا۔ وہ یکتا ہے۔ انبیاءؑ اس کے برگزیدہ بندے ہیں جنہیں اس نے مخصوص زمانوں میں بندوں کی اصلاح کے لیے بھیجا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ورسول ہیں۔ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی عظمت ہے۔ تمام انبیاءؑ اس لیے مبعوث ہوئے کہ انؑ کا اتباع کیا جائے۔ انؑ کی پیروی کی جائے۔ ان کی اطاعت خلوصِ دل سے کی جائے۔ حضور ﷺ بعثت سے لے کر قیامت تک ساری انسانیت کے لیے نبی رحمت ﷺ ہیں اور سب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع فرض ہے۔ ضروری ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا، فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ آپ اس راہ حق پر سیدھے کھڑے رہیے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے ہیں وہ بھی کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ کسی حد سے نہ نکلیں۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ اس لیے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ اسے ہر حال میں دیکھتا ہے۔ وہ اللہ سے کسی طور چھپ نہیں سکتا۔ ارشادِ باری ہے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (الحدید:4) تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ کریم تمہارے ساتھ ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے، جان رہا ہے۔

بدکاروں سے میلان طبعی کا نتیجہ:

فرمایا، انسانی مزاج ایسا ہے کہ دنیاداروں کو اقتدار میں دیکھ کر، ان کے پاس دولت کے انبار دیکھ کر بندہ اس طرف مائل ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ رہوں، یہ راضی رہیں، ان کو خوش رکھوں۔ فرمایا وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کبھی ظالموں کی طرف اپنا جھکاؤ مت رکھو۔ جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نافرمان ہیں ان

کی طرف میلانِ طبعی بھی حرام ہے۔ ان سے امیدیں وابستہ نہ کرو۔ ان کو خوش کرنے کی کوششیں نہ کرو۔ یہ تمہارا نہ کچھ سنوار سکتے ہیں نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ بدکاروں کے ساتھ میل جول رکھنا بھی جہنم میں لے جاتا ہے۔ برائی کر کے کفر کر کے لوگ جہنم جاتے ہیں اور وہ جو کفار کی عظمت کے قائل ہو کر ان کی پیروی کرتے ہیں، ان کی طرف میلانِ طبعی رکھتے ہیں، ان کا احترام کرتے ہوئے ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی جہنم ہی جاتے ہیں۔ یہ جرم کہ کسی کافر بے دین کی اتنی عزت کی جائے کہ سنتِ مطہرہ چھوڑ کر اس کا اتباع اختیار کر لیا جائے تو یہ جہنم لے جانے کے لیے کافی ہے۔ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اور یہ یقینی بات جان لو کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ جو ضرورت ہے، جو چاہیے وہ اپنے پروردگار سے مانگو۔ اور جب دیتا ہے تو وہی دیتا ہے۔ جو کچھ عطا فرماتا ہے وہ خود عطا فرماتا ہے۔ کسی کا کوئی احسان نہیں۔ انسان کسی کو دینے کے قابل ہی نہیں اسی لیے ہر انسان اپنی ذات میں خود محتاج ہے۔ غریب سمجھتے ہیں کہ اُمراء کے پاس جائیں گے تو ہمیں بہت کچھ مل جائے گا جبکہ امیر تو خود معذور ہوتے ہیں کوئی غریب آ جائے تو خوش ہو جاتے ہیں کہ شکر ہے آ گیا ہے اب میرے فلاں، فلاں کام کر دے گا۔ سب انسان اپنی اپنی ضروریات کے ہاتھوں محتاج ہیں۔

فرمایا کہ اگر کوئی دولت مند، صاحب اقتدار دیندار ہے تو دین کی وجہ سے اس کے ساتھ طبعی میلان رکھو، میل جول رکھو۔ اگر اللہ کا نافرمان ہے تو اس کے قریب ہونے سے بچو، طبعی میلان ہرگز نہ رکھو۔

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا آخری دنوں میں ذیابیطس کا مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔ کمرے میں لیٹے رہتے تھے۔ ملتان کے ڈپٹی کمشنر ان کے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے قاصد بھیجا کہ کسی دن تشریف لائیں میرے ساتھ چائے پئیں۔ جب قاصد پہنچا تو فرمایا، ''حکمرانوں نے جب بھی مجھ سے ملاقات کی ہے مجھے گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ میں چل کر نہیں آیا۔ اس سے کہو اگر میری ضرورت ہے تو پولیس بھیجو، گرفتار کر کے لے جائیں۔ میں چل کر کسی حکمران کے دربار میں نہیں جا سکتا۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا! وہ خود ملنے کے لیے حاضر ہوا کہ میں تو عقیدت سے ملنا چاہتا تھا۔ فرمایا یہ کیسی عقیدت ہے! تم بھی اسی اقتدار کا حصہ ہو جو مسلمانوں کو مبتلائے عذاب کیے ہوئے ہے۔ یہ عقیدت رسومات کی حد تک ہے عقیدے کی حد تک نہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں یہی بات فرمائی جا رہی ہے کہ جب تمہارا تعلق خاطر اللہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو تمہیں کسی کی کیا ضرورت تمام حاجات اللہ پوری فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے راستے کی بہترین رہنمائی فرماتے ہیں تو تم ان ظالم، بدکار، بے دین صاحب اقتدار لوگوں کی طرف میلان طبعی مت رکھنا۔ ان کی طرف اپنا جھکاؤ مت رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں بھی اپنے ساتھ دوزخ میں گھسیٹ کر لے جائیں۔ اللہ

کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، کوئی تمہارا بھلا چاہنے والا نہیں لہٰذا اسی کے ساتھ رہو۔ اللہ کے ساتھ رہنے کا واحد راستہ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اگر تم دنیاداروں پر ہو گیا تو اوپر سے بات کٹ گئی۔

صلوٰۃ سے مومن کے دن رات روشن:

فرمایا، اپنے رات اور دن کو اللہ کی عبادت سے روشن رکھیں۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ دن کے دونوں سروں پر صلوٰۃ قائم کریں۔ فجر کو، مغرب وعشاء کو۔ دن نمازیں بھی ہیں اور رات میں بھی۔ قرآن حکیم میں ہمیشہ اجمالی بات ارشاد ہوتی ہے۔ اس کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ جیسے یہاں قرآن نے صلوٰۃ کا حکم دیا۔ اب کی تفصیل کہ صلوٰۃ کیسے ادا ہوگی، کس وقت، کتنی رکعت پڑھنا ہوگی۔ اس میں قیام، رکوع، سجود، تشہد میں کیا پڑھنا ہوگا، کیا پڑھنا ہوگا یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کے دن اور رات کو اس طرح روشن کر دیا کہ فجر طلوع ہوتی ہے تو اٹھ کر اللہ کو سجدہ کرو، صلوٰۃ ادا کرو۔ دن ڈھلے ظہر کی صلوٰۃ میں بارگاہ ربوبیت میں حاضر ہو کر اپنی حاضری لگواؤ۔ عصر کے وقت جب چھٹی کا وقت ہوتا ہے۔ کاروبار بند ہونے لگتا ہے۔ چرواہے بھی واپس آنا شروع ہو جاتے ہیں اس وقت پھر اللہ کی بارگاہ میں حاضری دو دن ڈوب جاتا ہے مغرب ہو جاتی ہے پھر اللہ کی بارگاہ میں فرض ادا کرو۔ سونے سے پہلے عشاء پڑھو۔ تمہارا رات دن روشن ہو جائے گا۔ آدھی رات کو یا تین پہر رات گزرے یا عشاء کے بعد تھوڑی دیر سو کر اٹھ جاؤ تو تہجد کے نفل ادا کر لو تو تہجد تمہاری کوتاہیوں، لغزشوں، غلطیوں کی بخشش کا سبب ہوگا۔

نیکی کی خصوصیت:

نیکی بجائے خود نیکی ہے لیکن اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ برائیوں کو مٹا دیتی ہے انسان سے بتقاضائے بشریت جو کوتاہی، سستی، غلطی یا قصور ہو جاتا ہے اسے بھی صاف کر دیتی ہے فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ نیکیاں، گزشتہ برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ گناہوں کی بخشش کا سبب ہیں ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ جو اللہ کی یاد میں رہتے ہیں، جو دن رات اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ جن کے دل نصیحت کے لیے کھلے ہوئے ہیں، جو متوجہ الی اللہ رہتے ہیں ان کے لیے بہت بڑی نصیحت ہے۔

عبادت کا اثر:

ہمیں اپنی عبادات کو دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی اثر ہمارے کردار پر بھی آیا یا نہیں! عبادت سے

برائیوں میں کمی آتی ہے۔نیکیوں کی پسندیدگی پیدا ہوتی ہے۔توبہ اور اصلاح کردار پر چلنے کی توفیق ہوتی ہے تو کیا ہماری عبادت سے ہم پر ایسا کوئی اثر آیا!

قرآن حکیم میں دوسری جگہ اسی ضمن میں ارشاد باری ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ (العنکبوت:45) یہی نہیں کہ نیکی کرنے سے پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں بلکہ آئندہ کے گناہوں سے بھی بندہ بچ جاتا ہے۔محض ایک طرف ہی نہیں لگے رہنا چاہیے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مجھے اللہ کی عبادت تو نصیب ہے لیکن کیا اس عبادت سے میرے حالات سدھر رہے ہیں یا میں ویسے ہی برائیاں کرتا چلا جارہا ہوں۔اگر برائیاں جاری ہیں تو پھر عبادت میں کوئی کمی ہے جو صابن میل نہیں کاٹتا وہ صابن نقلی ہے۔عبادت اگر صحیح ہوں تو گزشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں آئندہ برائی کرنے سے بچا لیتی ہیں۔

یہ بہت قیمتی بات ہے لیکن انہی کے لیے جنہیں اس کی قیمت کا اندازہ ہے۔جو متوجہ الی اللہ رہتے ہیں، جو ان باتوں کو سننا چاہتے ہیں، جو سدھرنا چاہتے ہیں۔وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۱۱۵﴾ اور صبر کیا کیجیے۔اللہ کریم خلوص سے نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

تبلیغ اپنے آپ کو منوانے کے لیے نہیں:

اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) صبر کیجیے اس لیے کہ آپ جو فریضہ ادا کر رہے ہیں اللہ کریم اس کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔اس کا مطلب ہے کہ جب دین کی بات کی جائے گی تو ہر ایک تسلیم نہیں کرے گا۔ہر آدمی کا ردِّ عمل اپنا ہوتا ہے اور اس کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔جس طرح بارش کا پانی ایک ہی ہوتا ہے لیکن ہر زمین کا ردِّ عمل اپنا اپنا ہوتا ہے۔صاف، نرم اور اچھی زمین پر بارش برستی ہے تو فصلیں اگتی ہیں۔غلاظت کے ڈھیر پر برسے تو مزید بدبو پھیلتی ہے۔اسی طرح جب دین کی بات کی جاتی ہے، دین کی تبلیغ کی جاتی ہے تو ہر فرد کا ردِّ عمل اس کی اپنی ذات کے مطابق ہوتا ہے۔کسی نے اپنے دل کو صاف رکھا ہوا ہے۔اس کا دل اچھا ہے تو اس کا ردِّ عمل مثبت ہوگا۔جس کا دل غلاظت اور کدورتوں سے بھرا ہوا ہے تو اس کا ردِّ عمل منفی ہوگا۔ان حقائق پر صبر کرنا چاہیے۔برداشت کرنا چاہیے۔یہ اُمید نہیں رکھنا چاہیے کہ میں جو کہہ رہا ہوں اسے ساری دنیا تسلیم کرلے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اور تھی۔ہم تو اپنی بات منوانے کے لیے کہتے ہیں کہ میں کہہ رہا ہوں تو سب مان لیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات منوانے کے لیے نہیں دوسروں کی خیرخواہی چاہتے ہوئے فرماتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھ ہوتا تھا کہ میری بعثت کے بعد بھی کوئی شخص

عذاب الٰہی میں کیوں گرفتار ہو؟ کیوں نہ میری بات مان لیں اور اللہ کی رحمت کو پالیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو ہر جگہ مثبت جواب نہیں ملتا تو پھر کسی دوسرے کی کیا حیثیت ہے کہ وہ یہ توقع رکھے کہ جو وہ کہے اسے سب مان لیں۔ یہ توقع ہی فضول ہے۔ ہاں وہ خوش نصیب ہیں جو دین کی بات قبول کرتے ہیں۔ اور یہ قانون بھی یاد رکھ لیں کہ اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ سننے والا اگر قبول نہیں کرتا تو اس کا معاملہ کے ساتھ ہے لیکن مبلغ کے لیے لازم ہے کہ وہ خلوص سے بات کرے یعنی تبلیغ اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ یہ بڑا نازک مقام ہے کہ جو بندہ نیکی کی تلقین کرتا ہے اکثر اوقات اسے اپنی ذات کا زعم ہو جاتا ہے کہ میں نے چونکہ کہہ دیا ہے لہٰذا میری بات مانی جائے۔ یا اتنے لوگ میری بات مانتے ہیں، میرا احترام کرتے ہیں تو باقی بھی میری بات مانیں۔

نہیں۔ تبلیغ اس کے لیے نہیں۔ اپنے آپ کو منوانے کے لیے نہیں خلوص دل سے اللہ کی رضا کے لیے کریں۔ الْمُحْسِنِيْنَ اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ محسنین وہی ہیں جو خلوص دل سے نیکی کرنے والے، خلوص سے عبادت کرنے والے اور خلوص دل سے اللہ کے پیغام کو اللہ کے لیے، لوگوں کی خیر خواہی میں پہنچانے والے ہیں۔

نیکی کی ترویج ضروری:

فرمایا، فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ جو امتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گزر چکی ہیں ان میں سے جو امتیں گرفتار بلا ہوئیں، جن پر عذاب آیا اور تباہ ہو گئیں ان میں ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندے کو صرف اپنی عبادات ادا کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے ساتھ ساتھ نیکی کی تبلیغ اور ترویج بھی کرنی چاہیے اور جو لوگ غلط کار ہیں ان کو سمجھانے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ انسان کے انفرادی کردار کا ردِ عمل معاشرے تک پہنچتا ہے۔ ہر فرد جو عمل کرتا ہے اس کا اثر پورے ماحول اور روئے زمین تک کو متاثر کرتا ہے۔ اس طرح جو شخص برائی کرتا ہے وہ صرف اپنا نقصان ہی نہیں کرتا بلکہ پورے معاشرے پر ظلم کرتا ہے۔

اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

فرمایا ان میں چند قلیل تعداد میں ایسے لوگ بھی تھے کہ وہ ممکن حد تک لوگوں کو برائی سے روکتے رہے۔ جس قدر ان کے بس میں تھا وہ کہتے رہے لیکن وہ اتنی تھوڑی تعداد میں تھے کہ لوگوں نے ان کی سنی نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نیکی کرنا ایک عمل ہے اور اس کی اشاعت کرنا دوسرا عمل ہے اور دونوں لازمی ہیں۔ اگرچہ ان کی سنی نہیں گئی لیکن ان کی تبلیغ اور نیکی کی اشاعت کا ایک فائدہ ہوا کہ جب عذاب الٰہی آیا تو ان لوگوں کو اللہ کریم نے عذاب سے بچا لیا۔

اس کا مطلب ہے کہ چھپ کر نیکی کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ڈٹ کر نیکی کی جائے اور دوسروں کو اس کی تلقین بھی کی جائے۔ اللہ کریم کے ارشادات اور ارشادات رسالت کی اشاعت کی جائے، عام کیا جائے اور لوگوں کو سمجھایا جائے۔ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۱۱۶﴾ اور اکثریت جن لوگوں کی تھی، جنہوں نے ظالموں اور بدکاروں کی پیروی کی اور اسی پر قائم رہے وہ بہت بڑے مجرم تھے لہٰذا تباہ ہو گئے وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿۱۱۷﴾ فرمایا، آپ کا پروردگار ایسا نہیں کہ لوگ تو بھلائی کر رہے ہوں اور وہ چند قلیل بدکاروں کی وجہ سے نیکوکاروں کو تباہ کر دیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ جب بھی برائی غالب آ جاتی ہے۔ اکثریت برائی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس معاشرے پر نتیجتاً عذاب مرتب ہو جاتا ہے اور اچھے لوگوں کا اجر ضائع نہیں جاتا۔ جب باقی سب پر عذاب آتا ہے تو اللہ کریم ان کو بچا لیتے ہیں۔ وہ اس عذاب کی نذر نہیں ہوتے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے امتوں پر مجموعی طور پر عذاب آتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اللہ کریم نے اجتماعی عذاب بند کر دیے۔ جس طرح اللہ کی نافرمانی پر پہلے قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی تھیں ایسے عذابوں سے اللہ نے بطفیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو محفوظ کر دیا۔ لیکن نافرمانی کے جو اثرات انسانوں کے ہاتھوں معاشرے پر مرتب ہوئے وہ تو ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج معاشرہ اپنے افراد کے کردار سے متاثر ہو کر کس تباہی پر پہنچ چکا ہے۔ محکمے، پولیس، فوج، حکمران سب موجود ہیں لیکن ہر فرد غیر محفوظ ہے آج فساد فی الارض کا سبب ہماری بدکرداری ہے۔ ہم نے من حیث القوم اللہ کا دروازہ چھوڑ دیا ہے الا ماشاء اللہ اور اپنی امیدیں دنیا داروں اور ظالموں سے وابستہ کر لی ہیں۔ ان کی خوشامد کرتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ جب افراد کی اکثریت کا نظریہ محض حصولِ دنیا بن جائے۔ زبان سے اسلام کا اقرار کرتے رہیں لیکن عملی زندگی میں بدکاروں کی پیروی کریں، انہیں خوش رکھنا، ان سے امیدیں وابستہ کرنا اپنا مقصد بنا لیں تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتی ہے۔ آج معاشرہ اسی کا شکار ہے۔ اگرچہ مجموعی عذاب سے بچے ہوئے ہیں لیکن انفرادی اعمال کے اثرات نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتے بندے خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿۱۱۸﴾ اللہ کریم تو ایسے قادر ہیں کہ جب مخلوق کو پیدا فرمایا تھا تو سب کو نیکی پر لگا دیتے لوگ برائی کا راستہ ہی نہ اپناتے اور نہ یہ فساد ہوتے۔ لیکن پھر انسان کی تخلیق کا مقصد ہی پورا نہ ہوتا۔ اور اللہ کی ایسی مخلوق یعنی فرشتے تو پہلے سے موجود تھے جو وہی کرتے جو اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ انسان بھی صرف نیکی کرتا۔ اس کے پاس

اپنی پسند نہ ہوتی۔ پسند اختیار کرنے کا اختیار نہ ہوتا تو اس میں اور فرشتے میں کیا فرق ہوتا۔ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی ہو۔

تفسیر مظہری (اردو) جلد 12 صفحہ 309 پر مفہوم حدیث مذکور ہے: کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا لأُعَرَفَ فأَحْبَبْتُ أَنْ أُعَرف مجھے یہ بات پسند آئی کہ کوئی تو میرا پہچاننے والا بھی ہو۔

انسان کے علاوہ جتنی مخلوق ہے ان میں معرفتِ الٰہی کا وہ شعور نہیں جو انسان کو عطا ہوا ہے۔ اللہ کے مقربین فرشتے بھی حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان میں یہ تاب نہیں کہ وہ حاکم کی طرف دیکھیں۔ یہ شرف صرف انسانیت کو بخشا گیا کہ وہ اللہ کی ذات کی معرفت اپنی استعداد کے مطابق حاصل کرے۔ اللہ نے چاہا کہ ایک مخلوق ایسی بھی ہو جس کے سامنے میں دنیا جہان کی نعمتیں بکھیر دوں۔ دنیا کی لذتیں حسن و جمال، عیش و عشرت سب اس کے سامنے ڈھیر کر دوں اور دوسری طرف میرا اجمال جہان آفرین ہو اور اس کے پاس اختیار ہو کہ وہ دنیا کو اختیار کرتا ہے یا میری ذات پر قربان ہوتا ہے کوئی ایسی مخلوق ہو جو مجھے پہچان کر اپنی پسند سے میرا انتخاب کرے جو میرے حکم سے نہیں مجھے پہچان کر میری اطاعت کرے۔ اس کے لیے دنیا کو ٹھکرا دے۔ میرے در پہ جبہ سائی کرے، مجھ پر قربان ہو جائے میرے لیے جان دے دے۔ میری یاد میں اس کی زبان اس کا دل ہمہ وقت اللہ اللہ کرے تو میں نے انسان کو پیدا کیا فَخَلَقْتُ خَلْقاً۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد ہی یہی تھا۔ اگر انہیں مجبور کر دیا جاتا کہ صرف نیکی کرو گے تو پھر یہ مقصد ہی فوت ہو جاتا لہٰذا انسان کو اختیار دیا گیا لیکن اللہ کریم نے انسان کی رہنمائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انبیاءؑ مبعوث فرمائے جو بالکل سچے، کھرے انسان تھے۔ ہر نبیؑ نے سچی کھری بات کہی اور انتہائی خلوص سے دعوت دی۔ پھر اللہ کریم کا احسان عظیم ہوا۔ آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری انسانیت کے لیے مبعوث فرمائے گئے جنہیں بدترین دشمن بھی صادق اور امین کہتے تھے۔ کلام الٰہی، القرآن الحکیم سے بڑی امانت کیا ہو گی! کلام الٰہی کا ایک ایک لفظ بذریعہ وحی صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ کسی دوسرے شخص نے نہیں سنا۔ پوری انسانیت کی رہنمائی ایک ہستی کی زبان مبارک سے ہو رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ قرآن ہے تو ہم مانتے ہیں یہ قرآن ہے۔ اس کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی وہ حدیث رسولؐ ہے ہم اسے حدیث مانتے ہیں۔ چودہ صدیاں بیت گئیں۔ پندرھویں صدی کا بھی ربع گزر گیا کوئی اسے غلط ثابت نہ کر سکا۔ برسوں تحقیقات کے بعد سائنس بمشکل پہنچی تو وہاں تک جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے فرما دیا تھا۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ سورج کی روشنی ذاتی

ہے اور چاند، سورج کی روشنی سے روشن ہوتا ہے۔

انسانی ولادت کے جو مرحلے اور جس ترتیب سے قرآن حکیم میں بتائی گئی کہ پہلے خون کا ایک لوتھڑا بنتا ہے پھر اس سے گوشت بنتا ہے۔ ہڈیاں بنتی ہیں۔ پھر اس پر کھال چڑھتی ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ بڑی تحقیق کے بعد سائنس یہاں تک پہنچی۔ آج جو مادی ترقی کے پیش رو بنے ہوئے ہیں یہ تو جنگلوں میں رہنے والے جاہل لوگ تھے۔ انسانی اقدار سے بھی نا آشنا تھے۔ آج کے سائنسی ترقی کی ایجادات مسلمانوں نے ہی رکھی اور تعلیمات نبوی کے فیضان سے رکھی۔

اللہ کریم چاہتے تو ساری انسانیت کو نیکی پر ہی لگا دیتے لیکن پھر تخلیق انسانیت کا مقصد پورا نہ ہوتا۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ اب وہی نیکی کرے گا جس کا تعلق اللہ کریم سے ہوگا۔ جو خلوصِ دل سے اپنے ربّ سے رشتہ جوڑے گا وہی اللہ کی رحمت کو پائے گا جس پر اللہ کا رحم ہوگا وہی بھلائی کرے گا۔

اللہ کا رحم حاصل کرنے کا نسخہ:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں جتنی رحمت کوئی اللہ کریم سے لے سکتا ہے وہ دامان رسالت کو تھام کر ہی مل سکتی ہے۔ جو اللہ کا رحم پانا چاہتا ہے وہ اتباع رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام کرلے۔ اللہ کا رحم حاصل کرنے کا ایک ہی نسخہ ہے۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ انسان کی تخلیق اسی لیے ہوئی تھی کہ اسے دنیا کی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کی توفیق بھی دی جائے۔ یہ بھی اس کا کرم ہے کہ اس نے کسی نعمت کے استعمال کو بند نہیں کیا۔ اس نے پسند فرمایا ہے کہ اللہ کی ساری نعمتوں سے مستفید ہو لیکن جو قاعدہ طریقہ اللہ نے بتایا ہے اس کے مطابق ہو۔ نہ اچھی گاڑی رکھنا منع ہے نہ اچھا لباس پہننا۔ نہ اچھا کھانا منع ہے نہ اچھی رہائش صرف ایک ہی شرط ہے۔ اللہ کے حکم کے مطابق ہو، حضور ﷺ کی رہنمائی کے مطابق ہو۔ اپنی حیثیت کے مطابق اپنا رہن سہن رکھنا اللہ کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ سکھایا گیا ہے کہ اللہ کے انعامات کو بیان کیا کرو۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○ (الضحیٰ:11)

مادی، دنیوی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کریم نے بطور انعام اپنی عبادت کی توفیق بخشی۔ ایک مشت غبار کو اجازت دی کہ کائنات کے مالک کو ملنے کے لیے آؤ۔ پانچ بار آؤ۔ اسے بندے کی راحت بنا دیا۔ اللہ کی بارگاہ میں حاضری کی کیا شان ہے۔ صلوٰۃ میں بندہ اللہ کو مخاطب کرتا ہے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (یونس:10) اے

اللہ تو پاک ہے۔ پھر اللہ سے مدد مانگتا ہے۔اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ○(الفاتحہ: 4)اللہ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔تجھی سے ساری امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازی کے آگے گزرنے سے منع فرمایا ہے۔ارشاد نبوی ہے نمازی کے آگے سے مت گزرو فِاِنَّهٗ يُنَاجِي رَبَّهٗ (مسند احمد) وہ اپنے رب سے مناجات کررہا ہے۔ یہ اس کا اپنے رب سے معاملہ ہے۔ وہ اپنے دل کی باتیں کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے پروردگار سے اپنا دکھ سکھ بیان کررہا ہے۔ یہ ہے عبادت جو اللہ کا انعام واحسان ہے جسے ایک بوجھ،ایک مصیبت اور ایک بیگار سمجھ لیا گیا ہے۔

لوگ جب اپنے مسائل لکھتے ہیں تو یہ بھی ضرور لکھتے ہیں کہ میرے لیے دعا کریں مجھ سے نماز نہیں پڑھی جاتی۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ اللہ کریم بندے سے فرماتے ہیں آؤ مجھ سے مل لو، میرے ساتھ بات کرلو اور بندہ اپنے جیسے دوسرے بندے سے کہتا ہے آپ دعا کردیں۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا تو اس میں دعا کیا کرے گی۔ایک شخص کو اللہ کریم اپنے بندے صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یہ پیغام دیتے ہیں کہ اٹھ جا۔ میرے پاس آ، مجھے بتا تجھے کیا چاہیے۔ اپنا مسئلہ بتا۔ سیدھا مجھ سے مخاطب ہو، میرے سے براہ راست بات کر اور وہ کہتا ہے مجھ سے تو اٹھا نہیں جاتا۔ آپ میرے لیے دعا کردیں تو اس میں دعا کیا کرے گی! دعا کرنے والے کو تو ثواب ملے گا لیکن نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک طرف ادنیٰ سی حقیری مخلوق دوسری طرف خالق مالک، رب العالمین ہے اور حقیر مخلوق کہتی ہے مجھ سے تو آپ کی بات نہیں سنی جاتی نہ اپنی بیان کی جاتی ہے اور میں تو آپ کے حضور نہیں آرہا تو پھر درمیان میں کسی تیسرے کی گنجائش ہے؟ پھر وہ ذات کریم جانے اور اس کی مخلوق جانے۔لیکن ہم ان باتوں پر غور نہیں کرتے۔کاش! ہم سمجھتے کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے۔ جس بندے کو دن میں پانچ مرتبہ بارگاہ ربوبیت میں حاضری کی توفیق ہو اور وہ اپنے دل کی باتیں رب العالمین کی بارگاہ میں عرض کرسکتا ہو اسے کسی کی محتاجی رہ جاتی ہے، کوئی ضرورت باقی رہتی ہے کہ وہ کسی کی خوشامد کرے یا کسی کے دروازے پر جائے۔ کاش! اس نعمت کی حقیقت سمجھ میں آئے۔وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴿۱۱۹﴾ فرمایا، آپ کے پروردگار کا فیصلہ نافذ ہوچکا۔ وہ انسان کی تخلیق سے پہلے جانتا تھا کہ کون کون دنیا پر ریجھے گا اور کتنے لوگ مجھ پر فدا ہوں گے۔ وہ حاضر و غائب سب کو جانتا ہے۔اس کا علم حضوری ہے۔ ہر چیز اس کی بارگاہ میں ہمہ وقت حاضر ہے۔اس کے علم میں ماضی و مستقبل نہیں حال ہی حال ہے۔ انسانوں کو پیدا کرنے سے پہلے بھی اسے پتہ تھا کہ کون لوگ نافرمان ہوں گے اور کون اطاعت گزار۔اس نے مخلوق کو

پیدا فرمایا۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں نافرمان بھی اتنے ہوں گے کہ جنوں اور انسانوں سے دوزخ بھر جائے گا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ قرآن حکیم قصے تاریخی اعتبار سے بیان نہیں فرماتا۔ یہ اس لیے بیان کیے جاتے ہیں کہ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو تسلی رہے کہ پہلے انبیاء کے ساتھ ہی اسی طرح ہوتا رہا ہے اور نیکی و بدی کا مقابلہ جاری رہتا ہے۔ نور و ظلمت، شب و روز، تاریکی و روشنی اس دنیا کا حصہ ہیں۔ انبیاء کے قصے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرمائے گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو تقویت ملے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ صرف میرے ساتھ ایسا نہیں ہو رہا۔ اس دنیا میں چونکہ بندے کو خود اختیار دیا گیا ہے تو وہ خود فیصلہ کرتا ہے۔ کوئی دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم تھامتا ہے، کوئی بھاگتا ہے۔ یہ اپنے اپنے کردار کی بات ہے۔ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ دوسری بات یہ ہے کہ یہ قصے پہلی کتابوں میں اتنی تفصیل سے بیان نہیں ہوئے تھے۔ اجمالاً ذکر تھا تفصیل نہیں تھی جتنی کہ قرآن حکیم میں ہے۔ لوگوں نے واقعات میں رنگ آمیزی کر کے کہانیاں گھڑ لی تھیں۔ غلط واقعات بنا کر ان کے غلط نتائج اخذ کر لیے تھے۔ اس سب کی بھی اصلاح ہوگئی کہ ان قصوں کے حقیقی واقعات بتا دیئے گئے۔ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اس میں اللہ کی عظمت کا تذکرہ آ گیا یہ ایک نصیحت بن گئی۔ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو قبول کرتے ہیں ان کے لیے اس میں بہترین نصیحت ہے۔ عظمت الٰہی کے واضح دلائل ہیں۔ عبرت کا سبق ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ اور جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے انہیں کہیے تمہیں اللہ نے فرصت و مہلت دی ہے۔ تمہیں روزی دے رہا ہے، اولاد اور گھر دے رکھے ہیں۔ حکومت و اقتدار اس کا دیا ہوا ہے۔ جو تم صحیح سمجھتے ہو وہ کیے جاؤ جو ہمیں اللہ نے صحیح بتایا ہے وہ ہم کر رہے ہیں۔ تم اپنی جگہ کرتے رہو ہم اپنی جگہ کام کر رہے ہیں وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ تم بھی اپنے نتیجے کا انتظار کرو ہم بھی اپنے کام کے نتیجے کے منتظر ہیں۔ کتنا ہی طویل راستہ ہو اس پر چلنا شروع کر دیں تو ایک دن منزل آ جاتی ہے۔ کتنی طویل زندگی ہو ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تم وہی عمل کرنا چاہتے ہو تو کرتے رہو۔ انتظار کرو کہ تم کہاں پہنچتے ہو۔ ہم بھی اس بات کے منتظر ہیں کہ ہم کہاں پہنچتے ہیں۔ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ زمین و آسمان کے امورِ غیبیہ کو جاننا صرف اللہ کے لیے ہے۔ وہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ اسے پتہ ہے کون ایمان لایا، کون کتنے خلوص سے کیا کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے جو گمراہی اختیار کر رہا ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف تمہارا ظاہر قول و عمل ہے۔ حقیقت حال سے وہ واقف ہے۔

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔ ہر چیز نے واپس اسی کی بارگاہ میں پہنچنا

ہے۔اسی نے سب کا حساب لینا ہے۔اسی نے سب کو اجر دینا ہے۔یہ سب اسی کو سزاوار ہے۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ط سو اسی کی عبادت کیجیے۔صرف اللہ ہی کی اطاعت کیجیے اور آپ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں تو پھر اسی پر بھروسہ کیجیے۔وہ کارساز ہے۔آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پروردگار کام کرنے والوں کے کاموں سے کبھی بے خبر نہیں۔اسے سب پتہ ہے کون کیا کر رہا ہے۔جس طرح اس کی ذات قدیم ہے اسی طرح اس کا علم بھی قدیم ہے لہٰذا لوگوں کو اسی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیجیے یہ اس کی اپنی مخلوق ہے۔

اللہ کے نبیؑ بے حد کریم وشفیق ہستیاں ہیں۔اللہ کے ایک نبیؑ نے فرمایا تھا اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ اگر تو انہیں عذاب دے گا تو تیرے بندے ہیں، تیری مخلوق ہے تیری اپنی ملکیت ہے تو جانے اور وہ جانے وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (المائدہ:118) اگر معاف کر دے تو غفور اور رحیم ہے۔انبیاء اتنی کریمانہ ہستیاں ہوتی ہیں کہ امتی کوتاہیاں کرتے ہیں وہ سفارش کرتے ہیں۔شرط صرف یہ ہے کہ انؑ کے دامن سے وابستہ تو رہا جائے۔کوتاہی کمزوری انسان سے ہوتی رہتی ہے لیکن اس کی کوشش یہی ہو کہ اللہ کے حاضر رہوں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے وہی حق ہے۔وہی کرنا چاہیے۔

ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسماً نہیں لینا چاہیے کہ خیر ہے۔قرآن میں لکھا ہے تو خیر ہے۔یہ صرف خیر کی بات نہیں یہ وہ حقائق ہیں جن پر آخرت کا فیصلہ ہوگا۔نجات کا یا عذاب کا فیصلہ ہوگا تو انہیں اسی اہمیت سے لینا چاہیے۔توفیق اللہ کے پاس ہے۔

اللہ کریم ہماری خطائیں معاف فرمائے اور اتباع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق عطا فرمائے۔

سورۃ یوسف رکوع 1 آیات 1 تا 6

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۟ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٢ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝٣ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝٤ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝٥ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٦

الرا قف۔ یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں ﴿۱﴾ بے شک ہم نے قرآن کو عربی میں نازل فرمایا تا کہ تم سمجھ سکو ﴿۲﴾ ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس کے ذریعے ہم آپ کو ایک بہت اچھا قصہ سناتے ہیں اور آپ کو پہلے اس کی خبر نہ تھی ﴿۳﴾ جب یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد سے کہا، اے ابا جان! بے شک میں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ﴿۴﴾ انہوں نے فرمایا اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا پس وہ تمہارے ساتھ کوئی فریب کریں گے بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ﴿۵﴾ اور اسی طرح آپ کا پروردگار آپ کو چن لے گا

چن لے گا (برگزیدہ کر دے گا) اور آپ کو (خواب کی) باتوں کی تعبیر کا علم عطا فرمائے گا اور آپ پر اولادِ یعقوبؑ پر اپنی نعمت پوری فرمائے گا جس طرح پہلے اس نے (اپنی نعمت) آپ کے دادا ابراہیم اور اسحٰق (علیہما السلام) پر پوری فرمائی تھی۔ بے شک آپ کا پروردگار جاننے والا حکمت والا ہے ﴿۶﴾

تفسیر و معارف

سورۂ یوسف شروع ہوتی ہے۔ یہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ اس میں اللہ کریم نے حضرت یوسفؑ کا پورا واقعہ ارشاد فرما دیا۔ باقی انبیاءؑ کے اور گزشتہ اُمتوں کے واقعات اور جو قصے بیان ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس طرح تسلسل کے ساتھ بیان نہیں ہوا۔ لوگوں کی نصیحت کے لیے جتنا اور جہاں بتانا ضروری سمجھا اتنا وہاں بتا دیا گیا۔

چونکہ یہودی علماء اہل مکہ کو مختلف سوال سکھا کر بھیجتے تھے تو ان کے سوالوں میں سے ایک سوال حضرت یوسفؑ کے بارے میں بھی تھا۔ مکہ مکرمہ میں یہود کا بھی کوئی بڑا عالم نہیں تھا۔ ان کے عالم بھی یثرب میں تھے تو اہل مکہ کو دراصل یثرب کے یہود طرح طرح کے سوال بتاتے رہتے تھے۔

یثرب:

یثرب کی بنیاد برسوں پہلے ایک بادشاہ نے رکھی تھی۔ اس نے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا، شہر فتح کر لیا۔ اہل شہر کو غلام بنا لیا، طواف کعبہ بند کروا دیا تو اسے ایک نہایت تکلیف دہ مرض لاحق ہو گیا کہ اس کے منہ اور ناک سے ایسا بدبودار پانی آتا رہتا تھا کہ تعفن کی وجہ سے کوئی اس کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے علماء اور اطباء بھی تھے۔ طبیب علاج کر کے ہار گئے تو علماء نے بادشاہ سے کہا کہ یہ بیماری نہیں اللہ کی گرفت ہے۔ یہ شہر مقدس ہے۔ اس میں اللہ کا گھر ہے۔ اس شہر کے رہنے والوں کو اللہ نے اپنی امان میں رکھا ہوا ہے۔ اس شہر میں اللہ کے عظیم المرتبت نبی (ﷺ) پیدا ہوں گے جو ہمیشہ کے لیے ساری انسانیت کے لیے اللہ کے نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں گے اور یہاں سے ہجرت فرما کر یثرب جائیں گے۔ اس وقت یثرب ایک اجاڑ ویرانہ تھا جہاں جھاڑیاں تھیں اور وہاں ایک خاص مکھی پائی جاتی تھی جس کے کاٹنے سے بخار ہو جاتا تھا۔ تب اسے یثرب کہتے تھے۔ یثرب کے لغوی معنی تکلیف دہ کے ہیں۔ اسی لیے اس علاقے کو یثرب کہتے تھے کہ کوئی بھی وہاں سے گزرتا وہ بیمار ہو جاتا تھا۔ بادشاہ کے ہمراہ جو علماء

تھے انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مکہ سے ہجرت کر کے یثرب آ بسیں گے تو یہ شہر دنیا کے لیے شفا کا سبب بن جائے گا۔ اس نے توبہ کی۔ تائب ہو کر اس نے تمام اہل شہر کو نہ صرف آزاد کیا بلکہ چھ ماہ تک شاہی لنگر سے ان کی تواضع کی۔ اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ اس شہر کے سارے شہری چھ ماہ تک شاہی لنگر سے کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد وہ یثرب کی طرف متوجہ ہوا۔ سارے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کروایا۔ وہاں اپنے کچھ علماء آباد کیے ان میں سے ایک بہت بڑے عالم کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ایک خط لکھ کر دیا اور اس سے کہا تم یہیں آباد رہو۔ اگر تمہاری زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں تو میرا خط پیش کر دینا۔ اگر تمہارے بعد تشریف لائیں تو یہ خط تمہاری نسل میں رہے گا جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو میرا خط ان کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ تاریخ مکہ میں یہ واقعہ تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔ وہاں اس کے کچھ اشعار بھی نقل ہوئے ہیں۔

ولوا مدّعمری الی عمرہ لکنت وزیر الہ ابن عمر

ترجمہ: اگر میری عمر نے میرا ساتھ دیا تو میں ان کا خادم اور جاں نثار بن کر رہوں گا۔ یہ خط حضرت ابوایوب انصاریؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہر مسلمان یہ چاہتا تھا اور ہر مسلمان کا اصرار تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے غریب خانے پر رونق افروز ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری سواری کی اونٹنی قصویٰ کو چھوڑ دو یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس نے کہاں جا ٹھہرنا ہے۔ جہاں اللہ کا حکم ہے یہ وہاں پہنچ جائے گی تو قصویٰ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر کے صحن میں جا کر بیٹھ گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں قیام فرمایا۔ اس دوران انہوں نے بادشاہ کا وہ خط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت تک یہ شہر یثرب کہلاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی ہو گیا یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر لہٰذا اب اسے یثرب کہنا ناجائز ہے کہ یثرب تکلیف دہ چیز کا نام ہے۔

مشرکین مکہ کے سوال:

اسی قدیم زمانے سے ان علماء کی نسل سے یہود کے عالم یثرب میں موجود تھے۔ اہل مکہ کو جب کوئی بات نہ سوجھتی تو ان کے پاس جاتے۔ وہ انہیں مشکل سوال بتاتے اور وہ مکہ آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے کہ اگر آپ اللہ کے سچے رسول ہیں تو ان سوالوں کے جواب دیں۔ جیسے انہوں نے سوال کیا تھا وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ تو قرآن حکیم میں آتا ہے کہ اللہ کریم نے حضور اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جواب دلوایا۔ فرمایا، قُلِ

الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (بنی اسرائیل:85)

اسی طرح کے سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کا مسکن تو شام تھا یہ مصر کیسے پہنچ گئے اور یوسفؑ کا قصہ کیا ہے؟ یہودی علماء جانتے تھے کہ تورات میں اس کا بیان تو تھا لیکن نہ اتنی تفصیلات تھیں نہ اس کے سارے پہلوؤں کا احاطہ تھا۔ چونکہ وہ خود بھی ان تفصیلات سے آگاہ نہیں تھے اس لیے انہوں نے یہ سوال بھیجا۔ اللہ کریم نے وہ پورا واقعہ یکجا بذریعہ وحی بتا دیا۔ اس لیے یہ پورا واقعہ یکجا ہے اور تسلسل سے بیان ہوا ہے۔ اس میں ایک سو گیارہ (111) آیات اور بارہ (12) رکوع ہیں۔

الٓرٰ یہ حروف مقطعات نہیں ہے۔ ان کے پڑھنے پر ثواب نصیب ہوتا ہے اور کیفیات بھی نصیب ہوتی ہیں۔ البتہ ان کا مفہوم اللہ کریم جانتے ہیں۔ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہے یا وہ مقربین بارگاہ ہستیاں اپنے اپنے مرتبہ و مقام کے مطابق جانتی ہیں جنہیں قرآن حکیم نے راسخین فی العلم فرمایا ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ کریم نے ظاہری اور باطنی علوم سے حصہ وافر عطا فرمایا ہے۔ ان میں سے جس کو اللہ بتا دے تو اس کی مرضی۔

یہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ آتا ہو تو نور علیٰ نور ہے اور نہ بھی آتا ہو تو تلاوتِ قرآن اپنا فائدہ دیتی ہے۔ پڑھنے والا مستفید ہوتا ہے۔ اسے کیفیات نصیب ہوتی ہیں۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ فرمایا یہ واضح اور روشن کتاب کی آیات ہیں جو حق پر دلالت کرتی ہیں۔ حق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ پڑھنے والے کو حق کی طرف لے کر جاتی ہیں۔ ان میں کمال یہ ہے کہ یہ ذات باری کی طرف سے ارشاد ہوئی ہیں۔ یہ اللہ کریم کا ذاتی کلام ہے۔

ہر کلام میں متکلم کی ذات کا پرتو ہوتا ہے۔ کسی نیک آدمی کی باتیں سنیں تو اس کی ذات کا پرتو سننے والے کے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ بدکاروں کی باتیں سنتے رہیں اور کوئی گناہ نہ کریں تو دل کو سخت کرنے کے لیے وہی کافی ہوتا ہے۔ کلام کے اثرات دل کو سخت کر کے برائی کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ اگر انسان کی ذات کا اتنا اثر اس کی بات میں آ جاتا ہے تو ذاتِ باری رب العالمین، اس کی عظمت، اس کا پرتو جمال کتنا مضبوط اور کتنا پُر اثر ہوگا!

فرمایا، یہ عام حکایات نہیں۔ یہ محض باتیں، قصے کہانیاں نہیں۔ انہیں اس نظر سے دیکھو کہ یہ کتاب الٰہی کی روشن، واضح اور مدلل آیات ہیں جو حق کی نقیب ہیں۔ پھر اپنا احسان یاد دلایا اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾ کہ ہم نے قرآن کو عربی میں نازل فرمایا اہل عرب کو اپنی زبان دانی پر بہت ناز تھا اور وہ واقعی بہت پائے کے زبان دان تھے۔ اسی وجہ سے عرب کے علاوہ باقی ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ گونگا بھی اپنی بات اشارے سے سمجھا دیتا ہے۔ اہل عرب اپنے سوا باقی سب کو عجمی کہتے تھے یعنی وہ جو زبان سے اپنا مافی الضمیر نہ کہہ

سکے۔ اہل عرب کی خصوصیات میں سے ہے کہ ان کا حافظہ بہت تیز تھا۔ یہ بھی ان کا کمال ہے کہ ان میں بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن فصاحت وبلاغت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بات سنتے تو اس کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ بات کہتے تو حقائق سے بھرپور ہوتی۔ اور زبان دانی معاشرے کے ہر طبقے کی میراث تھی۔ ان کے غلام اور لونڈیاں بھی بات کرتیں تو بہت پائے کے شعر کہہ جاتیں۔

امام شافعیؒ سے ملاقات کے لیے کوئی شخص آیا اس کا نام عبداللہ تھا۔ امام صاحب اس وقت آرام فرمارہے تھے۔ کنیز نے بتادیا کہ آرام فرمارہے ہیں۔ اس شخص نے کہا جب اٹھیں گے تو حضرت کو میرا سلام عرض کرنا اور بتانا کہ عبداللہ حاضر ہوا تھا۔ اس شخص کی ایک آنکھ میں سفیدی تھی۔ جب آپؒ اٹھے تو اس کنیز نے عرض کیا جاۓ غبداللہ (غبداللہ آیا تھا) آپؒ نے حیران ہو کر پوچھا نام تو عبداللہ ہوتا ہے، غبداللہ نہیں تو کہنے لگی فی عینہٖ نقطۃٌ اس کی آنکھ (عین) میں نقطہ تھا۔ اس قوم کے اَن پڑھ بھی اتنے باذوق زبان دان تھے۔ ان کی کنیزوں اور غلاموں کا بھی زبان دانی اور زبان فہمی میں یہ معیار تھا۔

عربی زبان کی فضیلت:

دنیا میں جتنی زبانیں رائج تھیں یا ہیں سوائے عربی کے کسی زبان میں نہ کوئی تقدس ہے نہ کراہت۔ محض مافی الضمیر کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ دنیا بھر میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقے کی اپنی اپنی بولیاں ہیں۔ صرف ہندوستان میں ہی کم وبیش ایک سو بیس زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن کسی زبان میں تقدس نہیں سوائے عربی کے۔

عربی زبان کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے چن لیا۔ اس میں اپنا کلام القرآن الحکیم نازل فرمایا۔ میدانِ حشر کی زبان عربی ہے۔ اہل جنت آپس میں عربی میں بات کریں گے۔ اگر کسی زبان کو اللہ نے تقدس، پاکیزگی، پسندیدگی اور ثواب سے نوازا تو عربی ہے۔

باقی ساری زبانیں صرف مافی الضمیر بیان کرنے کا ذریعہ ہیں اور باقی تمام زبانوں کی حیثیت مساوی ہے مختلف زبانیں جاننا اچھی بات ہے۔ جتنی زیادہ کوئی سیکھ لے اتنا ہی بہتر ہے کہ اتنے لوگوں تک ان کی مادری زبان میں اللہ کا پیغام پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اللہ کریم نے عربی کو وہ فضیلت بخشی کہ فرمایا، ہم نے قرآن کو عربی میں نازل فرمایا تاکہ تم بات کو سمجھ سکو۔ عربوں کی مادری زبان عربی تھی اور قرآن کے اوّلین مخاطب عرب تھے لہٰذا اہل عرب قرآن سن کر بات کو سمجھ جائیں۔ اہل عرب کو آج بھی یہ سہولت حاصل ہے۔ تلاوت کرتے ہیں تو اس کے معنی سے آشنا ہو کر کرتے ہیں۔ سنتے ہیں تو مفاہیم سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ صلوٰۃ میں قیام ہو یا رکوع ہر لفظ جو ادا کرتے ہیں اس سے لطف لیتے

ہیں۔ انہیں لفظ، لفظ ارشادِ باری سمجھ آ رہا ہوتا ہے۔

احسن القصص کا حُسن:

فرمایا، نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ ہم آپ کو بہت خوبصورت اور بہترین قصہ سناتے ہیں یہ قرآن ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بذریعہ وحی بھیجا ہے۔ اس قصے میں حسن بھی ہے، خوبصورتی بھی اور یہ قصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل بھی ہے کہ نزولِ وحی سے پہلے تو آپ اس واقعے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ یہ جو سوال کرنے والے ہیں ان کے پاس تو اس قصے کے چند اشارات موجود تھے جو یہ تورات میں پڑھ لیتے لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو نہ تورات پڑھی نہ کسی قصہ گو کی بات سنی۔ نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاریخ پڑھی نہ کسی انسان سے اس بارے میں کچھ سنا تو آپ اس سے پہلے اس سے واقف نہ تھے۔ ہم نے یہ بہترین قصہ پوری تفصیل کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمایا۔ اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

مفسرین کرام نے اس پر بڑی خوبصورت بحث فرمائی ہے کہ یہ احسن القصص ہے۔ بہت خوبصورت واقعہ ہے۔ جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ اللہ کے دو نبیوں، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کو کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ حضرت یعقوبؑ سے بیٹا بچھڑ گیا۔ آپؑ نے برسوں انؑ کی جدائی کا غم اٹھایا۔ دکھ سے رو، رو کر انؑ کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ بینائی جاتی رہی۔ یوسفؑ کو بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا۔ جنہوں نے نکالا انہوں نے غلام بنا کر بازاروں میں بیچ دیا۔ خریدے گئے، محل میں پالے گئے لیکن الزام لگا اور جیل بھیج دیئے گئے۔ عرصہ تک قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور اللہ کریم فرما رہے ہیں کہ خوبصورت اور احسن القصص ہے۔ اس میں حسن کیا ہے؟

اللہ کا کلام یہ بتاتا ہے کہ اس کا حسن اس واقعے کے انجام اور آپ کے اس تعلق باللہ میں ہے جس میں مسلسل صعوبتیں اٹھانے کے باوجود اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اللہ کا کلام اسے احسن کہتا ہے جس کا انجام اور نتیجہ اچھا ہو۔ یہ نہ دیکھیں کہ کیا واقعہ گزرا، کیا حالات پیش آئے۔ یہ دیکھیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یعقوبؑ کا ذکر ہو رہا ہے کہ جب یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں پھینک دیا اور آپؑ بے حد غمگین ہوئے تو کیا اتنے برسوں میں آپؑ نے کسی انسان کو اپنے دکھ سنائے؟ آپؑ نے کیا فرمایا، قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ میں اپنے دکھ اپنے اللہ سے بیان کرتا ہوں، کسی انسان کو تو نہیں سناتا۔ دوسری طرف یوسفؑ کنوئیں میں رہے، بازار میں بکے یا جیل میں گئے ہر حال میں آپ کا کلی تعلق اللہ کریم سے ہی رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے دکھ آتے گئے تعلق باللہ بڑھتا

گیا، اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس اعتبار سے فرمایا یہ قصہ احسن القصص ہے۔ قرآن حکیم واقعات کو ان کے نتیجے کے اعتبار سے حسین اور خوبصورت کہتا ہے۔ جس مشکل کے نتیجے میں وصالِ الٰہی نصیب ہو وہ تو بہت خوبصورت بات ہے۔

پس منظر:

یعقوبؑ کی دو بیویوں سے بارہ بیٹے تھے۔ دس بیٹے پہلی بیوی میں سے تھے۔ جب پہلی بیوی کا وصال ہو گیا تو آپؑ نے انہی کی بہن سے شادی کر لی جس سے حضرت یوسفؑ اور بن یامین پیدا ہوئے۔ بن یامین کی ولادت پر ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ پہلی بیوی سے جو بیٹے تھے وہ یوسفؑ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ جوان اور بالغ تھے۔ یوسفؑ کم عمر تھے اور بن یامین آپؑ سے بھی چھوٹے تھے۔ یعقوبؑ ان دونوں بھائیوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ایک وہ کم عمر تھے، بچپن میں والدہ کا سایۂ شفقت اٹھ گیا تھا اس لیے شفقت پدری ان پر زیادہ تھی۔ یوسفؑ بے حد خوب صورت تھے۔ معراج شریف کی احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشادِ پاک کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدھا حسن یوسفؑ کو دیا ہے اور باقی آدھا ساری مخلوق میں تقسیم فرمایا ہے۔ یعقوبؑ کے حضرت یوسفؑ پر التفات کی دوسری وجہ یہ تھی کہ آپؑ کی پیشانی میں نورِ نبوت تھا۔ آپؑ کے بارے نبی اکرم ﷺ کے ارشادِ مبارک کا مفہوم ہے۔ آپؑ کریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم ہیں کہ یوسفؑ کے ہاں چار پشت نبوت ہے۔ حضرت یوسفؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت ابراہیمؑ چاروں اللہ کے نبی علیہ السلام ہیں۔ حضرت ابراہیم خود نبیؑ آپؑ کے بیٹے اسحٰق اللہ کے نبی۔ ان کے بیٹے یعقوب اللہ کے نبیؑ۔ ان کے بیٹے یوسف اللہ کے نبیؑ۔

غیر انبیاء میں صحابیت اعلیٰ ترین مقام ہے اور یہ فضیلت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہے کہ آپؓ کے والد صحابیؓ، خود صحابیؓ، بیٹے صحابیؓ، پوتے صحابیؓ۔ چار پشت میں شرف صحابیت اکیلے ابوبکر صدیقؓ کو نصیب ہے۔

حضرت یوسفؑ کم عمر ہی تھے کہ آپؑ نے خواب دیکھا اور والد محترم حضرت یعقوبؑ سے اس کا ذکر کیا۔ ارشاد باری ہے اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِاَبِيهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ ۝ فرمایا جب یوسفؑ نے اپنے والد کو اپنا خواب سنایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج و چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

یاد رہے نبی تخلیقی طور پر نبیؑ ہوتے ہیں۔ بعثت سے پہلے بھی نبیؑ ہوتے ہیں۔ نبیؑ کی روح تخلیقی طور پر اتنی قوی اور مضبوط ہوتی ہے کہ خواب میں بھی نبیؑ کو نہ دیکھنے میں غلطی لگتی ہے نہ سمجھنے میں۔ بعثت کے بعد نبیؑ کا خواب وحی الٰہی ہوتا ہے۔ جیسے ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں تو یہ وحی الٰہی تھی۔ آپؑ نے جب بیٹے اسمٰعیلؑ کو یہ حکم سنایا تو ننھے اسمٰعیلؑ بھی چونکہ نبیؑ تھے تو آپؑ نے بلا تامل عرض کی قال یابت افعل ما تؤمر (الصفت: 102) والد

محترم! آپؑ وہ کر گزریے جس کے کرنے کا آپؑ کو حکم دیا گیا ہے۔ اسمٰعیلؑ کا بچپن تھا پھر بھی انہیں معلوم تھا کہ نبیؑ کا خواب وحی الٰہی ہے اور میرے والد کو حکم دیا جا رہا ہے تو آپؑ نے فرمایا، آپؑ کو ڈر ہے کہ میں بچہ ہوں لیکن سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (الصّٰفّٰت :102) آپ مجھے ان شاءاللہ صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

خواب اور ان کی اقسام:

جب آدمی سو جاتا ہے تو اس کا بدن کام نہیں کرتا بلکہ آرام کرتا ہے۔ جو ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہوتی ہے اس کی از خود مرمت کرتا ہے۔ جتنی دیر آدمی ہوتا ہے روح بدن کے انتظام و انصرام سے فارغ ہوتی ہے تو اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے جو عالم امر ہے۔ عالم بالا میں ایک عالم مثال ہے۔ اسے عالم مثال اس لیے کہتے ہیں کہ جو کچھ دنیا میں ہو چکا ہے جو ہو رہا ہے اور جو ہو گا اس کی مثالی صورتیں وہاں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ خواب کی پہلی قسم یہ ہے کہ بعض ارواح جو مضبوط ہوتی ہیں، ایمان دار ہوتی ہیں ان میں اتنی روحانی قوت ہوتی ہے کہ وہ عالمِ امثال میں سے کچھ دیکھ لیتی ہیں۔ بعض اوقات گزشتہ واقعات کی، حالیہ واقعات کی یا آئندہ ہونے والے واقعات کی کوئی صورت ان کے سامنے آجاتی ہے۔ جب آدمی جاگتا ہے تو وہ صورت اس کے ذہن میں موجود ہوتی ہے لیکن یاد رکھیں ہر خواب تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔ عالمِ امثال سے جو دکھائی دیتا ہے وہ اشاراتی زبان ہے۔ اس اشارے کی تعبیر ایک الگ علم ہے جو انبیاءؑ کو عطا کیا گیا۔ ابراہیمؑ کے پاس یہ علم تھا، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے پاس بھی تھا۔

خواب کی دوسری قسم یہ ہے کہ جب روح جسمانی ضروریات سے فارغ ہوتی ہے تو اپنا انسانی نفس دیکھتی ہے۔ اس میں دن بھر کی مشغولیات ریکارڈ ہوتی رہتی ہیں۔ جو کچھ ہم سوچتے ہیں، کرتے ہیں، دیکھتے ہیں وہ مختلف صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

خواب کی تیسری قسم وہ ہے جس میں شیطان مختلف صورتیں متشکل کر کے دکھا دیتا ہے ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان صورتوں میں سے کون سی صورت شیطان نے دکھا دی، کس کو نفس نے دکھایا اور کون سی عالم امثال سے ہے۔ چونکہ یہ ضروری نہیں کہ تینوں الگ الگ نظر آئیں۔ یہ گڈمڈ بھی ہو جاتے ہیں۔ کوئی شے عالم امثال کی نظر آ رہی تھی اس میں کب نفس نے کچھ داخل کر دیا یا شیطان نے اپنی بات داخل کر دی لہٰذا خواب کی تعبیر ایک باقاعدہ علم ہے۔ علم تعبیر یوسفؑ کو بھی عطا ہوا اور ان حضرات کی تعبیروں کو لے کر علامہ ابن سیرینؒ نے بے شمار تعبیرات لکھیں۔ اللہ کریم نے انہیں وسیع علم عطا کیا تھا۔ ان کی بہت سی تعبیرات درست ثابت ہوئیں لیکن یہ قطعی نہیں ہوتا۔ سوائے انبیاءؑ کے کسی کی تعبیر حتمی، یقینی اور قطعی نہیں ہوتی۔

خواب کے بارے شریعت کا حکم:

خواب کے بارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین شرعی قاعدہ عطا فرمایا ہے کہ کوئی اگر اچھا خواب دیکھے تو آنکھ کھلنے پر کہے الحمدللہ۔ اچھا خواب اگر بیان کرے گا تو ممکن ہے کوئی حاسد پیدا ہو جائے ممکن ہے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے لہٰذا الحمدللہ کہہ کر بھول جائے۔ اگر برا یا ڈراؤنا خواب ہو تو لاحول پڑھ کر بائیں طرف تھوک دے اور بھول جائے اگر اسے بیان کیا جائے گا اور لوگ سنیں گے تو شاید اس کا عجیب اثر بھی ہو جائے۔ حق یہی ہے کہ خوابوں کو شرعی حیثیت میں رکھ کر خود کو عملی اور حقیقی زندگی پر کار بند کیا جائے۔ خوابوں کی دنیا کے حقائق کام نہیں آتے۔

اللہ کے بندو! ان حقائق پر یقین رکھو کہ حساب کتاب ہوگا۔ دنیا کی عملی زندگی کے اثرات اخروی زندگی میں دیکھنے ہوں گے۔ اصلی زندگی پر نتائج مرتب ہوں گے اس لیے اپنے آپ کو اخروی زندگی کی بہتری کے لیے مصروف رکھو۔ خوابوں کو لکھنا، پڑھنا اور بیان کرنا چھوڑ دو۔ خواب، خواب ہے سوائے نبیؑ کے کہ نبی کا خواب بھی وحی الٰہی ہوتا ہے۔

یوسفؑ نے جب والدِ گرامی یعقوبؑ سے عرض کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے تو آپؑ نے تعبیر بعد میں بتائی پہلے یہ نصیحت کی قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ میرے بیٹے! تمہارے بھائیوں کو اس کی بھنک نہ ہو ایسا کرو گویا تم نے دیکھا ہی نہیں۔ تم اپنے بھائیوں کے سامنے یہ خواب بیان نہ کرنا ممکن ہے وہ تمہارے خلاف ہو جائیں۔ حسد میں مبتلا ہو کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔

یہاں سے ثابت ہوا کہ اچھا خواب بیان کیا جائے تو حاسد پیدا کرے گا۔ برا ہوگا تو لوگ مذاق اڑائیں گے اور پھر خواب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب بیان کر دیا جائے تو ممکن ہے من جانب اللہ ایسا ہی واقع ہو جائے۔

یعقوبؑ نے بھی تعبیر دینے سے پہلے تاکید فرمائی کہ اپنے بھائیوں کو نہ بتانا ممکن ہے وہ تمہارے خلاف کوئی حیلہ سازی کریں۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ یقیناً شیطان تو انسان کا واضح دشمن ہے اسے تھوڑا سا موقع ملے تو وہ بات کو بڑھا دیتا ہے۔

ضمنی بات:

علمائے حق فرماتے ہیں کہ اللہ کریم سے کوئی نعمت ملے تو اسے اس کا اشتہار نہیں دینا چاہیے۔ اللہ کا شکر بجا لانا چاہیے۔ اسے اپنی بڑائی کا سبب بنا کر بندے، بندے کے سامنے ڈینگیں نہیں مارنی چاہیں۔ بالخصوص صوفی کو کوئی اعلیٰ منزل ملے کوئی رتبہ، کوئی نعمت نصیب ہو تو ہر ایک کے سامنے اظہار نہ کرے۔

ذکر کرنے سے اکثر لوگوں کو مشاہدات نصیب ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ اعلیٰ منازل نصیب ہوں تو ہی مشاہدات عطا ہوں۔ عام لوگوں میں سے کسی کو بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر انہیں جو چند چیزیں نظر آ جاتی ہیں اس کا اشتہار بنا لیتے ہیں، لوگوں کو بتاتے پھرتے ہیں لوگ انہیں مقدس بنا لیتے ہیں اور ان سے پوچھ پوچھ کر کام کرتے ہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ شریعت محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام مکمل اور واضح ہے۔ اگر کہیں سمجھ نہیں آتی تو کسی عالم سے پوچھیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے۔ اسی طرح سے حکم الٰہی پر عمل کریں۔ کشف والے کو کیا پتہ کہ لوگوں نے کیا کرنا ہے۔ اور کسی کا کشف کسی دوسرے کے لیے نہیں ہے۔ صرف نبیؑ ہی وہ ہستی ہیں کہ ان کا کشف پوری امت کے لیے حجت ہوتا ہے۔ ساری امت اس پر عمل کرنے کی مکلف ہوتی ہے۔ غیر؟؟ کتنے ہی بڑے رتبے کا ہو اس کے کشف کا کوئی دوسرا مکلف نہیں ہوتا۔ یہ اس کے اپنے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں۔ نبیؑ کا کشف ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ ولی کا کشف اس بات کا محتاج ہے کہ وہ نبیؑ کی بتائی ہوئی شریعت کی حدود کے اندر ہو تو درست ہے۔ اگر حدود سے ٹکراتا ہے تو ولی کو غلطی لگ رہی ہے۔ صوفی کو اس طرح احتیاط کرنا چاہیے۔ شریعت کا خیال رکھے اور اللہ کی نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا رہے۔

فرمایا، وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ حضرت یعقوب نے اپنے بیٹے یوسفؑ کو نصیحت کرنے کے بعد تعبیر خواب بتائی اور فرمایا، آپ کا پروردگار آپ کو چن لے گا، برگزیدہ کرے گا۔ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ بہت بڑے رتبے سے نوازے گا۔ دین کے اعتبار سے سب سے بڑا رتبہ نبوت ہے اور دنیا کے اعتبار سے حکومت و سلطنت ہے۔ اللہ کریم آپ کو نبوت بھی عطا کرے گا اور ریاست و سلطنت بھی نصیب فرمائے گا۔ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ جس طرح اللہ نے اپنی نعمتیں آپؑ کے آباء واجداد پر کامل فرمائی تھیں یعنی ابراہیمؑ واسحاقؑ پر۔ اسی طرح آپؑ پر بھی دینی اور دنیاوی اعتبار سے بہت انعام فرمائے گا۔ آپؑ آل یعقوبؑ کے لیے بھی سرمایہ افتخار ہوں گے۔

اللہ کریم حضرت یوسفؑ کو دینی و دنیوی کمالات کی بشارتیں سنا رہے ہیں اور یعقوبؑ اپنے بیٹے کو نصیحت و تاکید فرما رہے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح آپؑ کے بھائیوں کو اس مبارک خواب کی بھنک پڑ گئی۔ انہیں کہیں سے پتہ چل ہی گیا تو انہوں نے یوسفؑ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا ارادہ کر لیا اور ان کے قتل کی سازش کی۔ انہیں کنوئیں میں ڈال دیا، غلام بن کر بک گئے۔

اس سارے واقعے میں بظاہر تو تمام حالات و واقعات آل یعقوب کے لیے سخت تر ہوتے گئے تو اللہ کریم کے یہ فرمانے سے کیا مراد ہے کہ اللہ آل یعقوب کو اپنی نعمتوں سے نوازے گا۔ یعقوبؑ کے دس بیٹوں نے اللہ کے دو نبیوںؑ کو ایذا پہنچائی۔ والدِ بزرگوار کے نبیؑ بھی تھے وہ برسوں روتے رہے۔ یوسفؑ بھی اللہ کے نبیؑ تھے انہیں ایذا

پہنچائی لیکن یعقوبؑ خواب کی تعبیر ارشاد فرماتے ہوئے بشارت دے رہے ہیں کہ آلِ یعقوبؑ کے لیے باعثِ برکت ہوگا۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ یعقوبؑ یہ بشارتیں باعتبار انجام کے دے رہے ہیں۔ جیسا کہ اس قصے کا انجام یہ ہوا کہ وہ سارے بھائی تائب ہوئے۔ یعقوبؑ سے معافی مانگی۔ آپؑ نے انہیں معاف فرمادیا۔ ان سب کو دو نبیوں ؑ کی صحبت نصیب ہوئی۔ دو انبیاء کے صحابیؓ بنے۔ نتیجے کے اعتبار سے انہوں نے امتیوں میں سب سے اونچا رتبہ صحابیت فرمایا۔ اوران کے لیے بھی آپؑ کا خواب بہت مبارک ثابت ہوا۔

فرمایا، اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦﴾ بے شک آپ کا پروردگار جاننے والا بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ وہی جانتا ہے۔ وہ ہر چیز کو ہر وقت جانتا ہے اس پر کیا نتیجہ مرتب فرماتا ہے یہ اس کے دستِ قدرت میں ہے۔ دیکھنے والے کو کچھ اور نظر آتا ہے، بندہ کچھ اور سوچتا ہے، کرنے والا مالک وہ ہے جو اس کا کوئی اور نتیجہ کر دیتا ہے۔ نتائج اس کے دستِ قدرت میں ہیں وہ علم رکھنے والا، حکمت والا، دانا تر ہے۔ اپنے کاموں کو خود ہی سمجھتا ہے۔ انسان کی تو جب عقل کام نہیں کرتی یا اس کے احاطہ علم میں نہیں آتی تو کہہ دیتا ہے یہ حادثہ ہے۔ حالانکہ دنیا میں حادثات اور اتفاقات نہیں ہوتے۔ یہ سب اللہ کریم کے پروگرام کا حصہ ہوتے ہیں۔ سب کام اس کے پروگرام کے مطابق ہوتے ہیں۔ جیسا وہ چاہتا ہے ویسا ہوتا ہے۔ کوئی وفات پا جائے تو لوگ کہتے ہیں ''اسے بے وقت موت نے آلیا''۔ کیا کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ کہ انہوں نے اس کا وقت مقرر کرنا تھا اور اللہ کریم بھول گئے اور اسے بے وقت مار دیا۔

فرمایا جا رہا ہے اللہ کریم جاننے والے اور حکمت والے ہیں۔ انسانوں کے دنیا میں آنے سے پہلے یہ فیصلے ہو چکے ہیں۔ رزق کا فیصلہ، زندگی موت کا فیصلہ، قد کاٹھ استعداد کا فیصلہ وغیرہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ جس کے حصے میں جو چیز آنی ہے اس کا فیصلہ ہو چکا اور سیاہی خشک ہو چکی۔ موت وحیات ہر شئے تقسیم ہو چکی لہٰذا ہر پیدا ہونے والے کے مرنے کا یقین بھی ہونا چاہیے کہ جب زندہ ہے تو موت بھی آئے گی۔ کسی بزرگ کے بھائی فوت ہوگئے۔ لوگ تعزیت کے لیے آئے۔ جیسا کہ لوگوں کی عادت ہوتی ہے سوال کرتے رہے کہ انہیں کیا تکلیف تھی، کس حکیم سے علاج کروایا؟ بندہ فوت ہو کر دفن ہو گیا تو لوگ اس کی بیماری کی تحقیق کر کے کیا کریں گے۔ لیکن کسی نے سوال داغ دیا کہ ان کی موت کی وجہ کیا بنی؟ تو بزرگ نے فرمایا ''اس کی زندگی''۔ اس کی زندگی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ زندگی سے بڑا موت کا اور سبب کیا ہوگا!

فرمایا، اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ اس کے فیصلے پُرحکمت ہیں۔

سورۃ یوسف رکوع 2 آیات 7 تا 20

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴿۷﴾ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ
اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ﴿۸﴾ ۚۖ اقْتُلُوْا
يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ
قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ
الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَالَكَ لَا
تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ
وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ
الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ
اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ
وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓ
اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ
عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾
وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ
فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ
فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ

بِضَاعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ⑲ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ⑳

بے شک یوسف (علیہ السلام) اوران کے بھائیوں کے قصے میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۷﴾ جب انہوں نے (آپس میں) بات کی کہ یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔ اور حالانکہ ہم ایک جماعت ہیں بے شک ہمارے والد صریح غلطی پر ہیں ﴿۸﴾ یوسف (علیہ السلام) کو قتل کردو یا کہیں دور دراز پھینک آؤ پھر والد کی توجہ صرف تمہاری طرف ہوجائے گی اوراس کے بعد تم بہتر حالت میں ہوجاؤ گے ﴿۹﴾ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف (علیہ السلام) کو قتل نہ کرواوران کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دو کہ کوئی راہگیر ان کو نکال کر (دوسرے ملک) لے جائے اگرتم کو کرنا ہی ہے تو ﴿۱۰﴾ کہنے لگے اے ہمارے ابا جان! کیا وجہ ہے کہ یوسف (علیہ السلام) کے بارے آپ ہمارا اعتبار نہیں کرتے اور بے شک ہم ان کے خیر خواہ ہیں۔ ﴿۱۱﴾ کل ان کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے کہ خوب کھائیں اور کھیلیں اور یقیناً ہم ان کی پوری حفاظت کریں گے ﴿۱۲﴾ انہوں نے فرمایا کہ بے شک یہ بات مجھے دکھی کردیتی ہے کہ تم ان کو لے جاؤ اور مجھے اندیشہ یہ ہے کہ ان کو کوئی بھیڑیا کھا جائے اورتم ان سے بے خبر رہو ﴿۱۳﴾ کہنے لگے اگران کو بھیڑیا کھا جائے اور ہم جماعت (کی جماعت) موجود ہوں تو پھر یقیناً ہم بالکل ہی گئے گزرے ہوئے ﴿۱۴﴾ غرض جب ان کو لے گئے اوراتفاق کرلیا کہ ان کو گہرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ان کو ضرور یہ بات جتلائیں گے اور وہ پہچانیں گے بھی نہیں ﴿۱۵﴾ اور وہ رات کے وقت اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے ﴿۱۶﴾ کہنے لگے اے ہمارے ابا جان! ہم تو دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں لگ گئے یوسف (علیہ السلام) کو اپنے سامان کے

پاس چھوڑ دیا تو انہیں بھیڑیا کھا گیا اور آپ ہماری بات پر یقین نہ کریں گے اور خواہ ہم سچ ہی کہتے ہوں ﴿۱۷﴾ اور ان کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے۔ (یعقوب علیہ السلام نے) فرمایا بلکہ تم نے اپنی طرف سے ایک بات گھڑ لی ہے پس صبر ہی خوب ہے اور جو باتیں تم بتاتے ہو ان میں اللہ ہی مدد فرمائے ﴿۱۸﴾ اور (کنویں کے قریب) ایک قافلہ آوارد ہوا پس انہوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے لیے بھیجا تو اس نے (کنویں میں) اپنا ڈول ڈالا (یوسف علیہ السلام اس سے لٹک گئے) کہنے لگا بہت خوشی کی بات ہے یہ تو (بہت خوبصورت، اچھا) لڑکا (نکل آیا) ہے اور انہیں مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا ﴿۱۹﴾ اور اللہ کو ان کی کارگزاریاں معلوم تھیں۔ اور ان کو تھوڑی سی قیمت معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا اور انہیں ان (کے بارے) میں کوئی رغبت نہ تھی ﴿۲۰﴾

تفسیر و معارف

فرمایا، لَقَدۡ كَانَ فِيۡ يُوۡسُفَ وَاِخۡوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيۡنَ ۝ ارشاد ہوا کہ پوچھنے والوں نے تو آزمائش کے طور پر پوچھا لیکن پوچھنے والوں کے لیے اس میں عظمتِ الٰہی کی بے پناہ نشانیاں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبیء صادق و امین ہونے کے دلائل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کے دلائل، حالات و واقعات کے نتائج کس طرح مرتب ہوتے ہیں۔ نبیؑ پر جو وحی آتی ہے وہ برحق ہوتی ہے، کامل سچائی ہوتی ہے۔ وحی تو بڑی بات ہے میرے یہ برگزیدہ بندے خواب بھی دیکھتے ہیں تو اس میں بھی بڑی حکمتیں ہوتی ہیں۔ کامل سچائی ہوتی ہے۔ پھر خواب کی حقیقت کیا ہے، اقسام کیا ہیں، ان کے نتائج کیا ہوتے ہیں، اس کو کس طرح لینا چاہیے، پھر نشیب و فرازِ زمانہ، حالات و واقعاتِ دنیا کس طرح صادر ہوتے ہیں اور دنیا کے ساتھ دین کا توازن کیسے رکھا جاتا ہے؟

ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم کمزور ہوں، بھوکے پیاسے ہوں تو اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔ دو دن ہمیں کھانا مل جائے تو ہم صاحب بہادر بن جاتے ہیں اور ہمیں اللہ بھول جاتا ہے۔ دنیا مل جائے تو اسی میں گم ہو جاتے ہیں۔ تو دنیا کی حکومت و سلطنت بھی ہو، دین کا سب سے اعلیٰ منصب نبوت بھی ہو، اللہ کا نبیؑ ہو اور صاحب کتاب، صاحب وحی بھی ہو تو کس طرح سے امت کو چلائے۔ کس طرح سے کفار سے معاملہ کرے، کیا سلوک کرے، کس طرح سے مسلمانوں

کی تربیت کرے۔ کس طرح سے عدل وانصاف کرے۔ یہ سب کام اللہ کریم ایک ہستی نبی علیہ السلام کو سکھا دیتے ہیں۔ وہ ہستی ؑ دنیا اور آخرت کو جمع کر کے زندگی چلاتی ہے۔ فرمایا! وہ ساری بات بھی اس قصے میں موجود ہے۔ یوسف ؑ اور ان کے بھائیوں کے اس قصے میں تو جاننے والوں کے لیے بے پناہ دلائل اور عظمتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں۔

عموماً ہوتا یہ ہے کہ توازن برقرار رکھنے کی استعداد ہر بندے میں نہیں ہوتی۔ دین کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دنیاوی نقصانات ہونے لگتے ہیں اور دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دین چھوٹنے لگتا ہے۔ تو فرمایا! ان دونوں میں توازن کیسے رکھا جائے کہ دین میں سب سے بڑا منصب نبوت ہے اور یوسف ؑ کے پاس نبوت بھی آ گئی۔ دنیا کا سب سے بڑا منصب حکومت وسلطنت ہے وہ بھی عطا ہو گئی تو اب ریاست کی ساری آبادی تک انصاف پہنچانا، ہر ایک کے حقوق پہنچانا، ہر ایک کو اس کے فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرنا، ہر ایک سے اس کا کام لینا، یہ اتنا آسان کام تو نہیں ہے لیکن اللہ جنہیں نبوت عطا فرماتے ہیں یہ کام وہ کس طرح انجام دیتے کہ اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ فرمایا! یوسف ؑ اور ان کے بھائیوں کے قصے میں یہ امور موجود ہیں۔

جب بھائیوں کو ان کے خواب کی بھنک پڑی تو وہ کہنے لگے والد گرامی تو یوسف ؑ اور بن یامین کا پہلے ہی بڑا خیال رکھتے ہیں اب اس خواب کے بعد ان کی طرف مزید متوجہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ ہم دس بھائی ہیں اور ہم جوان ہیں تو والد صاحب کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ہماری زیادہ قدر دانی کرتے اور ہم پر زیادہ توجہ فرماتے۔ لیکن وہ یوسف ؑ جو معصوم بچے ہیں اور بن یامین جوان سے بھی چھوٹے ہیں، کو ہم سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا والد گرامی کو یوسف ؑ اور ان کے بھائی ہم سے زیادہ عزیز ہیں، وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ حالانکہ ہم ایک پوری جماعت ہیں دس بھائی کڑیل جوان ہیں اور گھر کا سارا کام ہم کرتے ہیں، سارا بوجھ ہم نے اٹھا رکھا ہے۔ حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے، راشن، پانی کی ذمہ داری ہماری ہے۔ دیکھ بھال ہم کرتے ہیں اور محبت ان سے فرمائی جارہی ہے۔ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۨ ۝ۚ۸ یقیناً ہمارے والد گرامی بہت غلطی کر رہے ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ایسی واضح غلطی کر رہے ہیں جس کا انہیں خود بھی پتہ ہوگا کہ غلط کر رہا ہوں۔ ہم سے زیادہ ان کی پروا کرتے ہیں، تو اب کیا کیا جائے، اس کا علاج کیا ہے؟ انہوں نے یہ جو خواب دیکھا ہے یہ اگر دنیا کی سلطنت بھی لے گئے، دین کی ریاست بھی لے گئے تو پھر تو ہمارا کچھ بھی نہ بنے گا، ہمیں تو کوئی پوچھے گا ہی نہیں۔ تو کیا کریں؟ سوچو! کچھ کرنا چاہیے۔

پھر مشورہ کرنے لگے، کہنے لگے اقْتُلُوْا يُوْسُفَ یوسف ؑ کو قتل کر دیتے ہیں۔ نہ یوسف ؑ ہوں گے اور نہ

یہ بات آگے بڑھے گی۔ یا پھر ایسا کرتے ہیں اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا دور کسی زمین میں انہیں پھینک دیں جہاں سے ان کی کوئی خبر بھی نہ آئے نہ پتہ چل سکے کہ کہاں گئے۔ یَّخۡلُ لَکُمۡ وَجۡہُ اَبِیۡکُمۡ تاکہ تمہارے باپ کا چہرہ تمہارے لیے خالی ہو جائے، یعنی ساری محبت تمہارے لیے رہ جائے۔ وَتَکُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ ﴿۹﴾ یہ سارا کچھ کر کے پھر توبہ کر لینا اور پھر اللہ اللہ کرنے لگ جانا، پھر نیک ہو جانا۔ خیر ہے ساری زندگی میں ایک گناہ کر لیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے، پھر توبہ کر لیں گے نیک ہو جائیں گے۔ صالحین میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ مشورے ہونے لگے کہ یا تو یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے، قصہ ہی پاک ہو جائے، کہیں جنگل میں پھینک آئیں۔ یا پھر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ کسی دور دراز زمین میں پھینک دیا جائے جہاں سے ان کی کوئی خبر نہ آئے اور وہ قصہ پارینہ بن جائیں اور ان کا ہم سے کوئی تعلق ہی نہ رہے۔ تو پھر یہ ہوگا کہ والد گرامی کے سامنے صرف تم ہو گے، تمہیں سے محبت کریں گے۔

صاحبِ تفسیر مظہری لکھتے ہیں کہ انہوں نے جرم تو کیا کہ قتل کا ارادہ کیا یا پھر انہیں دور پھینک دینے کا عزم کیا۔ ان کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی۔ اور صرف یوسفؑ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ یعقوبؑ کے ساتھ بھی بہت بڑی زیادتی تھی۔ کہ ان کے محبوب بیٹے کو بلا وجہ چھین لیا جائے اور اسے تکلیف پہنچائی جائے۔ لیکن فرماتے ہیں اس کی تہہ میں نبیؑ کی، یعنی یعقوبؑ کی محبت تھی۔ گو انہوں نے طریقہ غلط اختیار کیا لیکن وہ چاہتے تھے کہ والد گرامی کی محبت انہیں نصیب ہو، پوری توجہ انہیں ہی نصیب ہو۔ اس میں خلوص تھا۔ گویا جرم کا سبب جو بن رہی تھی وہ نبیؑ کی محبت تھی، یعقوبؑ کی محبت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یعقوبؑ ہمارے ساتھ مہربانی کریں، ہم پر پوری توجہ فرمائیں۔ صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ یہ جو نبیؑ کی محبت تھی یہ ان کی معافی اور توبہ کا سبب بن گئی۔ یعنی جو کچھ انہوں نے کیا وہ غلط تھا، وہ طریقہ کار غلط تھا۔ نبیؑ کی شریعت کے بھی خلاف تھا۔ حق و انصاف کے بھی خلاف تھا، لیکن کس لیے کیا؟ اس کا سبب نبیؑ کی محبت تھی، یعقوبؑ کی محبت تھی۔ اس محبت نے انہیں توبہ کی توفیق عطا کر دی۔ اور یعقوبؑ نے بھی معاف فرما دیا۔ حال یہ ہے کہ یوسفؑ نے بھی معاف فرما دیا۔ تو پھر جن کا حق ضائع ہوا تھا، جنہیں دکھ پہنچا تھا، دونوں اللہ کے نبیؑ ہیں، دونوں معاف فرما رہے ہیں تو پھر تیسرے کی گنجائش کہاں رہی۔ اور کسی کا تو اُن پر حق نہیں بنتا تھا۔ تو نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں معافی بھی مل گئی۔ توبہ بھی نصیب ہوگئی اور دو انبیاء کی محبت بھی نصیب ہوگئی اور دو انبیاء کے صحابی بن گئے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بظاہر آپ کوئی نیک کام بھی کرتے ہیں، لیکن ارادے میں نیکی نہیں ہے کسی کو

نقصان پہنچانے کے لیے، دکھاوے کے لیے نیک کام کرتے ہیں تو حقیقتاً اس کو نقصان ہو رہا ہوتا ہے۔ اس بظاہر نیکی کا ثواب نہیں ملتا، اس پر عذاب مرتب ہوتا ہے۔ بظاہر آپ سے غلطی ہوگئی لیکن ارادہ نیک تھا تو اللہ توبہ کا سبب پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جو قلب کے اندر خلوص ہوتا ہے جو نیت میں اخلاص ہوتا ہے وہ بندے کو پھر نیکی تک لے جاتا ہے، اور توبہ نصیب ہو جاتی ہے۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ، اُن میں سے ایک بھائی نے کہا کہ قتل کرنا تو بہت زیادتی ہے، ایک معصوم بچہ ہے، اتنا پیارا، پھر ہمارا بھائی ہے، ہمارے والد کا محبوب، والد گرامی زندہ موجود بیٹھے ہیں۔ سات سال کی عمر کا ایک چھوٹا ننھا بچہ ہے، پھر وہ ہمارا بھائی اور ہمارے والد کا بہت منظورِ نظر ہے، اسے قتل نہیں کرنا۔ قتل والا ارادہ چھوڑ دو۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بڑے بھائی کا نام یہود تھا، اس نے یہ رائے دی کہ میرے بھائیو! ایسا نہ سوچو، قتل کرنے نہ سوچو۔ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ. یوسفؑ کو ہرگز قتل نہ کرو۔ پھر کیا کریں؟ فرمایا وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ کسی ویران کنویں میں پھینک دو یا تو گرنے سے مرجائے گا یا نیچے دو دن یا تین دن پیاسا رہ کر مرجائے گا۔ یا ہوسکتا ہے ویران کنویں میں کوئی زہریلا سانپ وغیرہ اسے ڈس لے۔ تم قتل سے بچ جاؤ گے وہ اپنی موت مرجائے گا۔ تم اپنے ہاتھوں سے قتل نہ کرو کسی ویران کنویں میں ڈال دو۔

اللہ کریم کا اپنا نظام ہے، بھائی کیا سوچ رہے ہیں، قدرت اسے کیا دیکھنا چاہتی ہے۔ اللہ کریم اپنی قدرت کاملہ سے کیا نتائج پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ بظاہر بات تباہی کی طرف جا رہی ہے لیکن یہ سفر ہو رہا ہے تختِ مصر کی طرف۔ بظاہر بات موت تک، ایذا تک، تکلیف تک، بربادی تک جا رہی ہے لیکن حقیقتاً سلطنتِ مصر کی تخت نشینی کا سفر شروع ہو گیا ہے۔ بظاہر کیا دکھائی دیتا ہے، اسے کیا منظور ہوتا ہے، اس میں اپنی عقل کو نہیں لڑانا چاہیے۔ بلکہ خود کو دائرہ شریعت کے اندر رکھ کر اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اور اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ! میرے لیے بہتری فرما، دنیا اور آخرت کی بہتری عطا فرما۔ آسانیاں عطا فرما۔ وہ اپنے کاموں کو خوب سمجھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا! بھئی قتل نہ کرو وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ کسی اندھے کنویں میں پھینک دو۔ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰ اور ہوسکتا ہے کہ وہ مرنے سے بچ ہی جائیں کوئی راہ گزرتا ہوا قافلہ اسے اس میں سے نکال لے۔ تو اگر قافلے نے بھی نکال لیا تو کہیں دور دراز لے جائے گا یہاں تو پہنچنے سے رہا۔ قافلے والے اگر نکال بھی لیں تو یہاں تو

نیلامی نہیں کرنے بیٹھ جائیں گے بلکہ وہ تو کہیں دور لے جائیں گے کہ یہاں کا بندہ ہے یہاں سے دور لے جاؤ۔ تو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تم اسے نگاہوں سے اوجھل ہی کرنا چاہتے ہو، دور دراز پھینکنا چاہتے ہو۔ اور اگر کنویں میں مر گیا تو وہ اس کی طبعی موت ہوگی، ہم نے تو نہیں مارا ہوگا۔ انسان جب گناہ کے ارادے کرتا ہے تو اس طرح کے بہانے تراشتا ہے۔

اب طے ہو گیا کہ یوسفؑ کو ہم کسی اندھے کنویں میں پھینک دیں گے۔ گویا یہ اپنی دانست میں اس خواب کی تعبیر کا راستہ روک رہے ہیں کہ یہ کہیں بادشاہ نہ بن جائیں، پہلے ہی والد گرامی ان کو بہت چاہتے ہیں۔ پھر اگر ان کے پاس حکومت و سلطنت بھی آ گئی، نبوت بھی آ گئی تو ہم تو کسی شمار و قطار میں نہیں رہیں گے۔ لہٰذا انہیں ختم کر دیا جائے۔

اب یہ ان کا راستہ روکنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں اور قدرت الٰہی ان تدبیروں کو انہیں مصر پہنچانے کا سبب بنا رہی ہے۔

یہ سارا طے کر کے شام کو والد گرامی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَالَکَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَاِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوْنَ ⑪ وہ کہنے لگے ابا جی! آپؑ کو کیا ہو گیا ہے آپؑ یوسف کے معاملے میں تو ہم پر بالکل اعتبار نہیں کرتے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی، ہمارا چھوٹا بھائی ہے۔ وَاِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوْنَ ہم تو اس کے آپؑ سے بھی زیادہ بہی خواہ ہیں۔ اس کا بھلا چاہنے والے ہیں۔ اس سے ہمیں بھی محبت ہے۔ ہمارا چھوٹا بھائی ہے۔ اور آپؑ ہیں کہ ہم پر اعتبار ہی نہیں کرتے، یہ عجیب بات ہے۔ آپؑ یوسف کو ہم سے چھپائے چھپائے پھرتے ہیں۔ نہ وہ ہمارے ساتھ کھیلنے کو نکلتا ہے نہ وہ ہمارے ساتھ کسی سفر کو جاتا ہے۔ نہ ہمارے پاس اٹھتا بیٹھتا ہے، آپؑ ہر وقت گود میں لیے پھرتے ہیں، ہم سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔

تو آپؑ کو ہم پر کیا بداعتمادی ہے لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ آپؑ یوسف کے معاملے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ ہم تو اس کے بہی خواہ ہیں، بھلا چاہنے والے ہیں۔ ظاہر ہے انہوں نے کہا ہوگا کہ میں نے کب کہا ہے کہ یوسف کو تم سے خطرہ ہے یا تم یوسف کے دشمن ہو، ایسا تو میں نے نہیں کہا۔ تو وہ کہنے لگے اگر یہ بات ہے اَرْسِلْہُ مَعَنَا غَدًا تو کل اسے آپؑ ہمارے ساتھ بھیجیں۔ ہم باہر جائیں گے، جنگل میں سیر کریں گے، تفریح کریں گے۔ کھانا بنا کر لے جائیں گے اور وہیں جنگل میں بیٹھ کر کھائیں پئیں گے اور کھیلیں گے کودیں گے، بھاگیں دوڑیں گے، نشانہ بازی کریں گے اور واپس آ جائیں گے۔

یہاں سے علماء نے دلیل لی ہے کہ تفریح کرنا جو شرعاً جائز ہو اور تفریح میں وہ کام کرنا جن کی شریعت اجازت دے یہ اچھی بات ہے۔ کوئی دوڑ لگاتا ہے، کوئی گھڑ سواری کرتا ہے کوئی نشانہ بازی کرتا ہے تو اچھی بات ہے۔ اس پر سٹے، جوئے، شرطیں نہیں ہونی چاہیے۔ مثبت کھیلیں ہوں تو درست ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ باہر جا کر ہی تفریح کھیلیں کی جائیں، شہر یا گاؤں میں نشانہ بازی کی مشقیں، کھیل کود جس میں صحت بنتی ہو جیسے دیہات میں کبڈی وغیرہ تو یہ سارے کام جائز ہیں بشرطیکہ کوئی کام خلاف شریعت شامل نہ کیا جائے اور ان پر کوئی جوا بازی یا سٹہ نہ لگایا جائے۔

یعقوبؑ فرمانے لگے قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ یوسف کو جدا کرنے کو میرا دل نہیں کرتا اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ میرا دل اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ میں یوسف کو اپنے سے جدا کر دوں، کہیں بھیج دوں۔ اور پھر میں اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ آج کل تو یہاں اس علاقے میں بڑے خونخوار بھیڑیئے میں جنگلات ان سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ شہروں اور گاؤں سے لوگوں کے بچے اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ تم ایک بچے کو جنگل میں لے جاؤ اور اپنی بھاگ دوڑ، کھیل کود میں لگ جاؤ اسے کوئی بھیڑیا ہی پھاڑ کھائے تو میں اس بات سے بھی ڈرتا ہوں۔ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ اسے کوئی بھیڑیا ہی کھا جائے وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اور تمہیں اس کی خبر ہی نہ ہو۔ تو میرا دل نہیں مانتا۔ انہوں نے بڑا جھگڑا کیا، یہ کیا بات ہوئی بھلا، بھیڑیا کیوں کھا جائے گا

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ کہنے لگے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا کھا جائے یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر ہمارا ہونے کا کیا فائدہ۔ پھر ہمارا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اباجی ایسا نہیں ہو سکتا۔ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ چنانچہ اصرار، منت کر کے یعقوبؑ کو راضی کر لیا۔ علی الصبح سیر و تفریح پر نکل پڑے، کھانا پینا بھی ساتھ لے لیا، یوسف کو بھی ہمراہ لیا اور چل پڑے۔

اس بات میں یہود نے بھی بڑے اضافے کیے جنہیں اسرائیلات کہتے ہیں اور ہمارے مفسرین نے بھی وہ نقل فرما دیے ہیں۔ کیونکہ مفسرین کرام نے کسی کی رائے کو چھوڑا نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مفسرین کے نقل فرمانے سے وہ درست ہو گئے ہیں، نہیں۔ انہوں نے ان کے حوالے سے نقل فرمائی ہیں کہ یہ اسرائیلات ہیں، یہ یہودیوں کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ پھر یہ واقعہ قصہ گوؤں کے ہاتھ چڑھ گیا۔ انہوں نے بھی کبھی نظم میں، کبھی نثر میں بڑی بڑی کتابیں بنا لیں۔ یہ سارے اضافے ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ حقیقت وہ ہے جو قرآن کریم بتاتا ہے۔ خالص کہانی،

اصل واقعات وہ ہیں جو کتاب اللہ نے بیان فرمائے ہیں۔

چنانچہ جب وہ لے کر چلے گئے اور جنگل میں پہنچے تو انہوں نے ایک پرانے راستے پر جو کنواں تھا اس کا انتخاب کیا۔ چونکہ یہ سارے وہیں کے رہنے والے تھے، اونٹ پالتے تھے، جنگلوں میں چراتے تھے، قافلے لے کر آتے جاتے تھے۔ سفر کرتے تھے، تجارت کرتے تھے، مزدوری کرتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ راستہ کہاں ہے۔ ایک قدیم راستہ اس جنگل سے گزرتا تھا، جو اب متروک ہو چکا تھا، اور قافلوں نے دوسرا راستہ بنالیا تھا۔ اس پرانے راستے پر کنواں تھا لیکن جب لوگوں نے راستہ ہی بدل لیا تو برسوں سے ویران پڑا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں پانی ہے یا نہیں ہے، خشک ہو چکا یا کیچڑ سے بھر گیا یا مٹی سے بھر گیا کافی گہرا تھا۔ تو سیدھے وہاں لے گئے۔ آیہ مبارکہ واضح کر رہی ہے کہ جب وہ یعقوبؑ کے پاس سے لے گئے اور جنگل میں پہنچے تو اس بات پر سارے متفق ہو گئے وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ کہ انہیں ویران کنویں میں پھینک دیں۔

سبحان اللہ! بڑے نازوں کے پلے تھے، والد گرامی کے بڑے لاڈلے تھے۔ دنیا میں اللہ کریم نے انہیں اتنا حسن دیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث معراج میں فرماتے ہیں کہ میری یوسفؑ سے ملاقات ہوئی تو لگتا ہے جیسے اللہ نے آدھا حسن تو یوسفؑ کو دے دیا اور باقی آدھا ساری انسانیت میں بانٹا۔ تو بہت حسین تھے، نازک مزاج تھے پھر سات سال کے بچے تھے۔ پھر جب والد سے لے کر جنگل میں پہنچے تو بھائیوں نے جھڑکا مارا پیٹا، تکلیف بھی دی، اٹھا کر کنویں میں پھینک دیا، کنویں میں لٹکا دیا یا رسی کاٹ دی، یا ان کے پاس رسی ہی چھوٹی تھی اور کنواں زیادہ گہرا تھا۔ جہاں تک رسی تھی وہاں تک لٹکایا۔ جب رسی ختم ہو گئی انہوں نے چھوڑ دی۔ جب انہوں نے رسی چھوڑ دی نیچے دور کنویں کی گہرائی نظر آ رہی تھی۔ جب یوسفؑ کی پریشانی بڑھی اللہ کریم فرماتے ہیں پھر میں نے بات کی یوسفؑ سے، جب دنیا کا کوئی آسرا سامنے نہ رہا۔ کسی سے مدد کی کوئی امید نہ رہی، گھر سے دور، والد گرامی سے دور اور بھائی ایسے تھے جنہوں نے کنویں میں پھینک دیا۔ سطح زمین سے بھی نیچے چلے گئے تو فرمایا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا ہم نے یوسفؑ سے بات کی، گھبراؤ نہیں! یہ راستہ آپ کی ہلاکت کی طرف نہیں جا رہا، یہ آپ کی سلطنت مصر کی سڑک ہے جس پر آپ چل رہے ہیں یہ راستہ وہاں پہنچتا ہے۔ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا اور ایک وقت آئے گا کہ آپ تختِ مصر پر ہوں گے، یہ بھائی کاسہ سوال لیے آپ کے سامنے دستِ سوال دراز کریں گے۔ تب آپ انہیں یاد کرائیں گے کہ تم نے تو مجھے کنویں میں پھینکا تھا۔ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا ایک دن آئے گا جب

آپ ان کوان کی ساری باتیں یاد کرائیں گے وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ⑮ جبکہ انہیں تو یہ سارے قصے بھول بھی چکے ہوں گے۔ مدت بیت گئی ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ درمیان میں کافی سال گزر گئے ہوں گے۔ وہ تو یہ باتیں بھول بھی گئے ہوں گے۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ جبرائیل امین کو حکم ہوا۔ انہوں نے وہ رسی چھوٹنے یا کٹنے سے لے کر نیچے جو فاصلہ تھا، تہہ تک پہنچنے سے پہلے آ کر یوسف کو اٹھالیا۔ علمائے تفسیر لکھتے ہیں کہ کنویں میں ایک چٹان آگے کو نکلی ہوئی تھی، پانی سے اوپر تھی، اس پر ان کو بٹھادیا۔

الہام والقاء:

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ ہم نے ان پر وحی کی، یہاں وحی بمعنی الہام والقا ہے کیونکہ اس وقت تک آپ نبی مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ لیکن نبی تخلیقی طور پر نبیؑ ہوتا ہے، پیدائشی طور پر نبیؑ ہوتا ہے۔ مبعوث ہونے سے پہلے اس پر جو اللہ کی طرف سے بات آتی ہے اسے القاء یا الہام کہتے ہیں۔ اور القاء اور الہام غیر نبیؑ پر بھی ثابت ہے، ولی اللہ پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن نبیؑ پر جو ہوتا ہے وہ بہت قوی، مضبوط، کامل، قابل عمل ہوتا ہے۔ ولی پر جو ہوتا ہے وہ تعبیر کا محتاج ہوتا ہے یا پھر اللہ کریم جس سے کام لینا چاہیں اس کے قلب میں وہ یقین پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر عمل کر گزرتا ہے۔

جیسے اُم موسیٰ نبی نہیں تھیں۔ کوئی خاتون نبی نہیں ہوئی لیکن قرآن حکیم میں ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى (القصص:7) موسیٰؑ کی والدہ سے ہم نے بات کی۔ القاء یا الہام ہوا اور انہوں نے اس پر عمل بھی کیا، اور مشکل کام تھا۔ بہت عجیب اور مشکل کام تھا کہ اپنے نوزائیدہ بچے کو آپ کسی چیز میں رکھ کر دریا میں ڈال دیں، یہ آسان کام نہیں تھا۔ لیکن فرمایا رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا (القصص:10) ان کے دل سے ہم نے اپنا تعلق جوڑ لیا۔ اور وہ قوت انہیں بخشی کہ انہوں نے اس الہام، القاء کو بھی سمجھا، اس کے مفہوم کو بھی سمجھا، اس پر عمل کرنا بھی ضروری سمجھا اور وہ عمل کر گزریں۔ اور پھر کسی سے شکایت بھی نہیں کی، رونا، دھونا، چلانا بھی نہیں کیا کہ میں نے بیٹا دریا میں پھینک دیا ہے۔ فرمایا! ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا! پھینک دو! ہم لوٹا کر تمہیں دیں گے۔ تم ایک بچہ پھینک رہی ہو، ہم تمہیں وہ لوٹا دیں گے جو لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ جو اللہ کے رسولوں میں سے ہوگا۔ ہم اسے نبیؑ بنائیں گے اس کی زندگی کا خدشہ نہ کرو، دریا اس کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ زمانہ اس کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ یہ اللہ کے رسولوں میں سے ہوگا۔

اسی طرح ہم نے مریمؑ سے جو بات کی، وہ بھی الہام و القاء ہی تھا۔ انہوں نے بھی اس پر عمل کیا جو

انہیں ارشاد ہوا۔

یہ جو لوگ عمل کر گزرتے ہیں، اُس کی وجہ وہ القائے الٰہی، وہ رابطہ ہوتا ہے جو اللہ ان کے قلوب سے کرتے ہیں اور انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ بات بالکل سچی ہے اور مجھے ایسا کرنا ہے۔ حالانکہ وہ انتہائی مشکل کام ہوتا ہے لیکن وہ کر گزرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اگر کسی پر کچھ القاء ہوتا ہے یا وجدان کے ذریعے کسی طرح غیبی امر کا پتہ چلتا ہے تو سب سے پہلے اس القاء یا وجدان کو نبی علیہ السلام کی وحی پر پیش کیا جائے کہ کوئی خلاف شریعت امر کا حکم اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت انسانیت کے لیے آخری شریعت ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ تو دیکھنا چاہیے کہ اس کے خلاف تو کوئی عمل نہیں۔ جو کچھ دکھایا جاتا ہے، یا القاء کیا جاتا ہے وہ حق ہوتا ہے لیکن دو سرے ہوتے ہیں۔ ایک سرا وہ ہے جہاں سے بات آ رہی ہے اور دوسرا سرا وہ ہے جو بات وصول کر رہا ہے۔ جسے RECEIVING END کہتے ہیں۔ اگر اس END پر نبیؑ ہو تو پھر اتنا مضبوط ہے کہ درمیان میں غلطی نہیں ہوتی۔ غیر نبیؑ ہو تو اتنا مضبوط نہیں ہوتا، اسے دھوکا لگ سکتا ہے۔ سمجھنے میں غلطی لگ سکتی ہے، لہٰذا ولی کا کشف شریعتِ مطہرہ کا محتاج ہے۔ اس کے مطابق ہے تو ولی صرف خود مکلف ہے اس پر عمل کرنے کے لیے۔ اور اگر وہ کشف پر عمل نہیں کرتا تو دنیا کا نقصان ہوتا ہے، آخرت میں گناہ نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ نبیؑ کا کشف ساری امت کے لیے واجب العمل ہوتا ہے اور جو اس پر عمل نہ کرے اس کی دنیا بھی جاتی ہے، آخرت بھی جاتی ہے۔

جو بات نبیؑ کو سمجھ آتی ہے، نبیؑ کا خواب ہو، کشف ہو، وحی آئے الہام ہو، وجدان ہو یا نبیؑ کو القاء کیا جائے، تو جو بات اللہ کے نبیؑ کو سمجھ آتی ہے، اس کو ماننے کی ساری امت مکلف ہوتی ہے۔ اور اگر اس پر عمل نہ کریں تو دنیا کا نقصان بھی ہوتا ہے، آخرت کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ ولی کے کشف کو ماننے کا دوسرا مکلف ہی نہیں۔

تو یہ وہی القاء یا الہام ہے کیونکہ ابھی وحیِ نبوت تو نہیں آئی اور نبیؑ کو ولادت سے لے کر مبعوث ہونے تک انتہائی مضبوط اور اپنی شان کے مطابق مقاماتِ ولایت حاصل ہوتے ہیں۔ نبیؑ کی ولایت، ولی کی ولایت سے الگ ہوتی ہے، بہت اعلیٰ، بہت ارفع ہوتی ہے۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٥﴾ تو ہم نے یوسف سے بات کی، گھبراؤ نہیں! یہ تو اپنی طرف سے ہاتھ جھاڑ کر چلے گئے کہ یہ مصیبت ختم ہوئی لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ ایک دن آپ تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوں گے اور یہ کاسۂ سوال لیے آپ کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کریں گے۔ اور پھر آپ انہیں یاد دلائیں گے کہ یاد کرو! میں وہ یوسف ہوں جس

کو تم نے ویران کنویں میں پھینک دیا تھا!

وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ⑯ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ⑰ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ⑱

چنانچہ جب حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینک کر فارغ ہو گئے تو انہوں نے تھوڑا سا حیلہ کیا کہ انہیں پھینکنے سے پہلے ان کی قیمص اتر والی اور اسے بکری کے خون سے آلودہ کر لیا۔ دن گزار کر شام ڈھلے کہیں پلٹے۔ جب رات ہو گئی تو روتے، پیٹتے، چیختے چلاتے والد گرامی کے پاس آئے۔ شور سن کر یعقوب علیہ السلام باہر تشریف لائے، دیکھا کہ بیٹے رو پیٹ رہے ہیں اور ایک خون آلود کرتا ہاتھ میں ہے۔ پوچھا، کیا ہوا؟ کہنے لگے، ابا جی ہم نے کہا دوڑ لگاتے ہیں، دیکھیں مقابلے میں آگے کون نکلتا ہے۔ ہم یوسف کو سامان کے پاس چھوڑ گئے کیونکہ وہ بچے تھے انہوں نے دوڑ نہیں لگائی۔ تو ہم جب بھاگتے ہوئے دور نکل گئے، اسے بھیڑیا کھا گیا۔ آپ پر تو یوسف کی محبت غالب ہے بھلا آپ ہماری بات کب مانیں گے۔ آپ تو ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے خواہ ہم سچ ہی کہتے رہیں۔ پھر وہ خون آلود کُرتا پیش کیا کہ یوسف کو تو بھیڑیئے نے کھا لیا۔

یعقوب علیہ السلام نے ان کی بات سنی، وہ کُرتا دیکھا اور کہا کہ جو تم کہتے ہو یہ کُرتا اس کی تائید نہیں کرتا۔ اگر بھیڑیئے نے یوسف کو کھا لیا تو ظاہر ہے کُرتے کو پھٹ جانا چاہیے تھا۔ درندہ ہے اس نے چیرا پھاڑا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کُرتا تو اس نے سالم اتار لیا، اور کُرتا خون آلود بھی ہو گیا لیکن پھٹا نہیں۔ تو تمہاری یہ بات درست نہیں کیونکہ کُرتا تو سالم ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک درندہ بچے کو کُرتا پھاڑے بغیر کھا جائے۔ اس نے بچے کا کُرتا کیسے اتار لیا، وہ پھاڑتا، چیرتا لیکن یہ کرتا بتا رہا ہے کہ تمہاری بات درست نہیں ہے۔

انصاف کا تقاضہ:

یہاں علماء لکھتے ہیں کہ قاضی، منصف یا جج کو صرف گواہوں کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے بلکہ آثار و قرائن بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا بتاتے ہیں کہ کیا ہوا ہوگا۔ لیکن یہ سارا تو تب ہو اگر قانون بھی انصاف پر مبنی ہو۔ اگر قانون ہی بندوں کا گھڑا ہوا ہو، غیر منصفانہ ہو تو جج اور قاضی کیا دیکھے گا! جیسے ہمارے جج صاحبان کہتے ہیں کہ عوام کو انصاف ملنا چاہیے لیکن انصاف تو عدل کو کہتے ہیں۔ عدل یہ ہے کہ برابر برابر تولا جائے تو آپ غیر عادلانہ نظام میں عدل کیسے کریں گے۔ ترازو ہی ٹیڑھا ہو تو عدل کیسے ہوگا۔ کافروں اور غاصبوں کا نظام عدالت کیسے انصاف دے سکتا ہے!

بہر حال یعقوب علیہ السلام نے وہ آثار دیکھ کر فرمایا، نہیں تم یہ جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارے نفس کی گھڑی ہوئی

باتیں ہیں، اس میں حقیقت نہیں ہے لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا نہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ تم نے زیادتی کی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے یوسف کو کیا کیا ہے۔ لیکن اس خواب کی تعبیر سے، جو ایک نبی زادے اور مستقبل کے نبیؑ نے دیکھا تھا، انہیں یقین تھا کہ وہ پورا ہو گا۔ اس طرح سے بھیڑیا کھا گیا تو جو اللہ کریم نے اسے بشارت دی تھی اس کا کیا ہوا۔ یہ جھوٹ بولتے ہیں لیکن اب میرے اختیار میں صرف یہ ہے کہ میرے لیے صبر ہی بہترین راستہ ہے۔ اب میں شکوہ بھی کروں تو کس سے کروں، میرے دست و بازو تم ہی تھے، میری اولاد تھے، دس بھائی تھے اور وہ تمہارا چھوٹا بھائی تھا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اس کی حفاظت کا حق ادا کرتے۔ اگر کوئی بھیڑیا آتا تو تمہیں زخمی کرتا، تم اسے یوسف تک نہ پہنچنے دیتے۔ جب تم ہی ڈاکو بن گئے، تم نے ہی جھوٹ بولنا شروع کر دیا اور اس کے خلاف باتیں گھڑنا شروع کر دیں۔

بہترین حل:

تو میں ایک ضعیف العمر آدمی ہوں۔ میرے پاس بہترین راستہ یہ ہے کہ میں اپنے اللہ پر بھروسہ کر کے انتظار کروں کہ اللہ کی طرف سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے اور کیا چیز آتی ہے۔ صبر ہی بہترین راستہ ہے۔ صبر ہی اختیار کروں گا۔ اور جو باتیں تم نے گھڑ لی ہیں ان پر اللہ میری مدد فرمائے گا۔ میں تمہاری شکایت بھی لے کر کس کے پاس جاؤں۔ کس سے یہ سارا قصہ بیان کروں، کس سے مدد چاہوں۔ میں تو اللہ کا نبیؑ ہوں، اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ اور اللہ ہی کی بارگاہ میں، جب تک یہ آزمائش ہے، صبر سے گزاروں گا۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

اِدھر یہ چل رہا تھا، اُدھر، اگرچہ راستہ متروک تھا، لیکن کوئی قافلہ تاریکی میں آیا اور پرانے راستے پر چل دیا۔ نئے راستے سے بھٹک کر اس راستے پر آ گزرا۔ اسی کنویں کے قریب انہوں نے خیمہ لگایا اور اپنا ایک آدمی کنویں پر پانی لانے کے لیے بھیجا۔ اس نے کنویں میں اپنا ڈول ڈالا تو یوسفؑ حکم الٰہی سے اس ڈول میں بیٹھ گئے۔ ادھر ڈول وزنی ہو گیا تو اس نے سمجھا پانی سے بھر گیا ہے، اس نے کھینچنا شروع کیا، بڑا زور لگا کر اس نے کھینچا۔ بڑا حیران ہوا کہ پانی اتنا وزنی ہے۔ ظاہر ہے اب ایک ڈول پانی سے تو ان کا وزن زیادہ ہی ہوگا۔ جب اس نے اوپر کھینچا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اتنا خوبصورت نور کا پیکر بچہ اس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا سبحان اللہ بڑی خوشی کی بات ہے، اس سے بڑھ کر اور خوشی کی بات کیا ہوگی۔ اتنا خوبصورت بچہ!

وہ بردہ فروشی کا زمانہ تھا۔ بچوں کو اغوا کر کے بیچ دیا جاتا تھا۔ تو کہنے لگا یہ تو کوئی بادشاہ ہی خرید لے گا۔ یہ تو بہت بڑی دولت، بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس نے اپنے قافلے والوں سے بھی چھپالیا تا کہ کوئی اس کے ساتھ شراکت داری نہ کرے۔ لیکن وہ مخلوق سے چھپاتا ہے، خالق سے تو نہیں چھپا سکتا۔ اللہ کا تو اپنا ایک پروگرام ہے، اپنا ایک نظام ہے۔ وہ آدمی سمجھتا ہے مجھے غلام مل گیا، اللہ نے طے کیا کہ اس راستے انہیں مصر میں پہنچا دوں۔ انہوں نے غلام بنا کر پہنچایا، اللہ نے سلطان بنا دیا۔ اس کی اپنی حکمت ہے، اس کے اپنے کام ہیں۔ اس کا اپنا ایک پروگرام ہے تو وہ شخص چھپا تو رہا تھا، اپنوں سے بھی بیگانوں سے بھی لیکن اللہ کریم تو جانتے تھے کہ یہ کیا کر رہا ہے۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾

مفسرین کی رائے کے مطابق یوسف ؑ کو دو یا تین دن اس میں رہنا پڑا تو وہ جو ان کا بڑا بھائی تھا جس نے کہا تھا کہ یوسف ؑ کو قتل نہ کرو وہ باقی بھائیوں سے چھپتا چھپاتا جاتا اور کھانے کی چیز کنویں میں گرا دیتا۔ اور خبر رکھتا کہ کیا ہو رہا ہے، زندہ ہے ابھی۔ ایک دن گیا اور دیکھا کہ موجود نہیں تھے اور ساتھ قافلہ دیکھا تو سمجھ گیا کہ قافلے والوں نے ڈول ڈالا ہوگا اور نکال لیا ہوگا تو اس نے بھائیوں کو بتایا کہ یوسف کو تو قافلے والوں نے نکال لیا ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے اور شور کیا، ہمارا ایک بچہ تھا، وہ بھاگا اور کنویں میں گر گیا۔ تم لوگوں نے نکال لیا ہے۔ جب خوب شور مچایا تو قافلے کے سردار نے تلاش شروع کی۔ اس آدمی کو پوچھا تو بالآخر برآمد ہو گئے۔ کہنے لگے یہ لڑکا تو ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ تو قرآن کریم فرماتا ہے کہ ان کے بھائیوں کو یوسف ؑ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کہنے لگے اگر تم لوگوں نے نکال لیا ہے تو اس کی قیمت دے دو اور لے جاؤ۔ ہمیں تو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پہلے بھاگ گیا تھا، اب لے گئے تو پھر بھاگ جائے گا تو تم لے جاؤ۔ اور چند درہموں کے عوض بیچ دیا۔ جس زمانے کی بات ہو رہی ہے اس وقت ان لوگوں میں چالیس تک کی گنتی رائج تھی۔ اور اگر چالیس سے زیادہ درہم ہوتے تو ان کا وزن کرتے کہ وزن کتنا ہے اور معدودہ دراہم چالیس سے کم درہم کو کہتے تھے۔ وہ لوگ چالیس سے کم کو 'معدودہ' کہتے تھے۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ بھائیوں نے بیس درہم میں انہیں بیچ دیا اور بہت خوش ہوئے کہ چلو یوسف کا قصہ بھی پاک ہوا۔ اب یہ قافلہ مصر میں جا کر اترے گا اور یہاں سے بہت دور چلے گئے۔ یہ قصہ پاک ہوا اور دو، دو درہم بھی مل گئے۔ گنتی کے چند دراہم کے بدلے انہوں نے یہ دولت بیچ دی۔ انہیں یوسف میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ چاہتے بھی نہیں تھے کہ انہیں واپس لے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے سمجھا کہ ہمارے دونوں کام ہو گئے۔ دس بھائیوں کو دو، دو درہم مل گئے اور یہ مصیبت بھی ٹل گئی۔ اب یہ یہاں سے بہت دور جائیں گے ورنہ ہمارے پاس تو کوئی ایسا وسیلہ نہیں تھا کہ ہم انہیں اتنی دور بھیج سکتے تو قصہ تمام ہوا۔

سورۃ یوسف رکوع 3 آیات 21 تا 29

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۫ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْٓ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِىَ رَاوَدَتْنِىْ عَنْ نَّفْسِىْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِىْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

اور جس شخص نے مصر میں ان کو خریدا تھا اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے عزت و اکرام سے رکھو ہوسکتا ہے کہ یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں اور اس طرح ہم نے یوسف (علیہ السلام) کو اس سرزمین (مصر) میں جگہ دی اور تا کہ ہم ان کو (خواب کی) باتوں کی تعبیر سکھائیں اور اللہ اپنے کام پر غالب ہیں ولیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے ﴿۲۱﴾ اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو حکمت (نبوت) اور علم بخشا اور اسی طرح ہم (خلوص سے) نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں ﴿۲۲﴾ اور جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اور دروازے بند کردیئے اور کہنے لگی جلد آجاؤ، انہوں نے فرمایا اللہ کی پناہ! بے شک وہ (تیرا خاوند) میرا مربی ہے اس نے مجھے بہت اچھی طرح رکھا۔ یقیناً غلط کاروں کو کبھی کامیابی نہیں ہوا کرتی ﴿۲۳﴾ اور البتہ اس عورت نے ان کا قصد کیا اور اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھتے تو (ہوسکتا ہے) وہ بھی قصد کرتے۔ اس طرح ہوا تا کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی (گناہِ صغیرہ وکبیرہ) کو دور کردیں بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے ﴿۲۴﴾ اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور عورت نے ان کا کُرتا پیچھے کی طرف سے پھاڑ ڈالا اور دونوں نے اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس پایا وہ عورت کہنے لگی جو تمہاری بیوی کے ساتھ برائی کرنا چاہے اس کی سوائے اس کے کیا سزا ہوسکتی ہے کہ اسے قید کیا جائے یا دردناک سزا دی جائے ﴿۲۵﴾ انہوں (یوسف علیہ السلام) نے فرمایا اس نے مجھے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو اسی (عورت) کے قبیلے کے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر ان کا کُرتا آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹے ہیں ﴿۲۶﴾ اور اگر ان کا کُرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو یہ عورت جھوٹی ہے اور یہ (یوسف علیہ السلام) سچے ہیں ﴿۲۷﴾ پس جب ان کا کُرتا دیکھا تو پیچھے سے پھٹا تھا کہنے لگا یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے بے شک تمہاری چالاکیاں بہت بڑی

ہوتی ہیں ﴿۲۸﴾ (اے) یوسف (علیہ السلام)! اس بات کو جانے دو اور (اے عورت!) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ بے شک قصور تیرا ہی ہے ﴿۲۹﴾

تفسیر ومعارف

بالآخر یہ قافلے والے یوسفؑ کو لے کر مصر پہنچ گئے۔ تجارتی قافلوں کا اپنا ایک انداز ہوتا تھا۔ جب یہ کسی شہر پہنچتے تو شہر کے باہر خیمہ زن ہوتے۔ پھر دو تین دن بڑی تشہیر کرتے کہ ہمارے پاس ہر قسم کا مال ہے اور ساتھ یہ اعلان بھی کرتے رہتے کہ بازار کس وقت لگے گا۔ الغرض خوب چرچا کرتے تھے۔ ایک دو دن تو اس اشتہاری مہم نذر ہو جاتے۔ پھر جب بازار لگاتے تو پورا شہر امڈ آتا۔ بے شمار گاہک آ جاتے اور کچھ نہ کچھ خرید کے لے جاتے۔ تو یوں اُن کا مال بک جاتا اور وہ وہاں سے نیا خرید کر آگے چل دیتے۔

اب یہ وہاں پہنچے تو اُن کے پاس یوسفؑ تھے۔ انہوں نے خوب ڈھنڈورا پیٹا کہ ہمارے پاس ایک ایسا خوبصورت غلام برائے فروخت ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی اور کوئی اس کی قیمت نہیں دے سکتا۔ اس بات کا اتنا چرچا کیا کہ شاہی محل تک بھی شور پہنچا۔ آخر کار بازار سج گیا اور یوسفؑ کو بکنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ بڑے بڑے رئیسوں اور امراء نے بڑی بڑی بولیاں لگائیں لیکن وہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ آخر عزیز مصر نے خرید لیا۔

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ بادشاہ عمالقہ میں سے تھا اور عزیز مصر اس کا وزیر یا نائب تھا اور سارے امور سلطنت یہی انجام دیتا تھا۔ بادشاہ کی حیثیت ایک سرپرست، سربراہ یا مالک کی تھی جبکہ سارا نظام سلطنت یہی عزیز مصر چلاتا تھا۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ عزیز مصر نے یوسفؑ کے وزن کے برابر سونا، وزن کے برابر مشک اور وزن کے برابر ریشمی کپڑا دیا۔ تو یوسفؑ کی مصر کے بازار میں یہ قیمت لگی۔ وہ خرید کر گھر لے آیا۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا تھی۔ حضرت یوسفؑ کی عمر سات سال تھی جب وہ اپنے والد گرامی سے جدا ہوئے۔ جب مصر پہنچے تو درمیان میں چند مہینے ہی ہوں گے۔ تو اسی عمر کے بچے تھے اور زلیخا اس وقت ایک شادی شدہ خاتون تھی اور عزیز مصر بھی کوئی نوعمر نہیں تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر ہوگی اور زلیخا بھی چالیس سے اوپر ہوگی۔ لیکن ان کی اولاد نہیں تھی اور زلیخا کے حسن کا بھی بہت چرچا تھا۔ اسے بھی مصر کی ملکہ حسن کہا جاتا تھا۔ عزیز مصر یوسفؑ کو خرید کر گھر لے آیا اور بیوی سے کہا اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ اس کے ساتھ بڑا پیار بھرا سلوک کرنا، اسے غلاموں کی طرح نہیں بلکہ اولاد کی طرح پالنا۔ محبت سے پالنا۔ بہت خوبصورت، بہت نیک سیرت، معصوم اور اچھا بچہ ہے۔ اس کے آثار بہت اچھے

ہیں، ہوسکتا ہے یہ ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو۔ نیک بخت اور سعادت مند ہے۔ اس کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نیکی کی طرف مائل ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ ہوسکتا ہے ہمیں اس سے بہت زیادہ نفع حاصل ہو اور یہ ہمارے بڑھاپے کا سہارا بن جائے، ہمارے آرام، عزت و آبرو کا سبب بن جائے۔ اور ہم بے اولاد بھی ہیں ہوسکتا ہے اسے ہم اپنا بیٹا ہی بنالیں۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تین لوگوں نے اندازہ لگانے میں کمال دکھایا۔ ایک یہی عزیز مصر جس نے یوسفؑ کو دیکھ کر جو اندازہ لگایا وہ بہت صحیح تھا۔ دوسرا وہ فرماتے ہیں حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی جنہوں نے حضرت شعیبؑ کو مشورہ دیا کہ حضرت موسیٰؑ کو خدمت کے لیے رکھ لیں کہ یہ شخص بہترین ہے۔ امانت دار اور طاقتور ہے۔ فرماتے ہیں اُن کی مردم شناسی بھی کمال کی تھی اور اندازہ بھی صحیح تھا۔ تیسرے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کہ آپ نے اپنے بعد جو فاروق اعظمؓ کا انتخاب کیا، یہ بھی کمال کیا۔ ان تین لوگوں نے جو اندازے لگائے وہ 100 فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح ثابت ہوئے۔ حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی کا اندازہ بھی بہت درست نکلا، عزیز مصر کا اندازہ بھی بہت درست نکلا اور سیدنا صدیق اکبرؓ کا اندازہ بھی بہت ہی مناسب، بہت ہی درست اور صحیح ترین نکلا۔ مردم شناسی کے یہ جو تین اندازے لگائے گئے یہ قابلِ رشک تھے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں بظاہر یوسفؑ تکلیف میں ڈالے گئے۔ کنویں سے نکلے، غلام بنائے گئے۔ بازار میں بولیاں لگیں، بیچے گئے۔ عزیز مصر نے خرید لیا۔ لیکن یہ سارا ظاہری کام تھا۔ اصل کیا تھا كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ جہاں ہم نے یہ سارے اسباب ظاہری بنائے، وہاں اصل بات اور نتیجہ یہ تھا کہ ہم نے یوسفؑ کو مصر پہنچا دیا۔ بہترین ٹھکانہ عطا فرما دیا۔ جس سبب سے بھی پہنچے، مصر پہنچے۔ شاہی محل اُن کی رہائش گاہ بنا۔ شاہی تربیت گاہ میں ان کی تربیت ہونے لگی۔ شاہی خدام عطا ہوئے۔

جب اسباب ظاہری اور دنیوی تربیت کا اہتمام شاہی محل میں فرما دیا تو باطنی تربیت اپنے دستِ قدرت سے عطا کی۔ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ، ہم نے وہبی طور پر انہیں تعبیر کا علم بھی عطا فرمایا علوم نبوت سے سرفراز فرمایا اور روحانی اور باطنی علوم کا خزانہ عطا فرمایا۔ عام آدمی کی نگاہ میں غلام بن کر بک رہے تھے لیکن ہم انہیں سلطان بنانا چاہتے تھے اور ہم نے اس کی بنیاد رکھ دی۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اللہ تعالیٰ اپنی بات پر غالب ہے، جو کرنا چاہتا ہے وہ کر دیتا ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے ناآشنا

رہتی ہے۔ مسبب الاسباب تک لوگوں کی نگاہ نہیں پہنچتی، اسباب تک ہی رہتی ہے۔

لوگ اسباب میں الجھے رہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اسباب تو پردہ ہیں۔ پس پردہ کون ہے؟ اسباب تو ایک حجاب ہیں، ظاہری نگاہ کے سامنے آ جاتے ہیں۔ کوئی پس پردہ بھی ہے جس کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ تو مسبب الاسباب تک اللہ کے نیک بخت بندوں کی نگاہ پہنچتی ہے۔ جبکہ اکثریت اسباب میں الجھی رہتی ہے کہ اب بھلا یہ کیا بات ہے کہ اللہ کا ایک بندہ غلام بن کر منڈی میں فروخت ہو رہا ہے اور اسی ملک کا سلطان بن جاتا ہے۔ تو فرمایا یہ ہمارا کام تھا کہ ہمیں ان کی تربیت کرنا تھی۔ ان کی ظاہری تربیت شاہی محل میں بادشاہ کے سپرد کر دی۔ باطنی تربیت ہمارے پاس تھی وہ ہم نے کر دی۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ فرمایا، جب آپ اپنی بلوغت کی عمر پوری کر چکے اور جوانی کو پہنچے، بااختیار اور باشعور ہوئے، اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہوئے تو ہم نے انہیں نبوت بھی عطا کر دی اور علم بھی عطا کر دیا۔ نبوت تو ایک وہبی چیز ہے جو کسب یا محنت سے نہیں ملتی بلکہ اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اور ازل میں تقسیم ہو چکی۔ نبی تخلیقی طور پر نبیؑ پیدا کیے گئے۔ یہاں فرمایا، ہم نے علومِ ظاہری و باطنی سے بھی سرفراز فرمایا۔ جبکہ نبوت خود ایک خزینۂ علمی ہوتی ہے اور نبوت کے ساتھ وہ تمام علوم عطا ہو جاتے ہیں جن کی نبیؑ کو اعلانِ نبوت کے بعد ضرورت پیش آتی ہے۔ عقیدہ و عمل، فرائض و واجبات، سوالات وغیرہ کی ساری تفصیل۔ جب نبیؑ نبوت سے سرفراز ہوتا ہے تو یہ سارے علوم عطا کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں فرمایا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ اور ہم نے انہیں حکمت یعنی نبوت عطا کی اور مزید علوم بھی عطا فرمائے۔ علم تعبیر یوں تو نبوت کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن بہرحال ایک علم ہے جو یوسفؑ کو خصوصی طور پر عطا کیا گیا۔

علمِ لدنی:

سننا، پڑھنا اور لکھنا، یہ علم کے مختلف ذرائع ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اسے علم کہنا بھی صحیح نہیں ہے، یہ معلومات ہیں ہیں۔ پڑھ کر بھی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، دیکھ کر بھی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

حقیقی علم وہ ہے جو انبیاءؑ کو عطا ہوا ہے، اور اس میں کسی اور کا دخل نہیں۔ اللہ دیتا ہے اور اللہ کا نبیؑ لیتا ہے۔ اسے کہتے ہیں علم لدنی۔ وہ علم جو منجانب اللہ براہ راست عطا فرمایا جاتا ہے اور یہ انبیاءؑ کا خاصہ ہے۔ کسی نبیؑ کو کسی دنیوی استاد کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہر نبیؑ کو اللہ نے اپنی طرف سے علم عطا فرمایا۔ علم لدنی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حقیقی علم ہوتا ہے۔ یہ چیزوں کی حقیقت کو جانتا ہے۔ امت میں سے بھی کسی کو بااتباع نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نصیب ہو سکتا ہے، جیسے خضرؑ کے بارے میں آتا ہے وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکھف: 65) ہم نے اپنی طرف سے انہیں علم عطا

فرمایا۔ تو خضرؑ نبی نہیں تھے بلکہ بنی اسرائیل کے ایک ولی اللہ تھے اور اپنے عہد کے قطب مدار تھے۔ اب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ بعض اہل اللہ ان منازل بالا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں بعد از وصال ان کی روح ملکوتی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ جس طرح دوسرے فرشتے کائنات میں فرائض سرانجام دیتے ہیں ویسے ہی اللہ مالک الملک ان کی بھی کوئی ذمہ داری لگا دیتے ہیں۔ حضرت خضرؑ کی ذمہ داری اس ضمن میں ہے۔ ان کی روح بھی بعد از وصال ملکوتی شکل اختیار کر گئی۔ جیسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ بعد از وصال ان کی روح مبارک بھی ملکوتی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اللہ کے اور کتنے ایسے بندے ایسے ہوں گے، اللہ ہی جانیں، اس کے بندے جانیں۔ تو یہ علم من جانب اللہ انبیاء کو عطا ہوتا ہے اور باتباع نبیؐ ان کے خاص خاص امتیوں کو عطا ہوتا ہے۔ اسے علم لدنّی کہتے ہیں۔ اور علم لدنّی کا مالک، ظاہری علم والے سے زیادہ نکتہ ور اور حقیقت شناس ہوتا ہے۔ علوم ظاہری والے کی نظر ان نکات تک نہیں پہنچتی جہاں تک علم لدنّی والے کی نگاہ پہنچ جاتی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ اور ہم اپنے مخلص اور خلوص دل سے اطاعت کرنے والے بندوں کو اسی طرح انعام و اکرام سے نوازا کرتے ہیں۔

زلیخا کا واقعہ:

یوسفؑ بے پناہ خوبصورت تھے، زمانہ ارمغان شباب کو بھی پہنچے۔ زلیخا ان پر فریفتہ ہو گئی۔ چونکہ وہ مسلمان تو نہیں تھی کہ اسے عقیدت ہوتی۔ اس کا تعلق نبیؑ کے ساتھ ایمان کا ہوتا تو وہ اطاعت کرتی۔ یوسفؑ کی جوانی اور حسنِ بے مثال دیکھ کر اسے اس کے نفس نے بہکا دیا۔ ارشاد باری ہے وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ تو جس خاتون کے گھر میں وہ رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، اس کی نیت بدل گئی اور اس نے اپنی نفسانی خواہشات کا اظہار کر دیا۔ جب یوسفؑ کی طرف سے مثبت جواب نہ ملا تو پھر اس نے ایک حیلہ کیا کہ اس کا بہت بڑا محل تھا، باہر تک جانے کے کئی کمرے تھے۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ سات دروازوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ اس نے وہ سارے دروازے مقفل کر دیے اور ایک کمرہ بہت اچھی طرح سجایا، اس کو خوشبوؤں میں بسایا، عجیب طرح کی روشنیاں جلائیں اور خوبصورت بستر لگایا۔ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ اور کہنے لگی میرے پاس آ جائیے میں آپ کے لیے حاضر ہوں۔ تو پہلا جملہ جو اللہ کے نبیؑ نے ارشاد فرمایا وہ یہ ہے۔

دلائل عظمتِ نبیؑ:

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ انہوں نے فرمایا اللہ کی پناہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں عجیب و غریب بحثیں ہوئی ہیں اور علماء نے ایسی باتیں لکھی ہیں جو کم از کم میری سمجھ میں تو نہیں آئیں۔ ایک عجیب بات جو میں نہیں سمجھ سکا وہ یہ ہے کہ پہلے

تو یوسف علیہ السلام کو الزام دے دیتے ہیں پھر اس کی صفائی دینا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ یوسفؑ پر کوئی الزام آتا ہی نہیں ہے۔ پہلا جملہ جو انہوں نے ارشاد فرمایا وہ یہ تھا مَعَاذَ اللّٰہِ اللہ کی پناہ، اب اللہ کا نبیؑ ہو، نبوت سے سرفراز ہو چکا ہو، اللہ کی پناہ مانگ رہا ہو تو اس کی طرف کوئی الزام جاتا دکھائی نہیں دیتا، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی ذات پر کوئی الزام کیسے لگ سکتا ہے۔

پھر انہوں نے دلیل دی، اللہ کی پناہ، اللہ اس سے محفوظ رکھے، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ پھر فرمایا اِنَّهٗ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ تیرے خاوند نے تو میری پرورش کی، بچوں کی طرح مجھے پالا۔ اس نے تو اپنی محبت سے مجھے سرفراز فرمایا۔ میرے لیے طرح طرح کے لباس بنواتا، طرح طرح کے کھانوں سے میری تواضع کرتا اور خیال رکھتا رہا اس نے اپنا سارا پیار مجھے دیا۔

بچپن سے لے کر اس جوانی تک برسوں اپنی محبت مجھ پر نچھاور کی ہے، میری خدمت کی ہے تو میں اس کے احسان کا یہ بدلہ دوں اور ناشکری کروں؟ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ۝۲۳ یہ تو ظلم ہوگا اور اللہ ظلم کرنے والوں کو کبھی بامراد نہیں کرتا۔ فرمایا اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ اللہ کا قانون ہے جو لوگ زیادتی کرتے ہیں، ظلم کرتے ہیں، ناشکری کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ناکامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ۚ زلیخا نے تو یوسفؑ کو گناہ میں ملوث کرنے کا پورا پورا ارادہ کر لیا دلی طور پر تیار ہوگئی اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ اگر اللہ کی دلیل یوسفؑ نہ دیکھ رہے ہوتے تو ممکن ہے ان کے دل میں بھی کوئی خیال گزر جاتا۔ هَمّ ہوتا ہے وہ خیال جو دل میں گزرتا ہے جب وہ مضبوط ہو جاتا ہے، بندہ اس سے متفق ہو جاتا ہے تو پھر وہ ارادہ بن جاتا ہے۔ تو زلیخا تو ارادے تک پہنچ گئی، جو خیال دل میں آیا اس کا ارادہ بھی کر لیا۔ اس کی تیاری بھی کر لی، دروازے بند کر دیے۔ ایک کمرے میں بند کر کے انہیں دعوت گناہ بھی دے دی۔ فرمایا یوسف تو نبیؑ تھے ان کے دل میں ایسا خیال کیسے آ سکتا ہے ہاں اگر برہان ربی نہ ہوتا، نبیؑ نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ بتقاضائے بشریت ان کے دل میں بھی کوئی خیال گزرتا۔ اب یہاں بھی بہت سے حضرات نے عجیب سی تاویلیں فرمائی ہیں۔ ہر ایک کو اللہ نے قلوب سے سرفراز فرمایا ہے۔ ہر عالم کی رائے اپنی اہمیت اور اپنا وزن رکھتی ہے۔ یہ الگ بات کہ ہم اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے جو سمجھ مجھے عطا کی ہے، قرآن کریم کو جس طرح میں سمجھ رہا ہوں، میری سمجھ میں تو یہ آ رہا ہے ایک شرط سے مشروط ہے۔ وہ شرط ہے وہ جزا ہے، جب شرط پوری نہ ہو تو جزا وارد ہو جاتی ہے، شرط پوری ہو جائے۔ تو وہ جزا نہیں رہتی۔ تو ہو سکتا ہے وہ بھی صد کرتے اگر وہ اللہ کی طرف سے دلیل پر نظر نہ رکھتے تو اللہ کی دلیل ان کے سامنے نہ ہوتی۔ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ

رَبِّہٖ۔ وھم بھا ایک شرط سے مشروط ہے۔ جب شرط پوری نہ ہو تو جزا اور د ہو جاتی ہے۔ شرط پوری ہو جائے تو وہ جزا نہیں رہتی۔ یہاں فرمایا گیا ہے کہ اگر وہؑ اللہ کی طرف سے دلیل پر نظر نہ رکھتے، اللہ کی دلیل ان کے سامنے نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے وہ بھی قصد کرتے۔ اس دلیل میں بھی بہت سی باتیں کی گئی ہیں۔ کسی نے کہا یعقوبؑ کو دیکھ لیا تھا، انہیں یعقوبؑ نظر آئے۔ بعض نے لکھا کہ زلیخا کے اس کمرے میں بت تھا جس کی وہ پوجا کرتی تھی۔ اس نے بت پر چادر ڈال دی پردہ ڈال دیا تو یوسفؑ نے پوچھا ایسا کیوں کر رہی ہو تو اس نے کہا یہ میرا معبود ہے کہ یہ نہ دیکھ سکے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا میرا معبود تو دیکھ رہا ہے۔ میرے معبود کے سامنے تو کوئی پردہ حائل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ سب باتیں تو تب ہیں جب یوسفؑ کے قدم لڑکھڑائے ہوں۔ قرآن تو کہتا ہے کہ اگر ان کے پاس برہان ربّی نہ ہوتی (انہوں نے دلیل ربی نہ دیکھ لی ہوتی) اور سب سے بڑی برہان تو خود نبوت ہے جو قرآن پہلے کہہ رہا ہے اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ انہیں ہم نے نبوت دی اور علوم فاضلہ عطا کر دیے۔ جب ان کے پاس نورِ نبوت تھا تو جزا تو واقع نہیں ہو سکتی۔ اگر نورِ نبوت نہ ہوتا، اللہ کے نبیؑ نہ ہوتے تو ممکن ہے خیال گزر جاتا کیونکہ بتقاضائے بشریت برائی کا خیال گزرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ اگر کسی کو چوری کا یا کسی برائی کا خیال آتا ہے اور وہ اس پر عمل نہیں کرتا بلکہ اللہ سے ڈر کر چھوڑ دیتا ہے تو یہ باعثِ ثواب ہے۔ نیکی کا خیال بھی گزرتا ہے کہ یہ کروں اور کر نہیں سکتا تو نیک سوچ پر بھی اسے اجر ملتا ہے۔ تو اگر یوسفؑ کو خیال گزر بھی جاتا تو کوئی عیب نہیں تھا اور اس پر عمل نہیں کرتے تو اس پر بھی ایک درجہ بلند ہوتا، ثواب ملتا لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں کہ خیال تو تب گزرتا جب ان کے پاس نورِ نبوت نہ ہوتا۔

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔ اگر ان کے پاس اللہ کی دلیل، ان کے سامنے نہ ہوتی تو عین ممکن ہے کہ بتقضائے بشریت انہیں خیال گزر جاتا۔ میرا خیال ہے یہاں کسی صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، قرآن حکیم نے بڑی صاف اور واضح بات فرمائی ہے۔ وہ تو اللہ کے نبیؑ تھے ان کو تو ایسا خیال بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اس طرح ہم نے اپنے نبیؑ کو نبوت سے سرفراز کر دیا اور ان کے اس سارے اقدام سے بچ جانے کا اسے سبب بنا دیا۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۲۴﴾ یقیناً یوسفؑ ہمارے بہت ہی پیارے، نیک اور اطاعت گزار بندوں میں سے ہیں۔

میرا خیال ہے رب جلیل کی صفائی دینے کے بعد کسی کی صفائی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میری اور آپ کی دلیلوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ تصور کر لینا کہ انہوں نے ارادہ فرمایا تھا تو اسی ارادے کی تو قرآن تردید فرما رہا ہے۔ اگر ان کے پاس نورِ نبوت نہ ہوتا، بُرْهَانَ رَبِّیْ نہ ہوتی، اللہ کی دلیل نہ ہوتی تو

ہوسکتا ہے شاید ان کے دل میں بھی خیال گزر جاتا۔ کیونکہ انسان تو وہ بھی تھے، جوان بھی تھے، خوبصورت بھی تھے۔ وہ بھی ملکہ حسن تھی مصر کے حکمران کی بیوی تھی۔ شاہی محل تھا، عیش وعشرت تھی۔ فرمایا لیکن ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ لمحہ آنے سے پہلے ہم نے انہیں نور نبوت سے اور برہان ربی سے سرفراز فرمادیا تھا۔ اور اسی طرح ہم اپنے بندوں کی حفاظت فرماتے ہیں ہم اپنے بندوں کو وہ نورانیت، وہ انوارات، وہ کیفیات وہ لذاتِ قلبی، وہ کیفیات روحانی عطا کردیتے ہیں جو ان کے اور گناہ کے درمیان حائل ہوجاتی ہیں، جنہیں چھوڑ کر وہ گناہ کی طرف نہیں جاتے۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ وہ تو ہمارے بہت ہی مخلص، پیارے محبوب بندوں میں سے تھے۔ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ چنانچہ یوسفؑ نے اس کے مطالبے کو رد کردیا، اس کا اصرار بڑھتا گیا تو نوبت دست درازی تک پہنچی تو انہوں نے دیکھا کہ یہ میری بات پر متوجہ ہونے والی نہیں ہے۔ اگرچہ دروازے مقفل تھے لیکن ان کے ذمے یہ تھا کہ دروازے کی طرف جائیں، نکلنے کی کوشش کریں۔ متوکل علی اللہ وہ دروازے کی طرف دوڑے۔ دیکھ رہے تھے کہ دروازہ بند ہے تالا لگا ہوا ہے اور چابی زلیخا کے پاس ہے لیکن اللہ کے بھروسے پر چل پڑے۔

جب دوڑے تو اللہ کی شان ہے کہ دروازہ کھل گیا، دوسرے دروازے کی طرف بڑھے وہ بھی کھل گیا حتیٰ کہ ساتوں دروازے کھلتے چلے گئے۔ آگے آگے یوسفؑ تھے، پیچھے پیچھے زلیخا تھی۔ انہیں پکڑنے کے لیے۔ اس نے پیچھے سے اُن کا کُرتا پکڑا، روکنے کی کوشش کی تو کُرتا پیچھے سے پھٹ گیا۔ جب ساتواں دروازہ کھلا تو دونوں نے دیکھا عزیز مصر دروازے پر کھڑا ہے۔ یہ جو کتابوں میں قصے لکھے گئے ہیں کہ معاذ اللہ یوسفؑ کو زلیخا سے اتنا عشق تھا اور زلیخا کا عشق کامل تھا یہ سب غلط ہے۔ انہی پر افسانے لکھے گئے ہیں، قصے کہانیاں بنادی گئی ہیں، یہود ونصاریٰ کے اکٹھے کیے گئے جھوٹ نقل کردیے گئے ہیں۔

جب اس نے دیکھا کہ خاوند سامنے کھڑا ہے تو اس نے کہا قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ فوراً پلٹ کر کہنے لگی اس شخص کی اس کے علاوہ کیا سزا ہے جو تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اور دست درازی کرے، لہٰذا اس کی یہی سزا ہے کہ اسے قید کردیا جائے یا اسے دردناک سزائیں دی جائیں۔ یہ کون سی محبت تھی کہ جب خاوند کو دیکھا تو سارا الزام یوسفؑ پر ڈال دیا۔ اس کا مطلب ہے محبت نہ تھی۔ محبت ہوتی تو سارا الزام اپنے سر لیتی۔ محبت تو تھی ہی نہیں خواہش نفس تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے نفس کی خواہش کی تکمیل ہو۔ بہرحال یوسفؑ کو جیل بھیج دیا گیا۔ طویل عرصہ جیل میں رہنے کے بعد رہا ہوئے۔ یہ طویل قصہ ہے۔ بادشاہ نے

جیل سے بلوایا، بہت پذیرائی کی۔ آپؑ کی صلاحیتوں کا پہلے ہی معترف تھا۔ یوسفؑ کو دربار میں اہم مقام دیا۔ آپؑ نے بہت خوبی سے نظام سلطنت سنبھالا۔ بادشاہ نے حکومت وسلطنت آپؑ کے سپرد کردی۔ بادشاہ نے آپؑ کی بیعت کی پھر وہ آپؑ کی زندگی میں ہی فوت ہوگیا تو حکومت کلی طور پر آپؑ کے پاس آگئی۔

تو جب زلیخا نے خاوند کو دیکھا تو سارا الزام یوسفؑ پر لگا دیا۔ کہا یہ مجھ سے زبردستی کرنا چاہتے تھے۔ زیادتی کرنا چاہتے تھے تو ایسے بندے کی جو عزت پر ہاتھ ڈالے اور کیا سزا ہوسکتی ہے یا اسے جیل میں ڈالا جائے یا دردناک عذاب اور سزائیں دی جائیں۔ تو الزام لگنے پر یوسفؑ بول اٹھے، اپنی صفائی دینا سنتِ انبیاء ہے۔ یوسفؑ نے فرمایا میرا دامن صاف ہے۔ اس نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی ہے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ اب زلیخا اپنی بات پر اصرار کر رہی تھی کہ یوسفؑ نے میرے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوسفؑ فرما رہے ہیں ہرگز نہیں اس خاتون کی نیت خراب ہوگئی اس نے مجھے برائی میں پھنسانا چاہا اور میں اس سے بھاگ کر نکل رہا تھا۔ تو عزیز مصر شش و پنج میں پڑ گیا۔ ظاہر ہے حکمران تھا اس کے ساتھ کوئی دو چار لوگ اور بھی ہوں گے، اکیلا تو نہیں پھر رہا ہوگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ دونوں میں سے سچا کون ہے تو اس کے خاندان کا کوئی بچہ پنگوڑے میں پڑا تھا، وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا اسی کے خاندان کا کوئی بچہ تھا اس نے گواہی دی۔

چار بچوں نے چار آدمیوں کی برأت بیان کی ہے، جس کے بارے علماء فرماتے ہیں، یوسفؑ کی پاکدامنی کی شہادت شیر خوار بچے نے دی جو پنگوڑے میں پڑا تھا۔ حضرت مریمؑ کی پاکدامنی کی شہادت حضرت عیسیٰؑ نے دی جو نومولود تھے اور حضرت مریمؑ کی گود میں تھے۔ وہ بول اٹھے اور فرمایا میں اللہ کا نبیؑ ہوں۔ تیسرا شخص بنی اسرائیل کا ایک کامل ولی تھا، اس پر کسی خاتون نے الزام لگایا تھا۔ برائی تو وہ کہیں اور کرتی رہی پھر جب اس کے بچہ ہوگیا تو وہ اسے لے کر شاہی دربار میں چلی گئی کہ یہ جو بڑا پاکدامن بزرگ بنا ہوا ہے اس نے میرے ساتھ برائی کی ہے اور یہ اس کا بچہ ہے۔ انہیں طلب کیا گیا تو انہوں نے دعا کی۔ بارالٰہی اس بچے کو گویائی عطا کردے یہ بتادے کہ اس کا باپ کون ہے۔ تو وہ شیر خوار بچہ بول اٹھا کہ وہ فلاں چرواہے کا بیٹا ہے۔ ایک شیر خوار بچی فرعون کے محل میں تھی، اس کا نام ماشطہ لکھتے ہیں۔ جب وہ موسیٰؑ کو نکال کر لے گئے تو وہ بچی بھی فرعون سے ہمکلام ہوئی اور اس نے موسیٰؑ کے قتل سے فرعون کو منع کیا۔

یہ چار بچے تاریخ میں ملتے ہیں جنہوں نے چار لوگوں کی بے گناہی ثابت کی اور ان کی پاکدامنی کی شہادت دی۔ شہادت کے ضمن میں یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ قاضی کو صرف گواہوں کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے بلکہ آثار و قرائن بھی دیکھنے چاہیے۔ کہ جہاں واقعہ ہوا ہے وہاں کے آثار اور قرائن کیا بتاتے ہیں تو آثار و قرائن میں بہت سی

چیزیں آجاتی ہیں مثلاً دورِ حاضرہ میں زنا بالجبر کے لیے DNA کے ٹیسٹ سے مدد لی جاتی ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ زنا بالجبر کی جو شہادتیں اکٹھی کی جاتی ہیں ان میں DNA معتبر ہے۔ اور بعض علماء حضرات اس کی تردید کر رہے ہیں کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ DNA تو صرف یہ بتا سکتا ہے کہ یہ چیز یا یہ بال فلاں آدمی کا ہے لیکن یہ تو نہیں بتا سکتا کہ برائی مرضی سے ہوئی یا جبر سے۔ جو علماء اس کی تصدیق کرتے وہ یہ فرمائے تھے۔ کہ DNA یہ تو تصدیق کر دیتا ہے کہ بندہ یہی تھا۔ اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ رضامندی تھی یا جبر تھا، اس کے لیے دوسرے قرائن دیکھنے پڑیں گے۔ اسی طرح دوسری شہادتیں جمع کرنی پڑیں گی۔ DNA یہ تو واضح کر دیتا ہے کہ بندہ یہی تھا۔ اور اگر عورت سے زبردستی ہوئی تو اپنا دفاع کرے گی، لڑائی جھگڑا کرے گی، یا اس کے کپڑے پھٹیں گے یا مرد کے پھاڑ دے گی۔ یا کہیں اسے خراش لگ جائے گی یا اس کے ناخن کہیں لگ جائیں گے۔ اس کے ناخنوں میں جو چیز آجاتی ہے ان کا بھی DNA ٹیسٹ لیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی کے جسم کا حصہ ہے۔ تو دوسرے قرائن موجود ہیں جو یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ کام رضامندی سے ہوا ہے یا بالجبر۔ تو دلائل یہی شہادت دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو انگریزی قانون ہے، شرعی قانون نہیں ہے۔ ورنہ شرعی قانون میں قرائن و آثار اور جو کچھ وہاں حالات نظر آتے ہیں وہ بھی شرعی دلیل بن جاتے ہیں۔

تو اس بچے نے کہا کہ دیکھیں کہ اگر تو قمیض آگے سے پھٹی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ یوسفؑ نے زبردستی کی کوشش کی زلیخا نے رد کیا۔ اگر یوسفؑ کی قمیض پیچھے سے پھٹ گئی پھر تو یہ قصور خاتون کی طرف جاتا ہے۔ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ اگر قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یوسفؑ تو بھاگ رہے تھے اور یہ انہیں پیچھے سے پکڑ رہی تھی اس لیے قمیض پیچھے سے پھٹی۔ تو قمیض دیکھ لیجیے۔

یوسفؑ کی قمیض کے تین واقعات بھی بہت عجیب ہیں۔ جب بھائی قمیض اتار کر، خون آلود کر کے یعقوبؑ کے پاس لے گئے تو انہوں نے قمیض سے اندازہ لگایا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں کہ بیچ میں سے، بچہ تو بھیڑیے نے نکال لیا اور قمیض سلامت رہی۔ خون سے بھر گئی لیکن پھٹی نہیں۔ تب بھی وہ شہادت حضرتؑ کی قمیض بنی۔ جب زلیخا نے الزام لگایا تو پھر آپؑ کے کُرتے نے شہادت دی اور پھر یعقوبؑ کی بینائی کی بات آئی تو آپؑ نے اپنا کُرتا مبارک ہی بھیجا تھا اور فرمایا تھا میرا کرتا لے جاؤ میرے والد گرامی کی آنکھوں پر پھیر دو، ان کی آنکھیں درست ہو جائیں گی۔

یوں تین مرتبہ اس کُرتے کے ذریعے یہ عجائبات ظاہر ہوئے۔ جس کو جو نعمت ملتی ہے اللہ کی تقسیم سے ملتی ہے، یوں اللہ اپنے بندوں کو مختلف انداز سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دوپٹے کا ملتا ہے کہ یوم بدر جو جھنڈا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ تھا وہ حضرت عائشہؓ کا دوپٹہ تھا۔ یوم بدر وہ دن ہے جس نے حق و باطل میں حدِ فاصل قائم کی۔ مظلوم و ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت کی، ظالم کو خاک و خون میں لوٹا دیا۔ مظلوموں کو زندگی عطا کی اور طاغوت کو موت کی نیند سُلا دیا۔ جابر کا سرنگوں کر دیا اور مظلوموں کی حمایت کر کے انہیں حقوق دلوائے۔

معرکہ خیبر میں جو جھنڈا حضرت علیؓ کے ہاتھوں میں تھا، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا کیا تھا وہ بھی حضرت عائشہؓ کا دوپٹہ تھا۔ جس روز مکہ فتح ہوا اس روز بھی جو جھنڈا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا وہ بھی حضرت عائشہؓ کا دوپٹہ تھا۔

یہ اللہ کریم کی عطا ہے کہ کس کس بندے کو کیا کیا عطا فرماتے ہیں۔ تو یوسفؑ کے کُرتے نے بھی اسی طرح تین جگہ عجیب کام کیا۔

اگر ایک نومولود، شیر خوار بچہ ایسے ہی کہہ دیتا کہ یہ بے گناہ ہے تو کافی تھا لیکن اللہ کریم کی سنت ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے، اللہ کریم اسباب مہیا فرماتے ہیں۔ تو بچے نے کہا بھئی آثار دیکھ لو، یوسفؑ کا کُرتا پھٹا ہوا ہے، تو دیکھ لو اگر آگے سے پھٹا ہے تو پھر زلیخا سچی ہے انہوں نے زبردستی کی کوشش کی اور اس نے دفاع کیا۔ اور اگر کُرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو ظاہر ہے انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی اور زلیخا نے پیچھے سے پکڑا۔ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ جب عزیز مصر نے دیکھا کہ کُرتا تو پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو کہنے لگے بات صحیح ہے یہ بے گناہ اور بے قصور ہے۔ ان کا دامن صاف ہے تو نے زبردستی کرنے کی کوشش کی اور یہ تیری چال ہے۔ 'كَيْدِكُنَّ' یہ تیرا مکر ہے چال ہے، تو نے یہ چال چلی ہے سب الزام ان پر رکھ رہی ہے۔ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ تم عورتیں بہت بڑے بڑے مکر کرتی ہو۔ حالات اور واقعات کچھ ہوتے ہیں تم رو پیٹ کر کچھ اور بنا دیتی ہو۔ چیخ چلا کر اپنی بے گناہی ثابت کر دیتی ہو۔ تم بہت بڑے بڑے مکر کرتی ہو۔ تمہاری چالاکیاں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ تو عزیز مصر کہنے لگا کہ یوسفؑ آپ درگزر فرمائیں میری عزت کا معاملہ ہے۔ لوگ سنیں گے، شہر سنے گا وہ کیا کہیں گے کہ حکمران کی بیوی کا کیسا کردار ہے، اس سے میری توہین ہوگی۔ اس لیے آپ میرے ساتھ کرم فرماتے ہوئے اس بات کو بھول جائیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور بیوی سے کہا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـــِٕيْنَ ﴿۲۹﴾ اپنی برائی کی معافی مانگ، مجھ سے بھی معافی مانگ اور عوام کی جو تو ملکہ بنی ہوئی ہے تو لوگوں سے بھی معافی مانگ۔

چونکہ زلیخا مسلمان نہیں تھی، اللہ پر اس کا ایمان نہیں تھا اس لیے اسے کہا کہ معاشرے سے یا یوسفؑ سے بھی معافی مانگ اور مجھ سے بھی کہ اُن پر تو نے الزام لگانے کی کوشش کی، اور میری عزت خاک میں ملا دی۔ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـــِٕيْنَ اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ غلطی سراسر تمہاری ہے۔

سورۃ یوسف رکوع 4 آیات 30 تا 35

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۫ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

اور شہر کی (امراء کی) عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اپنے مطلب کے لئے پھسلاتی ہے اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے بے شک ہم تو اس عورت کو صریح غلطی پر دیکھتی ہیں ﴿۳۰﴾ پس جب اس عورت نے ان عورتوں کی چال کی یہ بات سنی تو ان کو دعوت پر بلا بھیجا اور ان کے لئے تکیہ (مسند) لگایا اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی (پھل کاٹنے کو) اور ان (یوسف علیہ السلام) سے کہا

ان کے سامنے باہر آئیں پس جب عورتوں نے ان کو دیکھا تو ان کو بہت بڑا (حسین) پایا اور (پھل کاٹتے ہوئے) اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہنے لگیں پاکی ہے اللہ کے لیے یہ شخص (ہرگز) بشر نہیں مگر کوئی بزرگ فرشتہ ہے ﴿۳۱﴾ اس نے کہا پس یہی شخص ہے جس کے بارے تم مجھے ملامت کرتی ہو اور یقیناً میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا پس یہ پاک صاف رہا اور اگر آئندہ میرا کہنا نہیں مانے گا تو ضرور قید کر دیا جائے گا اور بے عزت ہوگا ﴿۳۲﴾ انہوں (یوسف علیہ السلام) نے دعا کی اے میرے پروردگار! جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت تو جیل جانا مجھے زیادہ پسند ہے اور اگر آپ ان کے فریب کو مجھ سے دور نہیں فرمائیں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں سے ہو جاؤں گا ﴿۳۳﴾ پس ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمالی پھر ان (عورتوں) کے مکر کو ان سے دور فرما دیا۔ بے شک وہ بڑے سننے والے جاننے والے ہیں ﴿۳۴﴾ پھر باوجود اس کے کہ وہ لوگ نشانیاں دیکھ چکے تھے ان کی رائے یہی ٹھہری کہ ان کو کچھ عرصہ تک قید رکھا جائے ﴿۳۵﴾

تفسیر و معارف

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

جب یوسفؑ کے ساتھ یہ واقعہ ہو چکا اور عزیز مصر کو شہادت بھی مل گئی، آثار و قرائن سے بھی ثابت ہو گیا کہ یوسفؑ بے گناہ ہیں۔ تو اس نے کہا کہ یوسفؑ بے گناہ ہیں اور زلیخا سے کہا کہ تم کو معافی مانگنی چاہیے مجھ سے بھی اور یوسفؑ سے بھی۔ اور یہ سب تمہارا مکر اور تمہاری چال ہے اور یوسفؑ سے بھی عرض کی کہ وہ درگزر فرمائیں تو بات تو ختم ہو گئی لیکن بُھن گُن نکل گئی۔ امراء میں سے جو بادشاہ کے ساتھ تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہی، اس کی بیوی نے دوسرے امراء کی بیویوں کو بتا دی۔ اس طرح سے بات پھیل گئی اور امراء کی بیویوں میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ دیکھو عزیز مصر کی بیوی ہے اور ایک زرخرید غلام کو دعوتِ گناہ دے رہی ہے، حد سے نکل

رہی ہے۔ نوکر اور غلام تو امراء کے گھروں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ تو یہ کیا طریقہ ہوا کہ ایک حکمران کی بیوی غلام پر فدا ہو جسے وہ خرید کر لایا اور یہ تو اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے۔ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۚ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ہمارے خیال میں تو یہ بہت زیادہ بھٹک گئی ہے۔ اس نے نہ تو اپنے مقام و مرتبے کا خیال کیا نہ بادشاہ کی عزت کا۔ عورتوں کی باتیں زلیخا تک بھی پہنچ گئیں۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ تو عورتوں نے بھی ایک چال چلی اور زلیخا سمجھ گئی کہ یہ ان کا ایک مکر ہے۔ جب انہوں نے یہ بات سنی، تو چونکہ یوسفؑ کو کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ بڑے ناز اور بڑی احتیاط سے ان کی پرورش کی تھی اور سب سے چھپا کر رکھا تھا تو زلیخا سمجھ گئی کہ یہ باتیں جو عورتیں کر رہی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ دیکھنا چاہتی ہیں کہ آخر وہ کون سی ہستی ہے، کتنا خوبصورت نوجوان ہے، اس میں کیا کمال ہے کہ عزیز مصر کی بیوی پھسل گئی۔ تو قرآن نے فرمایا فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ ان کی بھی ایک چال تھی اور زلیخا کی بھی ایک چال تھی کہ وہ اس بہانے یوسفؑ کو دکھانا چاہتی تھی، تو اس نے ان سب کو دعوت پر بلا لیا

اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا اور بہت بڑی دعوت کی جس میں طرح طرح کے کھانے تھے۔ لیکن اس نے خصوصی اہتمام یہ کیا کہ پھل پیش کیے اور پھل کاٹنے کے لیے انہیں تیز چھریاں بھی دیں۔ سب کے سامنے ایک ایک چھری بھی رکھ دی اور جب وہ کھانے کی چیزیں گوشت یا پھل کاٹنے لگیں تو یوسفؑ کو کہا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ کہ اب آپ ان کے سامنے آ جائیں۔

صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں کہ یوسفؑ کا حسن ایسا تھا کہ کسی کمرے میں داخل ہوتے تو دیواریں بھی چمک اٹھتیں، روشنی ہو جاتی جیسے کوئی سورج اندر داخل ہو گیا ہو۔ عورتیں تو کھانے میں مشغول تھیں کہ اچانک یوسفؑ کمرے میں داخل ہوئے تو ان عورتوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ۔ جب دیکھا تو انہیںؑ بے حد حسین پایا اور اس قدر محو ہو گئیں کہ ہوش نہ رہا حتیٰ کہ جو پھل یا کھانے کی چیز کاٹ رہی تھیں اس کی بجائے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ کیونکہ ساری توجہ اُدھر ہو گئی تو چھری ہاتھ پر چل گئی اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا کہنے لگیں، اللہ کی پناہ، یہ شخص انسان نہیں ہے۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾ یہ تو کوئی بہت ہی بزرگ فرشتہ ہے۔

ایمان بالرسالت کے بغیر ایمان باللہ مکمل نہیں:

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ کہنے لگیں پاکی ہے اللہ کے لیے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ اپنے طور پر اللہ کو بھی مانتے تھے اور فرشتوں کو بھی، لیکن اپنے انداز سے مانتے تھے۔ جہاں تک ایمان باللہ کا تعلق ہے تو ہمارے فقہا لکھتے ہیں کہ بچے کو جب اللہ کا تصور دیا جائے تو اسے یہ تاکید کی جائے کہ میں اس اللہ کو مانتا ہوں جیسا کہ حضرت محمد ﷺ مانتے ہیں، جو مکہ میں پیدا ہوئے، جنہوں نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم مانتے ہیں اور جس طرح منواتے ہیں میں اسی طرح سے اُس کو اللہ مانتا ہوں۔ جو کچھ ذات وصفات باری کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، اسی طرح سے ماننا اسلام ہے۔ اور اپنے تصور سے، اپنے انداز سے ماننا ایمان نہیں ہے۔ یوں تو سب کو مجبوراً ماننا پڑتا ہے کہ ایک طاقت ایسی ہے جو سب پر حاوی ہے اور سب پر قادر ہے اور سب سے اعلیٰ ہے۔ بتوں کے بچاری بھی اسی لیے کہا کرتے ہیں مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر: 3) ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب لے جاتے ہیں۔ تو بت پرستی میں بھی اللہ کی عظمت کا ایک تصور انہوں نے بنا رکھا ہوتا ہے۔ لوگ دیوی، دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور ساتھ ہی 'مہادیو' کے نام سے ایک بڑی طاقت کو مانتے ہیں جو ان دیوی دیوتاؤں کا بھی معبود ہے اور سب سے طاقتور ہے۔ تو اپنے اپنے انداز سے اللہ کو ماننا ایمان نہیں ہے۔ ایمان وہ حقیقت ہے کہ جس طرح اللہ کا نبیؐ منواتا ہے اسی طرح مانا جائے۔ تو انہوں نے بھی کہہ دیا قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ، اللہ کے لیے پاکی ہے، اللہ پاک ہے۔ اب یہ بات تو وہ بھی مانتی تھیں کہ اللہ قادر ہے، بے نیاز ہے لیکن اپنے انداز سے مانتی تھیں۔ اور فرشتوں کی بھی قائل تھیں کہ کہنے لگیں یہ کوئی انسان تو نہیں ہو سکتا، کوئی عام فرشتہ بھی نہیں، بلکہ کوئی بزرگ و برتر اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ کوئی بہت بزرگ اور فرشتوں کا بھی کوئی سردار فرشتہ ہے۔

عورتوں کے مکر:

تب زلیخا نے کہا یہی ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم مجھ پر طعن کرتی ہو، اب تم نے بھی دیکھ لیا۔ تمہارے بھی ہاتھ زخمی ہو گئے اور ہوش اڑ گئے۔ تو اگر میرا پاؤں پھسل گیا تو اس پر طعنے کیوں دیتی ہو۔ اور پھر کہنے لگی وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ میں نے اسے بہکایا ہے، اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بالکل پاک رہا۔ کسی طرح کا اعتراض اس کی ذات پر وارد نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی لیکن یہ بالکل معصوم رہا۔ لیکن میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ جو

میں کہہ رہی ہوں، اگر ایسا نہیں کرے گا تو میں اسے جیل میں ڈال دوں گی اور یہ وہاں بہت رسوا ہوگا۔ بہت دُکھ اور تکلیفیں اٹھائے گا۔

بادشاہوں کی جیلیں بھی بڑی سخت ہوا کرتی تھیں اور وہاں انسانوں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ تو وہ عورتیں بھی یوسفؑ کو بہکانے لگیں۔ وہ اپنے لیے تو نہیں کہہ سکتی تھیں لیکن وہ یہ مشورہ دینے لگیں کہ زلیخا کی بات یوسفؑ کو مان لینی چاہیے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ شاید انہیں یہ خیال تھا کہ بندہ جب ایک گناہ کرتا ہے تو اور بھی بہت سے گناہ کر لیتا ہے۔ اگر یہ زلیخا کی بات مان لے گا تو کبھی ہماری باری بھی آجائے گی۔ ذرا گناہ شروع تو کرے، تو سب خواتین نے اس پر اصرار شروع کر دیا۔ کہنے لگیں ایسی کیا بات ہے، معاشرے میں ایسا ہوتا رہتا ہے یہ فطری عمل ہے۔ قدرت کا بنایا ہوا ایک عمل ہے۔ مرد اور عورت کو اس نے جوڑا بنایا ہے، دونوں کا ملنا عجیب بات نہیں ہے۔ اور پھر زلیخا نے آپ پر بڑے احسان کیے ہیں بڑی محنت سے آپ کی پرورش کی ہے۔ بہترین ماحول مہیا کیا ہے، تو آپ زلیخا کی اتنی سی بات نہیں مانتے۔ پھر دھمکایا بھی کہ آپ کو مصر کی جیلوں کا پتہ ہے، لوگ مصر کی جیلوں میں جاتے ہیں تو کم ہی واپس آتے ہیں، اور قید ہی میں مر جاتے ہیں۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، تو جیل سے بھی بچو اور زلیخا کی آرزو بھی پوری کر دو۔ اور جب یوسفؑ نے یہ دیکھا کہ ساری عورتیں مل کر ان کے پیچھے پڑ گئی ہیں تو دعا فرمائی قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡهِ ۚ اے میرے پروردگار یہ جو ساری عورتیں گناہ پر مائل کرنے کے لیے تل گئیں ہیں، اس کام کی نسبت مجھے جیل جانا پسند ہے۔ مجھے جیل میں بھجوا دیں اور ان سے مجھے بچا لیں۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیہ کریمہ پر فرمایا میرے بھائی یوسفؑ نے جیل کیوں مانگی، عافیت کیوں نہیں مانگی، کہ اللہ مجھے ان سے بچا لے۔

کسی صحابیؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ دعا مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ مجھے صبر عطا فرما، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم مصیبت طلب کر رہے ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں صبر مانگ رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبر تب ہی کرو گے نا جب کوئی مصیبت آئے گی تو اللہ سے صبر نہ مانگو، بلکہ اللہ سے عافیت مانگو۔ کیونکہ وہ ہر دکھ سے محفوظ رکھتے ہیں۔ تو یہاں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'میرے بھائی یوسفؑ نے عافیت کیوں نہ مانگی'۔ جو صورتِ حال وہاں تھی اور جس طرح سارے امراء کی عورتیں مل کر زلیخا کا ساتھ دے رہی تھیں اور انہیںؑ پریشان کر رہی تھیں تو انہیں اللہ کی نافرمانی کے مقابلے میں مصر کی جیل بہتر لگی۔ دنیا کا دکھ جتنا بھی ہو، گزر جائے لیکن اللہ کی نافرمانی نہ ہو۔ دنیا کے سارے دکھ عارضی ہوتے ہیں، لمحاتی ہوتے ہیں۔ دنیا خود فانی

ہے۔اس کے دکھ بھی فانی، سکھ بھی فانی۔انجام تو اللہ کے ہاں آخرت میں ہے۔

آپؑ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا، اگر آپ میری مدد نہیں فرمائیں گے اور یہ مصیبتیں میرے سر سے نہیں ٹالیں گے تو میں بھی انسان ہوں کہیں میرا ہی پاؤں نہ پھسل جائے اور میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں۔اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر میں بھی جاہلوں میں شامل ہو جاؤں گا۔

یہاں علماءِ تفسیر لکھتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی گناہ کرے تو اس وقت وہ جاہل ہوتا ہے کہ گناہ جہالت ہے۔جب وہ گناہ کرتا ہے تو اس کے پاس علم نہیں ہوتا تب وہ بھی جاہل ہو جاتا ہے۔

یہ محض علم کی یا جاننے کی بات نہیں ہے، اللہ کا نبیؑ فرما رہا ہے کہ اگر میرا پاؤں پھسل گیا مجھ سے بھی جہالت سرزد ہو گی گویا اللہ کی نافرمانی سب سے بڑی جہالت ہے۔ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾ ان کے پروردگار نے ان کی بات مان لی۔اللہ کریم نے قبول فرمائی۔یہ اللہ کا ایک نظام تھا کہ انہیں باپ کے پیار سے محروم کیا پھر بھائیوں سے بھی انہیں دکھ ملا۔انہیں غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔جنہوں نے خریدا انہوں نے بڑے ناز و نعم سے پرورش کی لیکن بالآخر وہ عورت دعوتِ گناہ پر آگئی۔تو ان سب حالات سے گھبرا کر آپؑ نے فرمایا کہ یا اللہ اس سارے گورکھ دھندے سے تو جیل ہی بہتر ہے۔آپ مجھے جیل ہی بھجوا دیں، میں ان کے سارے فریب اور مکاری سے بچ جاؤں۔اللہ کریم نے ان کی بات قبول فرمائی اور ان عورتوں کا سارا مکر آپؑ سے دور کر دیا۔وہ ذات ایسی ہے کہ ہر بات کو سنتی ہے،اور ہر بات کو جانتی بھی ہے، ہر حال سے واقف بھی ہے اور جو کچھ عرض کرتے ہیں وہ ذاتی طور پر جاننا بھی ضروری ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ اگرچہ عزیزِ مصر نے ساری نشانیاں، سارے حالات دیکھ لیے تھے۔ساری تحقیق کر لی تھی اور جانتا تھا کہ یوسف بے قصور ہیں، اس کے باوجود جب اس تک امراء کی بیویوں کی یہ بات پہنچی کہ زلیخا کا بھی اتنا قصور نہیں ہے۔وہ بندہ ہی ایسا ہے کہ ہوش گم کر دیتا ہے، تو عزیزِ مصر نے مناسب یہ سمجھا کہ یوسفؑ کو جیل بھیج دیا جائے۔تو عوام میں بھی یہ بات مشہور ہو جائے گی کہ قصور انہی کا تھا۔کہ انہیں جیل بھیجا گیا، اور بات بھولی بسری ہو جائے گی۔شاہی جیلوں کا نظام فرمانِ شاہی پر تھا، بادشاہ کہتے تھے کہ جیل میں بند کر دو تو کر دیا جاتا۔پھر بادشاہ کو خیال آئے تو آئے ورنہ جیل ہی میں عرصہ گزارے۔تو اس نے حکم دیا کہ ان کو جیل میں قید کر دیا جائے، تو قید کر دیئے گئے۔اس کا خیال تھا کہ جب بات بھولی بسری ہو جائے گی اور قصہ ختم ہو جائے گا تو پھر آزاد کر دیں گے۔جدھر چاہے جائیں یا جیل میں ہی مر گئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔چنانچہ آپؑ کو جیل میں قید کر دیا گیا۔

اب یہ جیل جانا بھی آپؑ کی تربیت کا ایک حصہ تھا۔منجانب اللہ یہ طے تھا کہ وہ سارے دکھ جھیل کر آئیں۔

سورۃ یوسف رکوع 5 آیات 36 تا 42

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ
الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا
بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۳۶ قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ
اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ
تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۷
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ
بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝۳۸ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۳۹ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا
تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۴۰
یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ
فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ۝۴۱ وَقَالَ
لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ
رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ۝۴۲

اوران کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل میں داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں خود کو دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں خود کو دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں ان میں سے پرندے کھا رہے ہیں ہمیں اس کی تعبیر بتا دیجیے کہ بے شک ہم آپ کو (پر خلوص) نیکو کار سمجھتے ہیں ﴿۳۶﴾ انہوں نے فرمایا کھانے کے لیے تمہیں جو کھانا ملتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تمہیں بتا دوں گا یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں۔ یقیناً میں نے تو ان لوگوں کا مذہب چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ لوگ آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں ﴿۳۷﴾ اور میں اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب (علیہ السلام) کے دین کی پیروی کرتا ہوں ہمیں زیبا نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک کریں یہ اللہ کا ہم پر فضل ہے اور لوگوں پر بھی ولیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۳۸﴾ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا الگ الگ آقا اچھے ہیں یا اللہ جو یکتا ہیں (جو سب سے) زبردست ہیں ﴿۳۹﴾ تم لوگ اس کو چھوڑ کر صرف چند (بے حقیقت) ناموں کی عبادت کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی حکم صرف اللہ ہی کا ہے اس نے فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے ولیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۴۰﴾ اے قید خانہ کے ساتھیو! تم میں ایک تو (بری ہو کر) اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا اور جو دوسرا ہے سو وہ سولی دیا جائے گا پھر اس کے سر میں سے پرندے کھائیں گے جو بات تم مجھ سے پوچھتے تھے اس کا فیصلہ ہو چکا ﴿۴۱﴾ اور دونوں میں سے جس کے بارے انہیں خیال تھا کہ رہائی پا جائے گا اس سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر بھی کرنا سو شیطان نے اسے اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا پھر وہ (یوسف علیہ السلام) چند برس جیل میں ہی رہے ﴿۴۲﴾

تفسیر ومعارف

آپ کا شہرہ تو جیل میں بھی پہنچ گیا، اور پھر آپؑ کی ذات بھی ایسی تھی، حسن و جمال ایسا تھا کہ جہاں جاتے مخلوق دنگ رہ جاتی۔ چرچا ہوتا تھا، یہ کون شخص ہے کیسا ہے اور پھر آپؑ کے دعویٰ نبوت کی بات ہوتی کہ آپؑ خود کو اللہ کا نبیؑ کہتے ہیں، اور واقعی بہت کریم النفس، صالح اور بھلے انسان ہیں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِىْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

جب آپؑ جیل میں گئے تب بادشاہ نے دو اور نوجوان بھی جیل میں بھیج دیے۔ ایک ساقی تھا جو بادشاہ کے مشروب بناتا تھا اور ایک باورچی تھا جو کھانا تیار کرتا تھا۔ کہیں شکایت ہوئی یا بادشاہ کو شبہ ہوا کہ کھانے میں زہر ملانے کی کوشش کی گئی ہے اور ان دونوں پر شبہ تھا۔ لہٰذا دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ اب ان دونوں کو مذاق سوجھا، چونکہ عظمتِ نبوت سے نا آشنا تھے، تو انہوں نے کہا کہ اس اللہ کے بندے کا بڑا شہرہ ہے علمِ تعبیر کا ماہر ہے تو چلو دیکھیں اس کے پاس تعبیر کا کتنا علم ہے۔

ان دونوں نے اپنی طرف سے خواب گھڑ لیے۔ ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں جام میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے سر پر بڑا سا ٹوکرا ہے جو روٹیوں سے بھرا ہوا ہے اور کوے اور چیلیں جھپٹ جھپٹ کر وہ روٹیاں کھا رہی ہیں۔ آپ ہمیں بہت اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ نیک، شریف اور بھلے انسان لگتے ہیں تو آپؑ ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتا دیں۔ اب آپؑ تو اللہ کے نبیؑ تھے لہٰذا اللہ نے ان پر بات منکشف کر دی۔ انہیں بات کی سمجھ آ گئی کہ یہ تو میرا مذاق اڑانا چاہتے ہیں اور خواب گھڑ کر آئے ہیں۔ اللہ کریم نے ان دونوں کا مستقبل یوسفؑ پر منکشف کر دیا جو خواب انہوں نے اپنی طرف سے گھڑے تھے یوسفؑ نے انہیں تعبیر بھی اسی طرح کر دی۔ لیکن انہیں سمجھایا کہ اللہ کے بندوں کی تحقیر نہیں کی جاتی، ان کا مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

آپؑ نے فرمایا خواب تو خواب ہے۔ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں ان کے بارے بھی اللہ نے مجھے اتنا علم دیا ہے کہ اس سے پہلے کہ تمہارا کھانا آئے میں یہ بتا سکتا ہوں کہ تمہارے لیے کھانے میں کیا آئے گا۔ وہ کیسا ہوگا، لذیذ ہوگا یا بے لذت ہوگا۔ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ کھانے کے بعد اس کا تم پر کیا اثر ہوگا۔ یہ کھانا بیماری کا سبب

بنے گا یا صحت افزا ہوگا۔ میں تمہیں یہ سب بتا سکتا ہوں۔ اللہ کریم جو علوم عطا فرماتے ہیں، اس کی طرف سے عطا ہوتے ہیں اور وہ خود جتنا چاہے، جب چاہے مغیبات پر مطلع فرما دیتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ نے لوگوں سے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ تم کیا کھا کر آئے ہو اور گھر میں کیا چھوڑ کر آئے ہو۔ تو یہ انبیاء کے معجزات ہوتے ہیں، ان کی نبوت کو منوانے کے لیے ہوتے ہیں۔ یوسف نے فرمایا کہ تمہارا کھانا آنے سے پہلے بتا سکتا ہوں کہ کیا آ رہا ہے، کیسا ہے اور اس کے اثرات کیسے ہوں گے۔ نتائج کیا ہوں گے۔ یہ اس لیے نہیں کہ میں عامل ہوں، کوئی عمل کرتا ہوں بلکہ میرے پاس یہ سارے کلمات اس لیے ہیں کہ میرے پروردگار نے مجھے یہ سب کچھ سکھایا ہے۔ ان سب باتوں کا علم میرے پروردگار نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ اور اسی علم کی بدولت میں نے اللہ کا انکار کرنے والوں، بت پرستوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے عطا ہونے والے علوم اور ان کے کمالات کا ماحصل ہدایت ہے۔ کیونکہ جتنے کمالات انبیاء کرام کو عطا ہوتے ہیں، وہی کمالات باتباع نبیؐ اہل اللہ کو ان کی حیثیت و مقام کے مطابق ملتے ہیں۔ اور ان کمالات کا حاصل یہ ہے کہ ایمان باللہ مضبوط ہوتا ہے اور کفر کا انکار نصیب ہوتا ہے۔ بندہ برائی سے دور ہو جاتا ہے۔

کمالات کا معیار:

یہ ایک معیار بھی بن گیا کہ شعبدہ باز کتنے ہی شعبدے اور عجائبات دکھاتا رہے اسے ولی اللہ نہیں مانا جا سکتا۔

ولایت یہ ہے کہ ان علوم کی بدولت وہ خود بھی صاحب ایمان، صاحب کردار ہو۔ اس کا ایمان مضبوط ہو اور کردار صالح ہو اور جو اس سے ملے اس کا بھی ایمان مستحکم ہوتا جائے، کردار درست ہوتا جائے، تو یہ بھی شعبدے اور کرامت میں حدِ فاصل ہوگی۔ ورنہ عجائبات تو کسی سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ شعبدہ بازوں، جادوگروں سے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ ہدایت نہیں ہوتا۔ شعبدہ باز لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، لوگوں کا مال بٹورتا ہے اور لوگوں کو اپنی پوجا پر لگا دیتا ہے۔ اپنا غلام بنا لیتا ہے۔

جب اللہ کریم کی طرف سے کسی کو کوئی کمال عطا ہوتا ہے اور جب وہ کمال ظاہر ہوتا ہے تو دوسروں کی بھی ہدایت کا سبب بن جاتا ہے لوگوں کے عقائد اور اعمال کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

ولی اللہ کی کرامت:

اگر ایسی کوئی عجیب بات کسی صحیح العقیدہ، نیک اطوار بندے سے سرزد ہو اور اس سے وابستہ لوگوں کے ایمان مضبوط ہونا شروع ہو جائیں تو یہی ولایت ہے۔ یہ ولی اللہ کی کرامت ہے۔

استدراج:

اگر عجائب دکھانے والا خود بھی گمراہ ہو، اور اپنے ساتھ وابستہ لوگوں کو بھی گمراہ کر دے تو یقیناً وہ شعبدہ باز ہے اور ایسے عجائبات کو اصطلاحِ شریعت میں استدراج کہتے ہیں۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

فرمایا علوم نبوت کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے کفار اور بدکاروں کا ساتھ چھوڑ رکھا ہے، اس کی بات قبول نہیں کرتا۔ اور میں اپنے آباء و اجداد کی ملت کا اتباع کرتا ہوں۔ اور میرے آباء و اجداد کوئی عام لوگ نہیں تھے، بہت اعلیٰ خاندان کے سرکردہ افراد تھے۔ میرے پردادا ابراہیمؑ، دادا اسحٰقؑ اور یعقوبؑ میرے والد ہیں۔ یہ تینوں اپنے اپنے زمانے میں اللہ کے نبیؑ اور رسولؑ تھے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے نبوت ہمیشہ اعلیٰ خاندان میں رکھی ہے۔ اعلیٰ خاندان سے مراد دولتمند خاندان نہیں بلکہ اس سے مراد اعلیٰ خصائل و اعلیٰ اقدار کے حامل خاندان ہیں۔ انبیاءؑ غریب ہو سکتے ہیں لیکن خاندانی ہوتے ہیں اور ان کی خاندانی اقدار نہایت اعلیٰ ہوتی ہیں۔ ان کا خاندان ایسا ہوتا ہے جس کی پیروی کرنے میں لوگ عار نہیں سمجھتے جبکہ عام لوگوں کی پیروی کرنا دوسرے لوگوں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ تو مجھ سے بھی کم تر ہے۔ اور کم تر درجے کا خاندان ہے تو اس کے پیچھے کیوں چلوں۔

یہ قانون الٰہی ہے کہ انبیاءؑ ہمیشہ اعلیٰ خاندانوں سے ہوتے ہیں اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ اولیاء اللہ جنہیں مناصب عطا ہوتے ہیں وہ سب بھی اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قانون الٰہی ہے۔ اعلیٰ، ادنیٰ سب اللہ کی مخلوق ہے، سب اس نے خود بنائے ہیں لیکن لوگ اپنے مزاج و کردار سے پہچانے جاتے ہیں۔ اعلیٰ خاندان وہ کہلاتے ہیں جو اعلیٰ کردار، اعلیٰ مزاج اور نیک اطوار ہوں۔

تو آپؑ نے فرمایا کہ میں تو بڑے اعلیٰ خاندان کا فرد ہوں اور میرے آباء و اجداد قابلِ اتباع لوگ تھے۔ سب اللہ کے نبیؑ تھے اور میں انہی کا راستہ اختیار کرتا ہوں۔ انہی کے پیچھے چلتا ہوں۔ اور ہمیں تو یہ زیب ہی نہیں دیتا۔ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۭ ہمارے ساتھ تو یہ چیزیں جچتی ہی نہیں کہ ہم کسی شئے کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔

ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ اور ہم پر یہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے، احسان ہے جس نے

ہمیں یہ فضیلت عطا فرمائی اور یہ فضیلت عام ہے، جو قبول کرے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے۔ جو توحید باری کا اقرار کرے، اس کے نبیؐ کا اتباع کرے، اس کی اطاعت کرے اس کو بھی اعلیٰ درجات عطا فرما دیتا ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴿۳۸﴾ لیکن لوگوں کی اکثریت ناشکرگزار ہے۔ اللہ کریم کی طرف سے ہدایت کے اسباب کا عطا ہونا بھی اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے، اور اس کا شکر یہ ہے کہ اُن اسباب کو اختیار کیا جائے۔ ایمان لایا جائے اور اتباع کیا جائے تو یہ شکر کی ادائیگی ہے۔ لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں، ناقدری کرتے ہیں۔

اللہ کتنے کریم ہیں کہ عام لوگوں کے لیے انبیاءؑ کو علوم و برکات کے خزانے عطا فرما کر کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ جو ان کے در پر آ جائے بچہ، بوڑھا، عالم، جاہل، مرد، عورت اس کا دامن برکات سے بھر جاتا ہے۔ اگر ان برکات کو حاصل نہ کیا جائے تو یہ ناشکری ہے۔ جبکہ ان کی برکات کو حاصل کیا جائے، ان کا اتباع کیا جائے یہی طریقہ شکر ہے۔ لیکن لوگ شکر ادا نہیں کرتے بلکہ نعمتوں سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب کم ہیں جو ان سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔

پھر فرمایا يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴿۳۹﴾ اے میرے قیدی دوستو! ذرا تم یہ سوچ کر بتاؤ کہ در در پر جبہ سائی، سجدے کرنا، در در پر کاسے لیے پھرنا بہتر ہے یا ایک ہی دروازہ بہتر ہے رب العالمین کا جو ہر چیز پر قادر ہے۔ ہر چیز دے سکتا ہے۔ باقی بھی تو سب مخلوق ہے، جس کے دروازے پر بھی جاؤ وہ خود مخلوق ہے اور محتاج ہے۔ محتاج دوسرے کو کیا دے گا۔ جو خود اپنے وجود اور بقا کے لیے اللہ کا محتاج ہے۔ اللہ ہی وہ ہستی ہے کہ کسی کو کچھ دے تو بندے کو ملے اور واپس لے لے تو بندے کے پاس نہ رہے۔ وہ ایسا قادرِ مطلق ہے کہ گداگروں کو حکومتیں عطا کر دیتا ہے، حکمرانوں کو گداگر بنا دیتا ہے۔

تو شاہوں کو گدا کر دے، گدا کو بادشاہ کر دے
اشارہ تیرا کافی ہے گھٹانے اور بڑھانے میں

تو فرمایا ذرا تم سوچ کر بتاؤ یہ در در کی بھیک مانگنا اچھا ہے یا ایک اللہ کو جو واحد ہے اور زبردست ہے کو ماننا اچھا ہے۔

اور پھر فرمایا تمہارے پاس تو کوئی دلیل بھی نہیں مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴿۴۰﴾ تم جو غیر اللہ کی پوجا کرتے ہو اور معبود بنا رکھے ہیں، ان کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ تم نے اور تمہارے باپ دادا نے محض نام گھڑ لیے ہیں۔ اللہ نے اس کی کوئی دلیل نازل نہیں

فرمائی۔ کوئی آسمانی کتاب نہیں کہتی کہ اللہ کے سوا کسی کی پوجا کرو۔ کسی نبیؑ کی تعلیمات میں یہ بات نہیں ملتی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی جائے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ ؕ اللہ نے تو یہ حکم دیا ہے کہ سوائے اس کی ذات کے کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ اس کی ذات کے علاوہ کسی اور سے امیدیں نہ وابستہ کی جائیں اور نہ ہی کسی اور کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ یہی سدھا دین ہے، سچا اور کھرا دین ہے۔ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۰﴾ لیکن لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے لاعلم ہیں، جہالت میں ہیں، اس حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے۔ سب سے بڑی واضح اور روشن حقیقت یہ ہے کہ اللہ واحد ہے لاشریک ہے۔ اور اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے اس کے نبیؑ اور رسولؐ معبوث ہوتے ہیں اور بندوں کو اللہ کی عظمت سے آشنا کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ، باقی جتنے راستے ہیں وہ باطل ہیں اور ان کی کوئی دلیل نہیں۔

الغرض یوسفؑ نے تعبیر ارشاد فرمانے سے پہلے توحید باری کی دعوت دی، انبیاءؑ کے اتباع کی تلقین کی اور یہ واضح کیا کہ جو راستہ انبیاءؑ کے راستے کے علاوہ اختیار کیا جاتا ہے، خواہ کوئی اپنی دانست میں اسے انبیاءؑ سے منسوب بھی کرے مگر ویسا نہ مانے جیسا اللہ کے نبیؑ منوائیں تو وہ صاحب ایمان نہیں ہوسکتا۔ اور صرف اللہ کو ماننا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ماننے کے ساتھ اللہ کی اطاعت بھی کی جائے، اس کے احکامات پر عمل کیا جائے۔

ایمان کا گواہ کردار و اعمال ہوتے ہیں۔ اگر اعمال اس ایمان و عقیدے کے خلاف ہوں، اللہ کو ماننے کے دعوے کے ساتھ ساتھ بتوں کی پوجا بھی کی جا رہی ہو، بتوں سے امیدیں بھی وابستہ کی جا رہی ہوں تو یہ درست نہیں۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ اَمَّاۤ اَحَدُ کُمَا فَیَسۡقِیۡ رَبَّہٗ خَمۡرًا ۚ وَ اَمَّا الۡاٰخَرُ فَیُصۡلَبُ فَتَاۡکُلُ الطَّیۡرُ مِنۡ رَّاۡسِہٖ ؕ قُضِیَ الۡاَمۡرُ الَّذِیۡ فِیۡہِ تَسۡتَفۡتِیٰنِ ﴿۴۱﴾

پھر ان کے خوابوں کی تعبیر بتائی جو انہوں نے پیش کیے تھے۔ تم میں سے وہ جو خود کو جام میں شراب نچوڑتے دیکھ رہا تھا فَیَسۡقِیۡ رَبَّہٗ خَمۡرًا وہ اپنے بادشاہ کا ساقی بحال ہو جائے گا۔ اور پھر سے شراب پلانے پر مامور ہو جائے گا۔ وَ اَمَّا الۡاٰخَرُ اور دوسرا جس نے کہا تھا کہ میں نے سر پر روٹیوں سے بھرا ہوا ٹوکرا اٹھا رکھا ہے اور پرندے اس سے جھپٹ جھپٹ کر لے رہے ہیں فَیُصۡلَبُ اسے سولی دی جائے گی۔ اسے سزائے موت ہوگی اور وہ سولی پر لٹکتا رہے گا۔ فَتَاۡکُلُ الطَّیۡرُ مِنۡ رَّاۡسِہٖ ؕ اور پرندے اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

جب آپ نے یہ تعبیر دی تو وہ پریشان ہو گئے اور مذاق بھی اڑانے لگے اور کہنے لگے ہم نے تو خواب نہیں دیکھا۔ ہم نے تو محض باتیں گھڑ لیں تھیں آپؑ کا امتحان لینے کے لیے کہ آپؑ اس سے کیا سمجھتے ہیں تو آپؑ نے ہمارے

گھڑے ہوئے خوابوں کی تعبیر بتادی۔

حضرت یوسفؑ نے فرمایا! اگر تم خواب دیکھتے تو وہ ایک خواب ہوتا، لیکن جو بات تم نے گھڑ کر بتائی ہے وہ تمہارا ما فی الضمیر ہے۔ جو کچھ تمہارے دل میں آیا وہ تو خواب سے زیادہ مضبوط بات ہے۔ خواب تو غیر اختیاری ہوتا ہے۔ انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ کیا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی پسند کا خواب نہیں ہوتا۔ لیکن جو بات تم نے دل سے گھڑ کر بتائی ہے یہ تو تمہارا انتخاب تھا۔ تمہارا دل اس بات تک پہنچا۔ یہ تو خواب سے زیادہ مضبوط ہے لہٰذا میں نے جو تعبیر بتائی ہے یہ مجھے اللہ نے بتائی ہے۔ تم نے تو امتحان کے لیے بات گھڑی لیکن اب وہ تمہارے گلے پڑ گئی۔ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ جو تم پوچھنا چاہتے تھے اس کا فیصلہ ہوگیا۔ یہ اللہ کریم کا فیصلہ ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ یہ اللہ کی طرف سے مجھے بتایا گیا ہے، اور یہ طے ہو چکا اب ایسا ہی ہوگا۔ تم نے خواب دیکھا یا نہیں دیکھا، ایسا ہی ہوگا۔ اسی لیے علماءِ حق فرماتے ہیں کہ اہل اللہ کے ساتھ مذاق درست نہیں۔ سیدھی اور صاف بات کرنی چاہیے، وہ جو کہیں شائد پیش آجائے۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ. جس کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ وہ بری ہوجائے گا اور بادشاہ کا ساقی مقرر ہوگا، تو اس کو فرمایا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ اپنے بادشاہ کے پاس میری بات بھی کرنا کہ ایک شخص بلاقصور، بلاوجہ، بے گناہ جیل میں ہے تو آپؐ اس کے محسن بھی تھے۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ وسائل اختیار کرنا سنتِ انبیاءؑ ہے۔ حضرت یوسفؑ نے یہ سبب اختیار فرمایا اور کہا کہ تم بادشاہ کے قریب ہوگے، ساقی ہوگے، دن رات بادشاہ کے ساتھ ہوگے تو وہاں میری بات بھی کرنا فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ لیکن اسے شیطان نے یہ بات ہی بھلادی۔ چونکہ وہ باکردار لوگ تو تھے ہی نہیں، اور بدکردار لوگوں پر شیطان کا غلبہ ہوتا ہے تو پتہ چلا شیطان صرف گمراہ ہی نہیں کرتا، بلکہ اللہ کے نیک بندوں کے لیے پریشانیاں اور رکاوٹیں پیدا کرنے کی بھی کوششیں کرتا ہے۔ تو شیطان نے اسے یہ بات ہی بھلادی فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾ اور اس کے بعد بھی حضرت یوسفؑ کئی سال جیل میں رہے۔ یہ اللہ کریم کا اپنا پروگرام تھا، اس میں شیطان کی بہادری کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جب تک اللہ کریم نے چاہا جیل میں رکھا۔ جب جیل سے نکلنے کی باری آئی تو سیدھا شاہی محل پہنچادیا۔ بادشاہ کے پاس پہنچادیا۔

سورۂ یوسف رکوع 6 آیات 43 تا 49

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝۴۴ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝۴۵ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۴۶ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝۴۷ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝۴۸ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝۴۹

اور بادشاہ نے کہا میں نے (خواب) دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں ان کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور اس کے علاوہ خشک ہیں۔ اے سردارو! اگر تم خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہو تو مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ ﴿۴۳﴾ کہنے لگے یہ تو یونہی پریشان خیالات ہیں اور ہم لوگ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے ﴿۴۴﴾ اور وہ شخص جو دو قیدیوں میں سے رہا ہو گیا تھا بولا اور اسے مدت کے بعد (یوسف علیہ السلام کی بات کا) خیال آیا کہ میں آپ کو اس کی

تعبیر لا دیتا ہوں سو آپ مجھے جانے دیجیے ﴿۴۵﴾ (اے) یوسف (علیہ السلام) اے سچے! ہمیں (تعبیر) بتائیے کہ سات موٹی گائیوں کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے سرسبز ہیں اور ان کے علاوہ خشک ہیں تاکہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے ﴿۴۶﴾ انہوں نے فرمایا تم لوگ سات سال تک متواتر کھیتی کرو گے تو جب غلہ کاٹو تو تھوڑے سے غلے کے علاوہ جو تمہارے کھانے کے کام آئے اسے اس کے خوشوں میں رہی رہنے دینا ﴿۴۷﴾ پھر اس کے بعد سات برس ایسے سخت (خشک سالی کے) آئیں گے کہ اس (ذخیرہ) کو کھا جائیں گے جو تم نے ان (برسوں) کے لیے جمع کر کے رکھا ہو گا مگر تھوڑا سا جو تم بچا کے رکھو گے ﴿۴۸﴾ پھر اس کے بعد ایسا سال آئے گا کہ اس میں لوگوں پر خوب بارش برسے گی اور وہاں اس میں رس نچوڑیں گے ﴿۴۹﴾

تفسیر ومعارف

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

بادشاہ نے خواب دیکھا اور اہل دربار کو سنایا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات بہت کمزور اور دبلی گائیں ہیں۔ جو دبلی گائیں ہیں وہ موٹی گائیوں کو کھائے جا رہی ہیں۔ سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ اور میں نے دیکھا وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ کہ سات خوشے بڑے سرسبز اور صحت مند ہیں لیکن باقی سب بالکل خشک، ان میں کوئی دانہ نہیں تو اہل دربار سے جن میں راہب، مذہبی پیشوا یا اہل علم تھے ان سے کہا اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم جانتے ہو تو سوچ سوچ کر کہنے لگے قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ یہ بامعنی خواب نظر نہیں آتا۔ یہ پریشان خیالات ہیں جو متشکل ہو کر آپ کو خواب میں نظر آ گئے وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ اور ایسی باتوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ یہ محض پریشان خیال ہیں جن کی کوئی تعبیر ہمیں سمجھ نہیں آتی۔ اس وقت ساقی کو خیال آیا تو وہ فوراً بول اُٹھا، اسے اپنا خواب یاد آ گیا جو اس نے حضرت یوسفؑ کے سامنے بیان کیا تھا، اور انہوں نے جو اس کی تعبیر دی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ کیسے ان

دو ساتھیوں نے خود گھڑ کر خواب حضرت یوسفؑ کو سنائے تھے لیکن جو تعبیر انہوں نے دی تھی من وعن پوری ہوئی۔ ایک کو پھانسی ہوگئی اور وہ لٹکا دیا گیا اور اس کی نعش بھی کسی نے نہیں اتاری۔ پرندے نوچ نوچ کر اسے کھا گئے۔ اور یہ خود ساقی کے منصب پر بحال ہو گیا تو وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا تو وہ جوان میں سے نجات یافتہ تھا اسے بھی یہ بات ایک عرصے کے بعد یاد آئی۔ وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ اَنَا اُنَبِّئُکُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾ کہنے لگا بادشاہ سلامت میں آپ کو اس کی تعبیر لا دیتا ہوں، مجھے جانے دیجیے اسے یاد آ گیا کہ جیل میں ایک نوجوان ہے، بہت حسین وجمیل، بہت کریم باکردار، سچا اور کھرا، اس نے مجھے خواب کی تعبیر بتائی تھی۔ اگر مجھے اجازت ہو تو میں جیل جا کر اس سے پوچھ کر آپ کے خواب کی تعبیر لاتا ہوں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔

صادق وصدیق:

وہ جیل میں حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اے یوسفؑ! آپ بہت سچے انسان ہیں۔ آپؑ نے جو کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ آپؑ کی بات حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ آپ کھرے اور سچے انسان ہیں۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی واقعہ کو دیکھ کر من وعن بیان کرتا ہے تو وہ صادق ہوتا ہے۔ صادق وہ ہے جو ہر بات جو وہ دیکھے یا جو اس کے علم میں آئے اسے بلا کم وکاست صحیح بیان کر دے۔

صدیق وہ ہے کہ جو وہ کہہ دے اللہ کریم اس کے مطابق کر دیں۔ وہ صدیق ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے فرما دیا اللہ کریم نے ویسا کر دیا۔ تو اس نے کہا یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ آپ تو صدیق ہیں، آپؑ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے ہو بہو ویسی واقع ہو جاتی ہے۔ اب ان کی برأت یا پھانسی کا واقعہ حضرت یوسفؑ نے دیکھا تو نہیں تھا من جانب اللہ جو علوم عطا ہوئے ان کی قوت پر کہہ دیا کہ اس کو پھانسی ہوگی اور اس کی نعش لٹکتی رہے گی، اور پرندے اس کا گوشت نوچیں گے اور تم بری ہو جاؤ گے۔ اور نہ صرف بری ہو گے بلکہ بادشاہ کے ساقی بحال ہو جاؤ گے۔ تو ویسا ہی ہو گیا تو اس نے کہا اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ آپ تو صدیق ہیں، آپؑ جو فرماتے ہیں ویسا ہو جاتا ہے، اب ہمیں از راہ کرم اس خواب کی تعبیر بتائیے اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْکُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ کہ سات گائیں ہیں یا بیل ہیں، عربی میں بقرہ گائے کو بھی کہتے ہیں، بیل کو بھی کہتے ہیں، 'بکرہ'، 'ک' کے ساتھ ہو تو اونٹ کو کہتے ہیں۔ 'ابو بکرؓ' ابو بکر کا مطلب ہے دراز قد، اونٹ جتنے قد والے۔ تو وہ کہنے لگا کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دُبلی گائیں ہیں۔ وہ دُبلی اُن فربہ کو کھا رہی ہیں۔ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ اور سات خوشے ہیں

بڑے ترو تازہ دانوں سے بھرے ہوئے اور سات بالکل سوکھے ہوئے ہیں جن میں کوئی غلہ نہیں ہے، کوئی دانہ یا بیج نہیں ہے۔ لَّعَلِّیٓ اَرۡجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴿۴۶﴾ آپؑ مجھے اس کی تعبیر بتائیں تاکہ میں واپس جا کر سب کو بتا سکوں کہ اس کی تعبیر کیا ہے۔

خواب دیکھنے والے کا مقام اور تعبیر:

خواب کی تعبیر میں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ جنہیں اللہ نے علم تعبیر دیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک عام آدمی کے خواب اور حکمران کے خواب کی تعبیر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کس حیثیت کا بندہ ہے عالم ہے، نیک و پارسا ہے، بدکار ہے، تو فرد کی ذات کے ساتھ اس کے خواب کی تعبیر کا رشتہ جڑتا ہے۔ علامہ ابن سیرینؒ امت مرحومہ میں ایسی ہستی تھے جو علم تعبیر کے امام تھے اور آج تک لوگ انہی کے حوالے دیتے ہیں۔ بہت مدبر شخصیت تھے۔ آپ ایک مجلس میں بیٹھے تھے تو ایک شخص خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے کہا کہ حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اذان کہہ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا، تمہیں کوئی عہدہ ملے گا، عزت ملے گی اور تمہارا مرتبہ بلند ہوگا۔ اسی مجلس میں کوئی اور شخص آ گیا۔ اس نے عرض کی، حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اذان کہہ رہا ہوں۔ فرمانے لگے تو جیل جائے گا، قید ہوگا اور تجھے پھانسی ہوگی۔ وہ پریشان ہو کر چلا گیا۔ جب دونوں چلے گئے تو اہل مجلس جو بیٹھے تھے اُن میں سے کسی نے عرض کی کہ حضرت خواب تو دونوں نے ایک سا دیکھا لیکن ایک کو آپ نے کہا کہ تجھے مرتبہ وحکومت ملے گی اور دوسرے کو کہہ دیا کہ پھانسی ہوگی۔

علامہ ابن سیرینؒ نے فرمایا، وہ جو پہلا تھا وہ نیک، صالح، اور صاحب علم آدمی تھا۔ اذان کا مطلب ہے کہ بندے کے اندر جو ہے وہ ظاہر ہو جائے۔ جو کچھ ماضی ضمیر ہے، وہ ظاہر کرتا ہے۔ موذن بتاتا ہے کہ اللہ بڑا ہے، آ جاؤ نماز کی طرف، نیکی کی طرف آ جاؤ۔ وہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ واحد و لاشریک ہے اور شہادت دیتا ہے کہ اللہ کا رسول ﷺ برحق ہے۔ تو یہ اس کا ایمان وعقیدہ ہے، اس کے اندر ہے، اس کا اظہار کر رہا ہے۔ جسے خواب کی تعبیر میں خوشخبری دی وہ ایک نیک آدمی تھا، صاحب علم، صاحب اہلیت بھی تھا۔ جب اس کے یہ کمالات ظاہر ہوں گے تو ظاہر ہے اسے کوئی رتبہ ملے گا، عہدہ ملے گا، عزت ہوگی۔

یہ جو دوسرا آدمی تھا یہ چور اور ڈاکو تھا۔ اور بہت سے لوگوں کا قاتل تھا۔ تو اس کے حالات جب ظاہر ہوں گے تو ظاہر ہے کہ یہ قید ہوگا اور پھانسی پائے گا۔ تو خواب کی تعبیر کا مدار خواب دیکھنے والے کی ذات پر ہے کہ وہ کیسا ہے۔

یہ خواب چونکہ بادشاہ نے دیکھا تھا، تو پورے ملک سے اس کا تعلق تھا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا! ایسا کرو قَالَ تَزۡرَعُوۡنَ سَبۡعَ سِنِیۡنَ دَاَبًا ۚ سات سال بہت محنت سے کاشتکاری کرو۔ بہت اہتمام سے پانی لگاؤ،

دیکھ بھال کرو اس میں بہت زیادہ فصلیں ہوں گی۔ لیکن یاد رکھو جو زیادہ فصلیں ہوں گی انہیں ضائع نہ کرنا۔ انہیں محفوظ کر لینا۔ پھر اپنی طرف سے ایک عجیب نسخہ بیان فرمایا جو علوم الٰہی میں سے تھا جو آپؑ کو عطا ہوئے تھے۔

آپؑ نے فرمایا کہ اگر غلے کے دانے جمع کرنے لگو تو ممکن ہے وہ خراب ہو جائیں، انہیں کیڑا لگ جائے یا نمی سے خراب ہو جائیں یا جم جائیں تو یوں کرو فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ کہ جتنا ذخیرہ کرنا ہے وہ خوشوں میں ہی کرو۔ اسی طرح سے دانے نکالے بغیر سٹے جمع کر لینا۔ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ۝۴۷ اور ان میں سے بہت تھوڑا خرچ کرنا جتنا تمہاری ضرورت ہو بس اتنا خرچ کرنا، اور کوئی دانہ ضائع نہ ہونے دینا۔ اب یہ بڑا خوبصورت طریقہ ارشاد فرمادیا کہ اگر خوشے جمع کر لیے جائیں تو وہ خراب نہیں ہوتے۔

انہوں نے فرمایا! کیونکہ تم نے پہلے سات سال جمع کرانے ہیں اور آئندہ سات سال استعمال کرنے ہیں۔ گویا تم نے اناج کے اس ذخیرے کو چودہ سال چلانا ہے۔ تو اسے خوشوں میں رکھنا۔ یہ خواب کا حصہ نہیں تھا بلکہ یہ بات آپؑ نے علوم نبوت سے ارشاد فرمائی ہے۔ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ۝۴۸ اس کے بعد سات سال بڑے سخت آئیں گے۔ وہ جو موٹی گائیں تم نے دیکھیں وہ سات سال سرسبز و شادابی اور فصلوں کی کثرت کے ہیں۔ اس کے بعد وہ سات سال دبلی گائیوں والے خشک خوشے والے آگے جس میں یہ ذخیرہ تم خرچ کرتے رہو گے۔ اور اس ذخیرے کو ختم نہ کر دینا۔ اس میں سے بھی بیج کے لیے ضرور بچا کر رکھنا۔ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ وہ سال اس ذخیرے کو جو تم رکھا ہے، کھا جائیں گے۔ لیکن اس میں سے تم بیج کے لیے بچا لینا۔ مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ۝۴۸ جو پھر بعد میں کام آئے گا۔ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ۝۴۹ ان چودہ سالوں کے بعد جو پندرھواں سال آئے گا، وہ بہت مبارک سال ہوگا۔ خوب بارشیں ہوں گی، خوب آبادی ہوگی اور لوگ بہت خوشحال ہوں گے بلکہ پھل کھانے کی بجائے لوگ پھل نچوڑا کریں گے۔ یعنی پھلوں کی اتنی کثرت ہوگی کہ لوگ کھانے کی بجائے رس نچوڑ کر پیا کریں۔ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ لوگوں پر بہت زیادہ بارشیں ہوں گی وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ۝۴۹ اور پھل نچوڑ نچوڑ کر پیا کریں گے۔ آپؑ نے بہت خوبصورت تعبیر بتائی۔ اس نے جا کر بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ میرے اہل دربار مدتوں سے اعلیٰ تنخواہوں پر، اعلیٰ عہدوں پر کرسیوں پر متمکن ہیں، صاحب علم ہونے کے دعویدار ہیں، لیکن انہیں تو بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ انہوں نے تو اُلٹا مجھے یہ کہا کہ یہ محض پریشان خیال ہیں۔ اس شخص نے تو بہت اچھی تعبیر بتائی ہے وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ بادشاہ نے کہا، اسے میرے پاس لاؤ۔ ایسا صاحب علم، سچا اور پیارا شخص تم نے جیل میں قید کر رکھا ہے۔ جاؤ اسے میرے پاس لے آؤ۔ شاہی حکم صادر ہو گیا کہ حضرت یوسفؑ کو لایا جائے۔

سورۃ یوسف رکوع 7 آیات 50 تا 52

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۞۵۰ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞۵۱ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۞۵۲

اور بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ پس جب آپ کے پاس قاصد پہنچا تو آپ نے فرمایا تُو اپنے آقا کے پاس واپس جا پس اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے بے شک میرا پروردگار ان عورتوں کے فریب کو خوب جانتا ہے ﴿۵۰﴾ (بادشاہ نے عورتوں سے) کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف (علیہ السلام) کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا (ان عورتوں نے) کہا حاشاءاللہ (اللہ پاک ہیں) ہم نے تو ان میں کوئی برائی نہیں جانی۔ عزیز کی بیوی کہنے لگی اب سچی بات تو ظاہر ہو ہی گئی ہے میں نے ہی ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور بلاشبہ وہ سچے ہیں ﴿۵۱﴾ میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ وہ (یوسف علیہ السلام) جان لیں کہ میں نے پیٹھ پیچھے ان سے خیانت نہیں کی اور یہ کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتے ﴿۵۲﴾

تفسیر ومعارف

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ جب شاہی قاصد، بادشاہ کا فرستادہ یوسفؑ کی خدمت میں پہنچا تو آپؑ نے فرمایا قَالَ ارْجِعْ میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں جیل سے نکلنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے کوشش بھی کی ہے، وسائل بھی اختیار کیے اور اب اللہ نے سبب بھی بنا دیا۔ میں جیل سے باہر آنا چاہتا ہوں لیکن اس طرح نہیں، پہلے میں اپنا دامن صاف کروں گا۔ مجھ پر جو الزام تراشی کی گئی اس کی تحقیق کی جائے۔ بات کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچایا جائے۔ یہ بات صاف ہو جائے کہ میں قصوروار ہوں یا بے قصور۔ پھر میں آؤں گا، میں ایک قصوروار کی حیثیت سے نہیں آنا چاہتا۔ چونکہ بات بادشاہ کے دربار تک پہنچ گئی تو بادشاہ کے لیے تفتیش کرنا کون سا مشکل ہے لہٰذا بادشاہ تفتیش کرے۔ آپؑ نے فرمایا قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ اپنے بادشاہ کی طرف لوٹ کر جاؤ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۞ اور بادشاہ سے کہو ان عورتوں کو طلب کرے، جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ چونکہ ان عورتوں کے سامنے تو زلیخا نے اعتراف جرم کیا تھا کہ میں نے اسے ورغلایا تھا یہ تو بالکل معصوم ہے اور پاکباز ہے۔ سو حضرت یوسفؑ نے فرمایا! اُن عورتوں کو بلا کر تفتیش کی جائے کہ قصور کس کا ہے۔ میرا پروردگار تو ان کے فریب کو اور مکر کو خوب جانتا ہے۔ کیونکہ ان عورتوں نے بھی یوسفؑ کو دیکھنے کے لیے فریب کیا تھا اور انہیں ورغلانے میں شامل ہو گئیں تھیں۔ ان کے کردار کو میرا پروردگار خوب جانتا ہے۔

بادشاہ نے سب کو طلب کر لیا۔ زلیخا کو بھی بلا لیا۔ تب تک زلیخا کا شوہر فوت ہو چکا تھا۔ وہ ضعیف ہو چکی تھی۔ جوانی قصہ پارینہ بن چکی تھی، شوہر فوت ہو چکا تھا، شاہی مراعات بھی نہ رہی تھیں۔ بہرحال زلیخا کو بھی طلب کر لیا گیا اور پوچھا قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ سارا واقعہ صحیح صحیح بیان کرو۔ اصل قصہ کیا تھا جب تم نے یوسفؑ کو ورغلانے کی کوشش کی۔ جن عورتوں کے ہاتھ زخمی ہوئے تھے وہ کہنے لگیں قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ اللہ پاک ہے مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ ہمارے علم میں کوئی رائی کے برابر بھی ان کی غلطی نہیں آئی۔ ہم اس واقعہ کے شاہد ہیں۔ ہم زلیخا کے گھر گئیں۔ وہاں ہم نے دعوت کھائی اور یوسفؑ کو دیکھا۔ جو بھی قصور تھا زلیخا کا تھا، یوسفؑ کا دامن بالکل پاک ہے ان کی اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ اب جب یہ بات سامنے آ گئی قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ زلیخا نے کہا! بات تو سامنے آ گئی، حقیقت کھل کر سامنے آ گئی، اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ میں خود بتاتی ہوں کہ قصور میرا تھا، میں نے ہی انہیں ورغلانے کی کوشش کی تھی وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۞ یقیناً وہ بہت کھرے اور بہت سچے ہیں اور صادقین یعنی سچوں میں سے ایک ہیں۔ میں اپنے شوہر کو

دھوکا دیتی رہی اور یوسفؑ سے خیانت کی کہ ان پر الزام دھرا۔قصور میرا تھا، مجرم انہیں بنا دیا۔ پھر ہم میاں بیوی نے مل کر انہیں جیل بھجوا دیا تاکہ بدنامی ان کے حصے میں آئے اور لوگ انہیں ہی قصوروار سمجھیں۔لیکن اب نہ وہ وقت رہا نہ عہدہ، نہ شوہر رہا نہ جوانی رہی۔اب بڑھاپا ہے اور اس نے کمر توڑ دی ہے۔بات سامنے بھی آ چکی ہے جن خواتین کے سامنے میں نے اقرار کیا تھا، انہوں نے بیان بھی کر دی ہے تو اب چھپانے سے کیا حاصل۔میں سچ سچ بتاتی ہوں اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ میں نے ہی انہیں مائل کرنے کی کوشش کی تھی وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۵۱ اور وہ تو بے شک بہت سچے اور کھرے انسان ہیں۔اور یہ بھی اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ بدلتے وقت کے ساتھ میں بھی بدل چکی ہوں۔جوانی اور اس کی خواہشات دم توڑ چکی ہیں۔ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ۝۵۲ اب یوسفؑ کو بھی پتہ ہونا چاہیے کہ میں نے اُن کی غیر حاضری میں ان کی صفائی پیش کی ہے، ان سے خیانت نہیں کی۔پہلے ان کے سامنے ان پر الزام لگا کر ان سے خیانت کی تھی، شوہر کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔لیکن آج ان کی عدم موجودگی میں سچ کہہ دیا ہے۔

غور کرنے کا مقام:

یوسفؑ ابھی جیل میں ہی ہیں جب بادشاہ اور زلیخا اور دیگر خواتین کے مابین بات ہو رہی ہے۔زلیخا نے اقبال جرم کرتے ہوئے اس بات کی بھی شہادت دی کہ یوسفؑ نیک، پاکباز اور سچے انسان ہیں اور اب انہیں پتہ چل جانا چاہیے کہ میں نے ان کی عدم موجودگی میں ان کی کوئی خیانت نہیں کی اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ۝۵۲ کہ اللہ کریم خیانت کرنے والوں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتے۔اتنے سال کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ میں نے کتنی خیانت کی، بدیانتی کی، الزام لگایا، جیل بھجوایا لیکن اتنے عرصے بعد وہ خیانت میرے ہی گلے پڑ گئی۔رسوائی میرے ہی حصے میں آئی۔حقیقت سامنے کھل کر آ گئی۔اللہ کریم کا اپنا نظام ہے اور وہ برائی کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتے۔نظام قدرت میں بھلائی کے مقابل کبھی برائی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

یوسفؑ ابھی جیل میں ہیں بادشاہ کے بلانے پر ابھی آئے نہیں تھے بلکہ ابھی بادشاہ خواتین اور زلیخا کا بیان سن رہے ہیں۔زلیخا بات کر رہی ہے اور یہی بات اگلے پارے میں چلی جاتی ہے کہ میں خود کو پاک صاف نہیں کہتی بے شک نفس تو انسان کو برائی ہی سکھاتا ہے، جب زلیخا کی بات ختم ہوتی ہے تب بادشاہ حکم دیتا ہے کہ اب تو یوسفؑ کو بلا لاؤ اور پھر حضرت یوسفؑ شاہی دربار میں تشریف لاتے ہیں۔اس کے بعد کا واقعہ تسلسل سے تیرہویں پارے میں آ رہا ہے۔

الحمد للہ بارھواں پارہ بتوفیق الٰہی مکمل ہوا اللہ کریم سب کے لیے عامۃ المسلمین کے لیے باعث ہدایت بنائے۔آمین

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی قرآن تفسیر

حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی

اردو تفسیر آڈیو، وڈیو اور لکھی ہوئی تینوں طرح کی دیکھیں، سنیں یا ڈاؤن لوڈ کریں۔

پنجابی تفسیر وڈیوز دیکھیں ڈاؤن لوڈ کریں۔ قرآن کا اردو ترجمہ اور کتابیں ڈاؤن لوڈ کریں۔

قرآنِ کریم کی تلاوت اور حضرت صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو۔ کمپیوٹر اور موبائل پر سننے کے لیے ڈاؤن لوڈ کریں۔ حضرت جی کا کلام حمد اور نعتیں آڈیو وڈیو سنیں اور ڈاؤن لوڈ کریں۔

دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام اَلمرشد کی تمام 125 اقساط کی وڈیوز دیکھیں

www.QuranTafseer.net

حضور نبی پاکؐ کے حضور آج بھی روحانی طور پر حاضری ممکن ہے اور ہزاروں مرد و خواتین یہ سعادت رکھتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

تصوف تزکیہ روحانیت ، ذکر، روحانی سلسلہ، روح، کشف، بیعت ان تمام موضوعات کو سمجھنے کے لیے حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کے وڈیو بیانات اور کتابیں موجود۔

طریقہِ ذکر جس سے دل سے لے کر جسم کا ہر باڈی سیل اللہ اللہ ذکر کرنے لگ جائے۔

حضور نبی پاک ﷺ کے حضور روحانی طور پر حاضری کی سعادت۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اور مکمل رہنمائی کے لیے ویب سائیٹ وزٹ کریں۔

اس پوسٹ کو زیادہ سے زیادہ شیئر کر کے آپ بھی اس نیک کام کا حصہ بنیں۔